کلیاتِ مجید امجد

طبع نو

ترتیب، تدوین و تحقیق

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

میں روز اِدھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب اِدھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

کلیاتِ مجید امجد

طبعِ نو

ترتیب، تدوین و تحقیق

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

نام کتاب: کلیاتِ مجید امجد

ترتیب، تدوین و تحقیق: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

باہتمام: محمد ناصر خان

ناشر

Farid Book Depot (P) Ltd.

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2

Phones: 23247075, 23289786, 23289159 Fax: 23279998 Res.: 23262486

Kulliyat-e-Majeed Amjad

Compiled & Research by:

Dr. Khawaja Muhammad Zakariyya

Edition : 2011 Pages: 728

Rs. : 275/-

Our Branches:

Delhi: Farid Book Depot (P) Ltd.
422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6 Ph.: 23256590

Mumbai: Farid Book Depot (P) Ltd.
216-218, Sardar Patel Road, Near Khoja Qabristan,
Dongri, Mumbai-400009 Ph.: 022-23731786, 23774786

Printed at: Farid Printing Press, Delhi

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

فہرست

۱ - شبِ رفتہ

روزِ رفتہ

امروز

فردا

دیباچہ (طبعِ نو)

۱۹۸۸ء میں، میں نے کلیات مجید امجد کی ترتیب و تدوین کا کام مکمل کیا اور اسی سال اسے ماورا پبلشرز لاہور نے شائع کیا۔ اگر چہ اس میں متن کی صحت کا حتی الامکان خیال رکھا گیا تھا پھر بھی چند اغلاط در آئیں۔ واحد طویل نظم ''نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیم طرب'' غلط کاپی جڑنے کی وجہ سے بے ربط ہو گئی لیکن کلیات کی چاروں اشاعتوں میں اسی طرح شائع ہوتی رہی۔

کلیات کے ''پیش لفظ'' میں اس کی ترتیب کے اہم نکات فرداً فرداً لکھ دیے گئے تھے ہر تخلیق پر تاریخ اشاعت درج کر دی تھی۔ یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ ابتدائی کلام مختلف ذرائع سے تلاش کر کے شامل کتاب کیا گیا ہے۔ مجید امجد زندہ ہوتے تو معلوم نہیں اس میں سے کیا کچھ شائع کرتے۔ اس کے باوجود نکتہ چینوں کی زبانیں اور قلم رواں رہے۔ اگر ''پیش لفظ'' کو غور سے پڑھ لیا جاتا تو بیشتر اعتراضات کا جواب مل جاتا مگر شاید معترضین کو اتنی فرصت میسر نہیں تھی۔

حالیہ اشاعت میں ان عدیم الفرصت حضرات کو زحمت سے بچانے کے لیے کلیات کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے:

۱- شبِ رفتہ (۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۸ء)

۲- روزِ رفتہ (۱۹۳۲ء تا ۱۹۵۸ء)

۳- امروز (۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء)

۴- فردا (۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۴ء)

شب رفتہ

مجید امجد کی زندگی میں ان کا ایک ہی مجموعہ ''شبِ رفتہ'' کے نام سے ۱۹۵۸ء میں نیا ادارہ لاہور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کو ترتیب دیتے ہوئے امجد نے اپنا ابتدائی کلام یکسر خارج کر دیا تھا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء کے درمیان ان کی اِکا دُکا نظمیں شائع ہونے لگی تھیں لیکن یہ شاعری انہوں نے شبِ رفتہ میں شامل نہیں کی۔ میرے نزدیک ان کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ ان کی نظم ''حسن'' ۱۹۳۵ء میں جوش ملیح آبادی کے رسالے ''کلیم'' میں شائع ہوئی تھی۔ شبِ رفتہ کا آغاز انہوں نے اس نظم سے کرنا مناسب خیال کیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۸ء تک ان کا بہت سا کلام ادبی رسائل و جرائد میں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ لیکن اسی سال جب شبِ رفتہ ترتیب دی گئی تو اس میں سے ایک کڑا انتخاب اس میں شامل کیا گیا۔ شبِ رفتہ میں شمولیت سے محروم رہ جانے والی بعض نظمیں بہت عمدہ ہیں مگر چونکہ ''شبِ رفتہ'' مجید امجد کی زندگی میں شائع ہونے والا ان کا واحد مجموعہ ہے اس لئے اس کی الگ شناخت برقرار رکھی گئی ہے۔ امجد نے شبِ رفتہ کو سنین تخلیق کے مطابق مرتب نہیں کیا تھا لیکن میں نے اس مجموعے کی تمام نظموں کو سختی سے سنین کے مطابق ترتیب دیا ہے۔ زیرِ نظر کلیات کے اس حصے میں وہ تمام نظمیں شامل ہیں جو ۱۹۵۸ء میں طبع ہونے والی ''شب رفتہ'' میں موجود تھیں لیکن اب ''تاریخ وار'' ترتیب پانے کی وجہ سے کسی قدر آگے پیچھے ہو گئی ہیں۔

روزِ رفتہ

مجید امجد نے جو کلام ''شبِ رفتہ'' میں کسی بھی وجہ سے شریک نہیں کیا تھا اُسے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ ان میں وہ شاعری بھی ہے جو انہوں نے زمانہ طالب علمی میں کی تھی۔ اور وہ کلام بھی ہے جو شب رفتہ میں شمولیت کا مستحق تو تھا مگر کئی وجوہ کی بنا پر شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بعض جگہ یہ فیصلہ کرنا سہل نہیں کہ دونوں میں حد فاصل کس طرح قائم کی جائے اس لئے انہیں یکجا رکھا گیا ہے۔ گویا اس حصے میں ان کی ابتدائی اور زمانہ طالب علمی کی شاعری بھی شامل ہے اور شبِ رفتہ کے دور کی عمدہ شاعری بھی موجود ہے مگر چونکہ یہ

سارا کلام ان کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اس لئے کلیات میں اس کی شمولیت کا کافی جواز موجود ہے۔ اس حصے کو ''باقیات'' کا عنوان دے کر' کلیات کے آخر میں اس لئے جگہ نہیں دی گئی کہ مجید امجد ان میں سے کئی نظمیں اپنے مجموعہ کلام میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ بعض نہایت اہم نظموں کو بالکل آخر میں لگا دیا جاتا تو ان تک رسائی مشکل ہو جاتی اور ان کے نظر انداز ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا (موجودہ اشاعت میں اس حصے میں بعض نظموں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے)

امروز

شبِ رفتہ کے بعد اگرچہ مجید امجد کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں نہیں چھپا لیکن انہوں نے ایک ملاقات میں (جو ۱۹۷۲ء میں ہوئی) مجھے یہ بتایا تھا کہ شبِ رفتہ کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے دو مختلف مزاج ہیں اس لئے اس کے دو الگ الگ مجموعے شائع ہونے چاہییں۔ ایک مجموعہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہو اور دوسرے میں ۱۹۶۸ء اور اس کے بعد کی تخلیقات شامل ہوں لیکن ''مجید امجد اشاعتی کمیٹی -- لاہور'' نے ''شبِ رفتہ کے بعد'' کے زیرعنوان جو مجموعہ ترتیب دیا اس میں شبِ رفتہ کے دور کے کچھ کلام کا انتخاب اور اس کی اشاعت کے بعد کہی ہوئی نظمیں یکجا کر دیں۔ اگرچہ یہ ترتیب مجید امجد کی منشا کے مطابق نہیں تھی تاہم غنیمت تھی۔ مشکل یہ آ پڑی کہ اس میں اغلاط کی بھرمار تھی۔ میں نے بڑی محنت سے اس کا اغلاط نامہ تیار کیا تھا مگر یہ کتاب یوں غائب ہوئی کہ بعد میں کہیں نظر نہیں آئی۔ میں نے کلیات کی ترتیبِ نو میں مجید امجد کی خواہش کے مطابق ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء کا کلام ''امروز'' کے نام سے اس حصے میں شامل کیا ہے۔ ان کی بیشتر نمائندہ نظمیں یہاں موجود ہیں۔

فردا

۱۹۶۸ء میں مجید امجد ''فعلن فعلن'' کے آہنگ سے مکمل طور پر مسحور ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے یہ واردات میر تقی میر پر بھی گزری تھی جنہوں نے اس بحر میں دو تین سو غزلیں لکھ ڈالی تھیں۔ میر کے بعد یہ بحر امجد کے مزاج کو راس آئی۔ چنانچہ وہ چھ سات سال تک

تمام نظمیں اسی بحر میں لکھتے چلے گئے۔ ان نظموں کے بارے میں عام قاری کی رائے ہے کہ یہ ان کی کمزور نظمیں ہیں جبکہ بعض سنجیدہ قارئین اور وسیع المطالعہ ناقدین کے خیال میں یہ ان کی بہترین تخلیقات ہیں۔ بہر حال یہ مستقبل کی نظمیں ہیں اور ان کی حیثیت کا تعین آنے والا زمانہ کرے گا۔

مذکورہ بالا چاروں حصوں میں سے ''شبِ رفتہ'' اور ''روزِ رفتہ'' قریب قریب ایک ہی زمانی وقفے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ۱۹۳۲ء تا ۱۹۵۸ء کے دوران تخلیق ہوئے ہیں۔ انہیں الگ کرنے کا جواز وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ''امروز'' اور ''فردا'' میں وہ کلام ترتیب دیا گیا ہے جو ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۴ء کے درمیان صفحہ قرطاس پر منتقل ہوا ہے اور چونکہ دو مختلف طرز اور اسلوب رکھتا ہے اس لئے دو الگ الگ حصوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ''شبِ رفتہ'' مجید امجد کا اپنا رکھا ہوا نام ہے جبکہ ''روزِ رفتہ''، ''امروز'' اور ''فردا'' کے عنوانات مرتب نے قائم کیے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لیے تمام کلام پر سنین تخلیق درج کر دیے گئے ہیں۔

کلیاتِ مجید امجد کی اشاعتِ اوّل کے وقت اس کے ناشر اور معروف شاعر جناب خالد شریف نے ''عرضِ ناشر'' کے زیرِعنوان میرے اس کام کو ذیل کے الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا تھا:

> ''تین سال قبل جب میں نے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب سے مجید امجد کے کلام کی ترتیب و تدوین کی درخواست کی تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس کام کو اس قدر سنجیدگی سے لیں گے۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ خواجہ صاحب کے پاس مجید امجد کا کچھ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ پھر یاد دہانیوں، تقاضوں اور ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ جو چلا تو معلوم ہوا کہ مجید امجد کا سارا مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام خواجہ صاحب کو حفظ ہے۔ مسودے کی تیاری، کتابت شدہ مواد کی پروف ریڈنگ اور بعد کے مراحل میں انہوں نے جس باریک بینی اور عرق ریزی سے کام لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُن کی اس توجہ کے باعث ہم میں سے

کچھ دوست یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ خواجہ صاحب کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تو دراصل اس کام پر ملنی چاہیے تھی''۔

ان کے یہ جملے میرے لیے اعزاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر میری محنت، باریک بینی اور عرق ریزی اعزازی ہی رہی۔

اس موقع پر مناسب ہوگا کہ میں نے مجید امجد کے کلام کو جمع کرنے اور ترتیب دینے میں جو محنت اور جستجو کی اس کا ایک سرسری قصہ بیان کر دوں۔

۱۹۷۲ء میں، میں نے مجید امجد کا ایک انٹرویو ساہیوال میں ان کے مکان پر ریکارڈ کیا تھا۔ اُس وقت میں نے کسی اچھے ناشر سے ان کے ایک یا دو مجموعے شائع کروانے کی پیشکش کی۔ وہ راضی ہو گئے اور وعدہ کیا کہ وہ دو مجموعوں کو حتمی شکل دیں گے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ایک مجموعہ شبِ رفتہ کے بعد سے ۱۹۶۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہو اور دوسرا مجموعہ ''فعلن فعلن'' والی بحر میں کہی گئی نظموں سے ترتیب پائے۔ ان دنوں مجید امجد کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ میں نے احتیاطاً دو موٹی موٹی کاپیاں خریدیں اور ان میں ان کا تمام کلام مختلف ذرائع سے حاصل کر کے لکھنا شروع کر دیا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو یہ کاپیاں بھر چکی تھیں۔ اس دوران میری ملاقات کسریٰ منہاس (اب مرحوم) سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان سے میرے نیازمندانہ مراسم استوار ہوگئے۔ انہوں نے مجھے نہ صرف ''عروج'' جھنگ کی فائلیں عطا کیں بلکہ امجد کا کچھ نادر کلام بھی فراہم کیا۔ پھر جناب جاوید قریشی کی عنایت سے مجید امجد کے مسودات میری نظر سے گزرے۔ میں نے اس سارے انمول خزانے کو بہت وقت صرف کر کے ترتیب دیا۔ بعض نظموں کے سنین تخلیق امجد صاحب نے تحریر نہیں کیے تھے۔ انہیں تلاش کر کے خلا پر کیے۔ بڑی جستجو کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ تمام کلام کو تاریخی ترتیب سے یکجا کرسکوں۔ اس کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ امجد صاحب اپنے کلام پر مسلسل محنت کرتے رہتے تھے۔ ترمیم و تنسیخ کا یہ عمل غیر مختتم تھا۔ نتیجہ یہ کہ بعض نظموں کے ایک سے زیادہ ''ورژن'' موجود تھے۔ ان میں سے کون سا ''ورژن'' شاعر کی منشا کے مطابق تھا اور کون سا نہیں تھا؟ اس الجھن کو سلجھانا سہل نہیں تھا۔ اکثر جگہ میں نے آخری ''ورژن'' کو ترجیح دی مگر چند نظموں میں اوّلیں ورژن بہتر معلوم ہوا اس

لیے اُس کو اختیار کیا گیا۔ مجید امجد کی بہت سی نظموں میں لفظی تبدیلیاں ملتی ہیں۔ رسائل میں پہلی دفعہ اور طرح سے شائع ہوئی ہیں اور بعد میں چند الفاظ تبدیل کر کے قدرے مختلف صورت میں چھپوا دی گئی ہیں۔ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں کہ آگے پیچھے مختلف رسائل میں چھپنے والی نظموں میں سے آخری ورژن کون سا ہے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے چند ماہ بعد چھپنے والی نظم ترمیم کے مراحل سے چند ماہ پہلے گزر چکی ہو۔ ان اُلجھنوں کو تقابلی مطالعے کے بعد سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک اور بڑا مسئلہ بعض الفاظ کی صحت یا عدمِ صحت کا ہے۔ امجد کے ہاں متعدد غیر مستعمل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ بعض الفاظ اور تراکیب انہوں نے خود تراش لی ہیں۔ اس لئے رسائل میں مدیر اور کاتب انہیں درست پڑھ نہیں سکے۔ چنانچہ متعدد الفاظ بار بار غلط نقل ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ اس قسم کی لفظی اُلجھنوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے سلجھایا جائے۔ اس طول کلامی کے بعد شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کلیاتِ مجید امجد محض جلد بازی میں جمع کیا ہوا پشتارہ نہیں ہے بلکہ تلاش، تجسس، تحقیق اور توجہ سے 'شیرازہ بند' کیا ہوا مجموعہ ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ کلام مجید امجد پر تنقید کے لیے ایک مضبوط بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ اُمید ہے اس کا موجودہ ایڈیشن پہلے سے زیادہ پسند کیا جائے گا۔

الحمد پبلی کیشنز کے صفدر حسین صاحب میرے عزیز دوست ہیں۔ کلیاتِ مجید امجد کی یہ اشاعتِ نو ان کے ذوقِ طباعت کی عکاسی کرتی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس ضخیم کلیات کی اشاعت کا اہتمام کیا اور اسے عام قاری کی دسترس میں رکھنے کی سعی کی۔

خواجہ محمد زکریا

۶، ستمبر ۲۰۰۳ء

نوٹ: اس کلیات میں شامل کیا جانے والا بہت سا کلام تلاش بسیار کے بعد مختلف ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے جو اور کہیں دستیاب نہیں۔ علاوہ ازیں متعدد نظمیں غیر مطبوعہ ہیں۔ اسی طرح تاریخی ترتیب اور تدوین متن میں بھی ''اوریجنل ریسرچ'' سے کام لیا گیا ہے۔ اس لئے اس کلیات کے متن، ترتیب اور تحقیق کو بغیر اجازت شائع کرنا کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت جرم ہے۔ (زکریا)

مجید امجد (سوانحی خاکہ)

مجید امجد ۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو جھنگ صدر (مگھیانہ) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک غریب اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابھی وہ دو برس کے تھے جب ان کی والدہ اپنے شوہر سے الگ ہو کر میکے آ گئیں۔ امجد نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی جن کا شمار جھنگ کے صوفیا میں ہوتا تھا۔ گھر سے ملحقہ مسجد میں انہوں نے چند سال قرآن، اسلامیات، فارسی، عربی اور طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۳۰ء میں میٹرک اور ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان اچھے نمبروں سے پاس کئے اور ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور سے بی-اے کی ڈگری حاصل کی۔

اُس زمانے میں دنیا عظیم اقتصادی بحران کا شکار تھی اس لئے ملازمتیں عنقا تھیں۔ مجید امجد جھنگ میں ایک مقامی ہفت روزہ اخبار ''عروج'' سے بطور مدیر وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ کلرک کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۱۹۴۴ء میں دوسری عالمی جنگ کے دوران حکومت نے سول سپلائز ڈیپارٹمنٹ قائم کیا۔ مجید امجد ٹیسٹ اور انٹرویو کے بعد منتخب ہوئے اور اسسٹنٹ انسپکٹر سول سپلائز کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعدازاں یہ محکمہ فوڈ ڈیپارٹمنٹ کا حصہ بن گیا۔ مجید امجد آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر بن گئے۔ انہوں نے بے شمار چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں کام کیا لیکن ملازمت کا زیادہ عرصہ منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں بسر ہوا۔ جہاں سے وہ ۲۸ جون ۱۹۷۲ء کو اٹھائیس سال ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

مجید امجد کی شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ بیوی سے ان کے تعلقات عمر بھر ''خنک'' رہے۔ بیوی جھنگ کے ایک سکول میں پڑھاتی تھی' امجد دوسرے مقامات پر ملازمت کرتے تھے اور شاذ و نادر ہی جھنگ جاتے تھے۔

امجد بڑے وسیع المطالعہ تھے بالخصوص فارسی اور انگریزی شاعری پر انہیں عبور حاصل تھا۔ سائنسی علوم کے مطالعے سے بھی شغف تھا۔ بہت کم گو' شرمیلے اور تنہائی پسند تھے۔ اپنی ذات اور شاعری کے بارے میں قطعاً گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حقیقی معنوں میں ان کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ ملنے جلنے والوں سے ''ذاتی معاملات'' پر کبھی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ انتہائی دیانت دار اور خوددار تھے۔

جوانی میں امجد خوش شکل تھے لیکن رفتہ رفتہ بیمار رہنے لگے اور بہت دبلے پتلے ہو گئے تھے۔ لمبا قد تھا اس لئے دبلاپے نے حسنِ صورت میں کمی کر دی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن بہت دیر سے ملی اس لئے نوبت فاقہ کشی تک جا پہنچی تھی۔ اسی عالم میں ۱۱' مئی ۱۹۷۴ء کے اپنے کوارٹر واقع فرید ٹاؤن ساہیوال میں مردہ پائے گئے۔ تدفین اگلے روز جھنگ میں ہوئی۔ ان کی لوحِ مزار پر انہی کا یہ شعر کندہ ہے ؎

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

شبِ رفتہ

حسن

یہ کائنات مرا اِک تبسم رنگیں
بہار خلد مری اِک نگاہِ فردوسیں

ہیں جلوہ خیز زمین وزماں مرے دم سے
ہے نورریز فضائے جہاں مرے دم سے

گھٹا؟ نہیں یہ مرے گیسوؤں کا پرتو ہے!
ہوا؟ نہیں مرے جذبات کی تگ ودو ہے!

جمالِ گل؟ نہیں بے وجہ ہنس پڑا ہوں میں
نسیم صبح؟ نہیں سانس لے رہا ہوں میں

یہ عشق تو ہے اک احساس بیخودانہ مرا
یہ زندگی تو ہے اِک جذب والہانہ مرا

ظہورِ کون ومکاں کا سبب! فقط میں ہوں
نظام سلسلہ روز و شب! فقط میں ہوں

(۱۹۳۵ء)

جوانی کی کہانی

نہ چھیڑ اے دل! جوانی کی کہانی
کسی کی دلستانی کی کہانی
وہ سوز زندگی افروز کا ذکر!
وہ دردِ جاودانی کی کہانی
وہ دُکھ کی جاگتی راتوں کا قصہ!
وہ اشکوں کی روانی کی کہانی
بہاریں مستیوں کی داستانیں
خماریں سرگرانی کی کہانی
مسرت آشنا غم کا فسانہ
غم آگیں شادمانی کی کہانی
وہ ہونٹوں سے لگے جاموں کا قصہ
وہ آتش موج پانی کی کہانی
مری آنکھوں میں آنسو جھوم آئے
نہ چھیڑ اے دل جوانی کی کہانی

(۱۶-۱۲-۱۹۳۷)

لمحاتِ فانی

بہشتو ، چاندنی راتیں تمھاری
ہیں رنگیں ، نقرئی ، مخمور ، پیاری

مگر وہ رات ، وہ میخانہ ، وہ دَور
وہ صہبائے محبت کا چھلکنا !
وہ ہونٹوں کی بہم پیوستگی --- اور
دلوں کا ہم نوا ہو کر دھڑکنا !

بہشتو ، اس شبِ تیرہ پہ صدقے
رُپہلی ، چاندنی راتیں تمھاری

خُدائے وقت ! تو ہے جاودانی
ترا ہر سانس روحِ زندگانی

مگر وہ وقت جب تیرہ خلا میں
ستاروں کی نظر گم ہو رہی تھی
اوراس دم میری آغوشِ گنہ میں
قیامت کی جوانی سو رہی تھی

خدائے وقت ! اس وقتِ حسیں پر
تصدق تیری عمر جاودانی

(۲۳-۳-۱۹۳۸)

التماس

مری آنکھ میں رتجگوں کی تھکاوٹ
مری منتظر' راہ پیما نگاہیں
مرے شہرِ دل کی طرف جانے والی
گھٹاؤں کے سایوں سے آباد راہیں
مری صبح تیرہ کی پلکوں پہ آنسو
مری شامِ ویراں کے ہونٹوں پہ آہیں
مری آرزوؤں کی معبود! تجھ سے
فقط اتنا چاہیں' فقط اتنا چاہیں
کہ لٹکا کے اک بار گردن میں میری
چنبیلی کی شاخوں سی لچکیلی باہیں
ذرا زلفِ خوش تاب سے کھیلنے دے
جوانی کے اِک خواب سے کھیلنے دے

(۲۴-۹-۱۹۳۸)

شاعر

میں شاعر ہوں میری جمالیں نگہ میں ذرا بھی نہیں فرق ذرّے میں مہ میں
جہاں ایک تنکا سا ہے میری رہ میں

ہر اک چیز میرے لئے ہے فسانہ ہر اک ڈوب سے سن رہا ہوں ترانہ
مرے فکر کے دام میں ہے زمانہ

میں سینے میں داغوں کے دیپک جلائے میں اشکوں کے تاروں کا بربط اُٹھائے
خیالوں میں نغموں کی دُنیا بسائے

رہِ زیست پر بے خطر جا رہا ہوں کہاں جا رہا ہوں، کدھر جا رہا ہوں
نہیں جانتا ہوں، مگر جا رہا ہوں

یہ دُنیا یہ بے ربط سی ایک زنجیر — یہ دُنیا یہ اک نامکمل سی تصویر
یہ دُنیا نہیں میرے خوابوں کی تعبیر

میں جب سوچتا ہوں کہ انساں کا انجام — ہے مٹی کے اِک گھر کی آغوش آرام
تو سینے میں اُٹھتا ہے اک درد بے نام

میں جب دیکھتا ہوں کہ یہ بزمِ فانی — غمِ جاودانی کی ہے اک کہانی
تو چیخ اُٹھتی ہے میری باغی جوانی

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دُنیا — گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دُنیا
محبت کے دشمن سماجوں کی دُنیا[1]

یہاں پر کلی دل کی کھلتی نہیں ہے — کوئی چق دریچوں کی ہلتی نہیں ہے
مرے عشق کو بھیک ملتی نہیں ہے

اگر میں خدا اس زمانے کا ہوتا — تو عنواں کچھ اور اس فسانے کا ہوتا
عجب لُطف دُنیا میں آنے کا ہوتا

مگر ہائے ظالم زمانے کی رسمیں — ہیں کڑواہٹیں جن کی امرت کے رس میں
نہیں میرے بس میں نہیں میرے بس میں

---

[1] ساحر لدھیانوی کے ایک مشہور گیت کے بعض مصرے اسی بند سے ماخوذ ہیں۔

مری عمر بیتی چلی جارہی ہے دو گھڑیوں کی چھاؤں ڈھلی جارہی ہے
ذرا سی یہ بتی جلی جارہی ہے

جونہی چاہتی ہے مری روح مدہوش کہ لائے ذرا لب پہ فریاد پر جوش
اجل آ کے کہتی ہے خاموش! خاموش!

(۲۴-۱۱-۱۹۳۸)

صبحِ جدائی

اب دُھندلی پڑتی جاتی ہے تاریکی شب، میں جاتا ہوں
وہ صبح کا تارا اُبھرا، وہ پو پھوٹی، اب میں جاتا ہوں
جاتا ہوں اجازت! جانے دو۔ وہ دیکھو اُجالے چھانے کو ہیں
سُورج کی سنہری کرنوں کے خاموش بلاوے آنے کو ہیں
وہ پھولوں کے گجرے جو تم کل شام پروکر لائی تھیں
وہ کلیاں جن سے تم نے یہ رنگیں سیجیں مہکائی تھیں
دیکھو ان باسی کلیوں کی پتی پتی مرجھائی ہے
وہ رات سہانی بیت چکی، آ پہنچی صبحِ جدائی ہے
اب مجھ کو یہاں سے جانا ہے، پُر شوق نگاہو! مت روکو
او میرے گلے میں لٹکی ہوئی لچکیلی باہو! مت روکو
ان اُلجھی اُلجھی زُلفوں میں دل اپنا بسارے جاتا ہوں
ان میٹھی میٹھی نظروں کی یادوں کے سہارے جاتا ہوں

جاتا ہوں، اجازت! وہ دیکھو غرفے سے شعاعیں جھلکی ہیں
پگھلے ہوئے سونے کی لہریں مینائے شفق سے چھلکی ہیں
کھیتوں میں کسی چرواہے نے بنسی کی تان اُڑائی ہے
اِک ایک رسیلی سُر جس کی پیغام سفر کا لائی ہے
مجبور ہوں میں، جانا جو ہوا۔ دل مانے نہ مانے جاتا ہوں
دُنیا کی اندھیری گھاٹی میں اب ٹھوکریں کھانے جاتا ہوں

(۲۴-۸-۱۹۳۹)

آوارگانِ فطرت سے!

پتا بھی مجھ کو ارے ہانپتے ہوئے جھونکے
ارے او سینۂ فطرت کی آہِ آوارہ!
تری نظر نے بھی دیکھا کبھی وہ نظارہ:
کہ لے کے اپنے جلو میں ہجوم اشکوں کے
کسی کی یاد جب ایوانِ دل پہ چھا جائے
تو اِک خرابِ محبت کو نیند آجائے

اَبد کنار سمندر! تری حسیں موجیں
الاپتی ہیں شب و روز کیسے بھیانک راگ
بتا کبھی ترے طوفاں بُجھا سکے ہیں وہ آگ
جو دفعتہً سلگ اُٹھتی ہے دُکھ بھرے دل میں
جب ایک بچھڑے ہوئے کا پیام آتا ہے
کسی کا روح کے ہونٹوں پہ نام آتا ہے

حسین چاند! ستاروں کی انجمن کے ایاغ!

بتا کبھی تری کرنوں کے سیمگوں سائے

اِک ایسے شہرِ خموشاں پہ بھی ہیں لہرائے

جہاں پہ ایک ابھاگن نے جب جلا کے چراغ

کسی کی قبر پہ مدھم سی روشنی کی ہو!

تو سونے والے نے بھی جاگ کر صدا دی ہو

(۱۷-۱۲-۱۹۳۹)

بُندا

کاش میں تیرے بُنِ گوش میں بُندا ہوتا!

رات کو بے خبری میں جو مچل جاتا میں
تو ترے کان سے چُپ چاپ نکل جاتا میں
صبح کو گرتے تری زُلفوں سے جب باسی پھول
میرے کھو جانے پہ ہوتا ترا دل کتنا مُلول
تو مجھے ڈھونڈتی کس شوق سے گھبراہٹ میں
اپنے مہکے ہُوئے بستر کی ہراک سلوٹ میں
جونہی کرتیں تری نرم انگلیاں محسوس مجھے
ملتا اس گوش کا پھر گوشہ مانوس مجھے
کان سے تو مجھے ہرگز نہ اُتارا کرتی
تو کبھی میری جدائی نہ گوارا کرتی
یوں تری قربت رنگیں کے نشے میں مدہوش
عمر بھر رہتا مری جاں میں ترا حلقہ بگوش

کاش میں تیرے بُنِ گوش میں بُندا ہوتا!

(۱۹۳۹)

خدا

(ایک اُچھوت ماں کا تصوّر)

خبر ہے تجھ کو کچھ، رلدو! مرے ننھے! مرے بالک!
ترا بھگوان پرمیشر ہے اس سنسار کا پالک!
کہاں رہتا ہے پرمیشر؟ ادھر آکاش کے پیچھے
کہیں دور اس طرف تاروں کی بکھری تاش کے پیچھے!
نہیں دیکھا؟ سویرے جوں ہی مندر میں گجر باجا
پہن کر نور کی پوشاک وہ من موہنا راجا
لئے "سونے کا چھابا" جب ادھر پورب سے آتا ہے
تو ان تاروں کی پگڈنڈی پہ جھاڑو دے کے جاتا ہے
نہیں سمجھے کہ اتنا دُور کیوں اس کا بسیرا ہے؟
وہ اُونچی ذات والا ہے اور اُونچا اس کا ڈیرا ہے
یہ دُنیا والے، یہ امرت کے رس کی چھاگلوں والے
یہ میٹھے بھوجنوں والے، یہ اُجلے آنچلوں والے

یہ اس کو اپنی لاشیں اپنے مردے سونپ دیتے ہیں
عفونت سے بھرے دل اور گردے سونپ دیتے ہیں
جنھیں دوزخ کے زہروں میں بھگو کر بھونتا ہے وہ
جنھیں شعلوں کی سیخوں میں پرو کر بھونتا ہے وہ
یہ اس بھگوان کے دامن کو چھو لینے سے ڈرتے ہیں
یہ اس کو اپنے محلوں میں جگہ دینے سے ڈرتے ہیں
کسی نے بھول کر اس کا بھجن گایا' یہ جل اُٹھے
کہیں پڑ بھی گیا اس کا حسین سایا' یہ جل اُٹھے
غلط کہتا ہے تو نادان تو نے اس کو دیکھا ہے
مرے بھولے ! ہماری اور اس کی ایک لیکھا ہے

(۲-۲-۱۹۴۰)

گلی کا چراغ

تری جلن ہے مرے سوزِ دل کے کتنی قریب
خدا رکھے تجھے روشن ! چراغ کوئے حبیب
تو جانتا ہے مری زندگی کا افسانہ
تو جانتا ہے میں کس شمع کا ہوں پروانہ
لرز لرز گئی اکثر تری یہ نازک لَو — !
ٹھٹک ٹھٹک کے چلا جب کوئی حزیں رَہرو
وہ تیرے سانولے سایوں میں اس کا طوفِ نیاز
وہ دور — موڑ پہ قدموں کی آخری آواز !
صدا خفیف سی دستک سے ملتی جلتی ہوئی
اور اس کے بعد کوئی چٹخنی سی کُھلتی ہوئی

ہُوا کے نرم جھکولوں میں سرسراہٹ سی
گلی کے کونے پہ باتیں سی، کھلکھلاہٹ سی
کہ اتنے میں نظر آیا طویل سایا کوئی
پھر اک صدا کہ ''وہ دیکھو ادھر سے آیا کوئی''
کواڑ بند، گلی بے صدا، فضا خاموش
اور ایک درد کا مارا مسافرِ مدہوش
پلٹ چلا انہی رستوں پہ ڈگمگاتا ہُوا
دُکھے دُکھے ہوئے لہجوں میں گنگناتا ہُوا
تو جانتا ہے کسی کی گلی کے پاک چراغ
چراغِ طُور سے بھی بڑھ کے تابناک چراغ
کہ تو نہ ہو تو وہ آوارۂ دیارِ حبیب
پہنچ سکے نہ کبھی ''ان'' کے آستاں کے قریب
جو تو نہ ہو تو یہ راز اک فسانہ بن جائے
نگاہ اہل جہاں کا نشانہ بن جائے

(۳-۲-۱۹۴۰)

پژمردہ پتیاں

بکھری ہیں صحن باغ میں پژ مردہ پتیاں
دوشیزۂ بہار کے دامن کی دھجیاں !
ہمدم ! غمیں نہ ہو کہ یہ مٹتی نشانیاں
اک آنے والی رُت کی ہیں شیریں کہانیاں !
ڈھیر ان کے یہ نہیں ہیں چمن میں لگے ہوئے
پیوند ہیں خزاں کے کفن میں لگے ہوئے
جاتی ہوئی خزاں کے جنازے کے ساتھ ساتھ
تالی بجاتے جاتے ہیں ان کے حسین ہاتھ
ان کے دلوں پہ زیست کے راز آشکار ہیں
صرفِ خزاں بھی ہو کے نقیبِ بہار ہیں

(۱۸-۲-۱۹۴۰)

رُخصت

تھک گئیں آنکھیں، اُمیدیں سوگئیں، دل مرگیا
زندگی! عزم سفر کر، موت! کب آئے گی تو؟
آنسوؤ! آنکھوں میں اب آنے سے شرماتے ہو کیوں؟
تھی تمہی سے میرے داغِ آرزو کی آبرو!
اے کسی کے آستاں کو جانے والے راستے!
بخش دینا! میرا پائے شوق تھا سیماب خو
یہ ترا کتنا بڑا احسان ہے — بادِ سحر!
عمر بھر کھیلی مری آہوں کے انگاروں سے تو
اے زمانے کے حسیں صیاد! کیا کہنا ترا؟
جاں گسل ہیں تیرے دامِ خوشنما کے تار و پو
آہ میری رُوح کو ڈسنے لگی ہے سانس سانس
اب میں رخصت چاہتا ہوں اے جہانِ رنگ و بو!

(۷-۵-۱۹۴۰)

دُنیا

جہاں کی حقیقت کی کس کو خبر ہے
فریب نظر تھی فریب نظر ہے !

یہی پھول کی زیست کا ماحصل ہے
کہ اس کا تبسم ہی اس کی اجل ہے

نہ سمجھو کہ چشم حسیں سرمگیں ہے
نہیں قبر کی تیرگی کی امیں ہے

یہ کیا کہہ رہے ہو کہ ندی رواں ہے
سمندر سے پوچھو کہاں تھی کہاں ہے

نہ سمجھو کہ ہے کیف پرور یہ نغمہ
شکن ہے ہوا کی جبیں پر یہ نغمہ

کہاں دھڑکنیں ہیں دل زار کی یہ
صدائیں ہیں اِک ٹوٹتے تار کی یہ

یہ ہستی کا دریا بہا جارہا ہے
ہم آہنگ سیل فنا جارہا ہے

پھنسے کچھ انوکھے قرینوں میں ہیں ہم
حبابوں کے نازک سفینوں میں ہیں ہم

یہ کیا ہے یہ کیوں ہے خبر کیا خبر کیا
مرے تیرہ ادراک کی ہو سحر کیا !

مری بزم دل میں نہیں روشنی کیوں ؟
ہے بے صید میری نگہ کی انی کیوں ؟

یہ دُنیا ہے میری کہ مرقد ہے میرا ؟
یہاں بھی اندھیرا وہاں بھی اندھیرا

(۳۱-۸-۱۹۴۰)

خودکُشی

ہاں میں نے بھی سنا ہے تمھارے پڑوس میں　　کل رات ایک حادثۂ قتل ہوگیا
ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ اِک جام زہر کا　　دو جیونوں کی ننھی سی نوکا ڈبو گیا
کوئی دُکھی جوان وطن اپنا چھوڑ کر　　اپنی سکھی کے ساتھ اک اور دیس کو گیا
دُنیا کے خارزار میں سوٹھوکروں کے بعد　　یوں آخر اُن کا قصۂ غم ختم ہوگیا
یوں طے کیا انہوں نے محبت کا مرحلہ　　ایک ایک گھونٹ اور جو ہونا تھا ہوگیا
دونوں کی آنکھ میں تھا اک اک اشک منجمد　　جو خشک خشک پلکوں کی نوکیں بھگو گیا
کچھ کہنے پائی تھی کہ وہ خاموش ہوگئی　　کوئی جواب دینے کو تھا وُہ کہ سوگیا
پیمانہ اجل کا وہ تلخابہ اس طرح　　روحوں کے زخموں سینوں کے داغوں کو دھوگیا
اکثر یونہی ہُوا ہے کہ اُلفت کا امتحاں　　دشواریوں میں موت کی آسان ہوگیا

آؤ نا! ہم بھی توڑ دیں اس دامِ زیست کو
سنگ اجل پہ پھوڑ دیں اس جامِ زیست کو

(۲۵-۹-۱۹۴۰)

سیرِ سرما

پوہ کی سردیوں کی رعنائی
آخرِ شب کی سرد تنہائی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، خدا کی پناہ
دُھند میں گم فضا، خدا کی پناہ
ذرّے ذرّے پہ پات پات پہ برف
ہر کہیں سطحِ کائنات پہ برف
اس قدر ہے خنک ہوائے صبوح
منجمد ہے رگوں میں موجۂ روح
کون کہتا ہے دل ہے سینے میں
برف کی ایک سل ہے سینے میں
پھر بھی آنکھوں کے سرد جاموں میں
پھر بھی پلکوں کے ٹھٹھرے داموں میں
گرم گرم اشک اضطراب میں ہیں
میری مانند پیچ وتاب میں ہیں
ہوں رواں آتشیں خیالوں میں گم
''آہ تم!
''کتنے سرد مہر!
''ہو تم...... !''

(۱۸-۱-۱۹۴۱)

کنواں

کنواں چل رہا ہے! مگر کھیت سوکھے پڑے ہیں نہ فصلیں، نہ خرمن، نہ دانہ
نہ شاخوں کی باہیں، نہ پھولوں کے مکھڑے، نہ کلیوں کے ماتھے، نہ رُت کی جوانی
گزرتا ہے کیاروں کے پیاسے کناروں کو یوں چیرتا تیز، خوں رنگ، پانی
کہ جس طرح زخموں کی دُکھتی تپکتی تہوں میں کسی نیشتر کی روانی

ادھر دِھیری دِھیری
کنوئیں کی نفیری

ہے چھیڑے چلی جا رہی اک ترانہ

پُر اسرار گانا

جسے سن کے رقصاں ہے اندھے تھکے ہارے بے جان بیلوں کا جوڑا بچارا
گراں بار زنجیریں، بھاری سلاسل، کڑکتے ہوئے آتشیں تازیانے
طویل اور لامنتہی راستے پر بچھا رکھے ہیں دام اپنے قضا نے
اِدھر وہ مصیبت کے ساتھی ملائے ہوئے سینگوں سے سینگ، شانوں سے شانے
رواں ہیں نہ جانے
کدھر؟ کس ٹھکانے؟

نہ رُکنے کی تاب اور نہ چلنے کا یارا

مقدر نیارا

کنوئیں والا، گادی پہ لیٹا ہے مست اپنی بنسی کی میٹھی سُریلی صدا میں
کہیں کھیت سوکھا پڑا رہ گیا اور نہ اس تک کبھی آئی پانی کی باری
کہیں بہہ گئی ایک ہی تند ریلے کی فیاض لہروں میں کیاری کی کیاری
کہیں ہو گئیں دھول میں دھول لاکھوں، رنگارنگ فصلیں، ثمردار ساری

پریشاں پریشاں،
گریزاں گریزاں،
تڑپتی ہیں خوشبوئیں دامِ ہوا میں

نظامِ فنا میں

اور اک نغمہ سرمدی کان میں آ رہا ہے، مسلسل کنواں چل رہا ہے
پیاپے مگر نرم رو اس کی رفتار، پیہم مگر بے تکان اس کی گردش
عدم سے ازل تک، ازل سے اَبد تک، بدلتی نہیں ایک آن اس کی گردش
نہ جانے لئے اپنے دولاب کی آستینوں میں کتنے جہان اس کی گردش

رواں ہے رواں ہے
تپاں ہے تپاں ہے
یہ چکر یونہی جاوداں چل رہا ہے

کنواں چل رہا ہے

(۱۲-۲-۱۹۴۱)

سُوکھا تنہا پتّا

اُس بَیری کی اُونچی چوٹی پر وہ سُوکھا تنہا پتّا !
جس کی ہستی کا بَیری ہے پَت جھڑ کی رُت کا ہر جھونکا
کاش مری یہ قسمت ہوتی ' کاش میں وہ اک پتّا ہوتا
ٹوٹ کے جَھٹ اس ٹہنی سے گر پڑتا ' کِتنا اچھا ہوتا
گر پڑتا ' اس بیری والے گھر کے آنگن میں گر پڑتا
یوں ان پازیبوں والے پاؤں کے دامن میں گر پڑتا
جس کو میرے آنسو پوجیں' اس گھر کے خاشاک میں مل کر
جس کو میرے سجدے ترسیں' اس دوارے کی خاک میں مل کر
اس آنگن کی دھول میں مل کر مٹتا مٹتا مٹ جاتا میں
عمر بھر ان قدموں کو اپنے سینے پر مضطر پاتا میں
ہائے ! مجھ سے نہ دیکھا جائے ' آیا ہوا کا جھونکا آیا
ڈالیاں لرزیں ' ٹہنیاں کانپیں لو وہ سُوکھا پتّا ٹوٹا

(١٤-٢-١٩٤١)

جینے والے

کیا خبر صبح کے ستارے کو | ہے اُسے فرصت نظر کتنی
پھیلتی خوشبوؤں کو کیا معلوم | ہے انھیں مہلت سفر کتنی
برقِ بے تاب کو خبر نہ ہوئی | کہ ہے عُمرِ دمِ شرر کتنی
کبھی سوچا نہ پینے والے نے | جام میں مَے تو ہے مگر کتنی
دیکھ سکتی نہیں مآلِ بہار | گرچہ نرگس ہے دیدہ ور کتنی
جانے کیا زندگی کی جاگتی آنکھ | ہوگئی اس کی شب بسر کتنی
شمع خود سوز کو پتہ نہ چلا | دُور ہے منزلِ سحر کتنی
مسکراتی کلی کو اس سے غرض | کہ ہے عمر اس کی مختصر کتنی

جینے والوں کو کام جینے سے
زندگی کا نظام جینے سے

(۲۱-۲-۱۹۴۱)

راہگیر

کوئی تو مجھ کو بتائے یہ راہگیر ہے کون
حسین انکھڑیوں میں حسن شش جہات لئے
دمِ سحر ہے سر رہگزار محوِ سفر
سیاہ گیسوؤں میں بے کسی کی رات لئے
چلی ہے کونسی دُنیائے بے نشاں کی طرف
ہزار گردشِ افلاک سات سات لئے
جبینِ ناز پہ درد مسافری کا ہجوم
پلک پلک پہ غبارِ رہِ حیات لئے
اُداس چہرے پہ اک التجا کی گویائی
خموش لب پہ کوئی بے صدا سی بات لئے
خزاں کی سلطنتوں میں ہے ایک پھول رواں
ہر ایک خار سے اُمید التفات لئے
لگی ہے اس کو لگن جانے کس زمانے کی
بھٹک گئی نہ ہو ٹھوکر کوئی زمانے کی

(۲۴-۳-۱۹۴۲)

۲۹۴۲ء کا ایک جنگی پوسٹر

اک محافظ ستارے نے کل شام
کرۂ ارض کو خبر دی ہے !

ملک مریخ کے لٹیروں نے
وادیٔ مہ تباہ کردی ہے !

جادۂ کہکشاں کے دونوں طرف
گھاٹی گھاٹی لہو سے بھر دی ہے!

آندھیوں نے انھیں خرام دیا
بجلیوں نے انھیں نظر دی ہے!

ڈوبتا سورج ان کا مغفر ہے
شفق سُرخ ان کی وردی ہے !

آج انہوں نے نظام عالم کو
دعوتِ آتش و شرر دی ہے !

آن پہنچی ہے امتحان کی گھڑی
خاکیو! وقتِ پائے مردی ہے!

یہ تمہی نے ہی ماہ و پرویں کو
اپنی تابانیٔ نظر دی ہے!

یہ تمہی نے ہی بزمِ انجم کو
تابشِ سلکِ صد گہر دی ہے !

یہ تمہی نے متاعِ نور اپنی
مشتری کو بھی مشت بھر دی ہے!

بارہا وقت کے اندھیرے کو
تم نے رنگینیٔ سحر دی ہے !

جن مقامات کی خبر ہی نہیں
ان مقامات کی خبر دی ہے !

تم وہ منزل ہو جس کے جلووں نے
منزلوں کو رہِ سفر دی ہے !

سینکڑوں نا شگفتہ پھولوں کی بو　　تم نے اس گلستاں میں بھر دی ہے
سینکڑوں ہستیوں کو صبحِ نمود　　اپنی ہستی میں ڈوب کر دی ہے
سرمۂ چشم صد جہاں کے لئے　　اپنے ایواں کی خاکِ در دی ہے
کون بتلائے تم نے اپنی شراب　　میکدے میں کدھر کدھر دی ہے
آج تقدیرِ زندگی نے صدا　　پھر تمہیں نوبتِ دگر دی ہے
چشم براہ روح عالم ہے　　منتظر چرخ لاجوردی ہے
کہو کس چیز کی کمی ہے تمہیں　　دل دیا ہے تمہیں نظر دی ہے
زندگانی کے قافلوں کے لیے　　تم کو آوازِ راہبر دی ہے
آب اور گل کے اِک کھلونے کو　　شانِ دارائی بشر دی ہے

پھاند جاؤ حدیں زمانوں کی
تھام لو باگ آسمانوں کی

(۱۸-۷-۱۹۴۲)

ساتھی

پھول کی خوشبو ہنستی آئی
میں خوشبو میں، خوشبو مجھ میں
مجھ سے چھو کر، مجھ میں بس کر
لاکھوں پھولوں کی مہکاریں،
مجھ سے الگ ہیں مجھ سے جدا ہیں
ان کو بکھیرا، اُن کو اُڑایا

میرے بسیرے کو مہکانے
اس کو میں جانوں، مجھ کو وہ جانے
اس کی بہاریں، اس کے زمانے
رکھتے ہیں گلشن ویرانے
میں بیگانہ، وہ بیگانے
دستِ خزاں نے، موجِ صبا نے

بھولا بھٹکا، ناداں قطرہ
آنسو بن کر دوڑا آیا
اس کا تھرکنا، اس کا تڑپنا
اس کی ہستی، میری ہستی
باقی سارے گوہر پارے

آنکھوں کی پتلی کو سجانے
میری پلکیں اس کے ٹھکانے
میرے قصے، میرے فسانے
اُس کے موتی، میرے خزانے
خاک کے ذرّے ریت کے دانے

پربت کی اُونچی چوٹی سے
ٹھنڈی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے
اپنی ٹھنڈک لے کر آئے
ان کی ہستی کا پیراہن

دامن پھیلایا جو گھٹا نے
بے خود، آوارہ، مستانے
میری آگ میں گھل مل جانے
میری سانس کے تانے بانے

ان کے جھولے، میری اُمنگیں ان کی نوائیں، میرے ترانے
باقی سارے طوفانوں کو جذب کیا پہنائے فضا نے

فطرت کی یہ گونا گونی گلشن، بن، وادی، ویرانے
کانٹے، کلیاں، نور، اندھیرا انجمنیں، شمعیں، پروانے
لاکھوں شاطر، لاکھوں مہرے پھیلے ہیں شطرنج کے خانے
جانتا ہوں میں یہ سب کیا ہیں صہبا سے خالی پیمانے
بھوکی مٹی کو سونپے ہیں دُنیا نے اپنے نذرانے

جس نے میرا دامن تھاما آیا جو مجھ میں بس جانے
میرے طوفانوں میں بہنے میری موجوں میں لہرانے
میرے سوزِ دل کی لَو سے اپنے من کی جوت جگانے
زیست کی پہنائی میں پھیلے موت کی گیرائی کو نہ جانے
اس کا بربط میرے نغمے اس کے گیسو میرے شانے

میری نظریں، اس کی دُنیا
میری سانسیں، اس کے زمانے

(۲۸-۱۰-۱۹۴۲)

غزل

یہ کیا عجیب راز ہے سمجھ سکوں تو بات ہے
نہ اب وہ ان کی بے رُخی نہ اب وہ التفات ہے

مری تباہیوں کا بھی فسانہ کیا فسانہ ہے
نہ بجلیوں کا تذکرہ نہ آشیاں کی بات ہے

یہ کیا سکوں ہے؟ اس سکوں میں کتنے اضطراب ہیں
یہ کس کا میرے سینے پر خنک سا ہات ہے

نگاہ میں بسا بسا' نگاہ سے بچا بچا
رُکا رُکا' کِچھا کِچھا' یہ کون میرے سات ہے؟

چراغ بُجھ چکے' پتنگے جل چکے' سحر ہوئی
مگر ابھی میری جُدائیوں کی رات' رات ہے

(۲۸-۱۰-۱۹۴۲)

دستک

کس نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے ؟
جا کے دیکھوں تو، کون آیا ہے ؟

کون آیا ہے میرے دوارے پر
رات آئی کہاں بچارے پر !

میرے چھپر سے ٹیک کر کاندھا
کون استادہ ہے تھکا ماندہ ؟

میری کٹیا میں آؤ، ستا لو،
یہ مرا ساغرِ شکستہ لو !

میری چھاگل سے گھونٹ پانی پیو
اِک نئے عزم کی جوانی پیو

ٹمٹماتے دیئے کی جھلمل میں
جوت سُلگا لو اِک نئی دل میں

یہ مرے آنسوؤں کی شبنم لو
پاؤں کے آبلوں کی مرہم لو

یہ مجھے افتخار دو، بیٹھو
سر سے گٹھڑی اُتار دو، بیٹھو

میرے زانو پہ اپنا سر رکھ کر
طاق پر کاہشِ سفر، رکھ کر

نیند کی انجمن میں کھو جاؤ
منزلوں کے سپن میں کھو جاؤ

خواب، وادی و کوہسار کے خواب
دشت و دریا و آبشار کے خواب

خواب اندھیری طویل راہوں کے
کنجِ صحرا کی خیمہ گاہوں کے

جہاں اِک شمع ابھی فروزاں ہے — جہاں اک دل تپاں ہے سوزاں ہے

تم لپٹ جاؤ ان خیالوں سے — اور میں کھیلوں تمھارے بالوں سے

صبح جب نور کا فسوں برسے — سُونی پگڈنڈیوں پہ خوں برسے

باگ تھامے حسیں اِرادوں کی — تم خبر لو پھر اپنے جادوں کی

جب تلک زیست کا سفینہ بہے — اجنبی اجنبی کو یاد رہے

مجھ کو یہ اپنی یاد دے جاؤ — آؤ بھی کیوں جھجکتے ہو آؤ

تم کہاں ہو؟ کہاں؟ جواب تو دو — او مرے میہماں! جواب تو دو

تم نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا! — کس کی دستک تھی؟ کون آیا تھا؟

نیم شب، قافلے ستاروں کے — تیز ہرکارے اَبر پاروں کے

کس نے نیندوں کو میری ٹوکا تھا؟
کوئی جھونکا تھا؟ کوئی دھوکا تھا؟

(۱۰-۱-۱۹۴۳)

پھر کیا ہو؟

آسماں بھی نہ ہو زمیں بھی نہ ہو
دشت و دریا نہ کوہ و صحرا ہو

دن ہو بے نور، رات بے ظلمت
ماہ کافور، مہر عنقا ہو

بے نشاں بے کراں فضاؤں میں
کوئی تارا نہ جھلملاتا ہو

نہ ازل ہو نہ ہو ابد کوئی
کوئی جلوہ نہ کوئی پردا ہو

نہ کہیں بھی نشانِ ہستی ہو
نہ کہیں بھی گمانِ دُنیا ہو

موت ناپید، زندگی معدوم
نہ حقیقت ہو اور نہ دھوکا ہو

کہیں نقش وجود تک نہ رہے
کہیں اِک سانس تک نہ آتا ہو

یہ جہاں بھی نہ ہو، خدا بھی نہ ہو
کہیں اِک ذرّہ تک نہ اُڑتا ہو

سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں
یہاں کچھ بھی نہ ہو تو پھر کیا ہو؟

(۱۵-۲-۱۹۴۳)

گاڑی میں......

یہ بیکراں فضائیں جہاں اپنے چہرے سے
پردہ اُلٹ دیا ہے نمودِ حیات نے
شاداب مرغزار کہ دیکھی ہے جس جگہ
اپنے نمو کی آخری حد، ڈال پات نے
گنجان جھنڈ جن کے تلے کہنہ سال دُھوپ
آئی کبھی نہ سُوت شعاعوں کا کاتنے
پیڑوں کے شاخچوں پہ چہکتے ہوئے طیور
تاکا جنھیں کبھی نہ شکاری کی گھات نے
تم کتنے خوش نصیب ہو آزاد جنگلو!
اب تم تمہیں چھوا نہیں انساں کے ہات نے
اب تک تمھاری صبح کو دھندلا نہیں کیا
تہذیب کے نظام کی تاریک رات نے

پھینکی نہیں تمھارے مقامِ بلند پر
کوئی کمند سلسلۂ حادثات نے
اچھے ہو تم کہ تم کو پریشاں نہیں کیا
انسانیت کے دل کی کسی واردات نے
اے وائے اس حسین بیاباں کو کس طرح
نیندوں سے بھر دیا ہے نسیم حیات نے
ان وسعتوں میں کلبہ وایواں کوئی نہیں
ان کنکروں میں بندہ وسلطاں کوئی نہیں

(۱۲-۳-۱۹۴۴)

طلوعِ فرض

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہُوں
رواں ہوں، ہمرہِ صد کارواں ہوں

سرِ بازار انسانوں کا انبوہ،
کسی دستِ گل اندوزِ حنا میں
زمانے کی حسیں رتھ کی لگامیں
کسی کف پر خراشِ خارِ محنت،
عدم کے راستے پر آنکھ میچے
کوئی آگے رواں ہے کوئی پیچھے

سڑک کے موڑ پر نالی میں پانی
تڑپتا تلملاتا جارہا ہے
زدِ جارُوب کھاتا جارہا ہے
وہی مجبوریٔ افتادِ مقصد
جو اس کی کاہشِ رفتار میں ہے
مرے ہر گامِ ناہموار میں ہے

کوئی خاموش پنچھی اپنے دل میں
اُمیدوں کے سنہرے جال بن کے
اُڑا جاتا ہے چگنے دانے دُنکے
فضائے زندگی کی آندھیوں سے
ہے ہراک کو بچشم تر گزرنا — ،
مجھے چل کر اسے اُڑ کر گزرنا

وہ اک اندھی بھکارن لڑکھڑائی
کہ چوراہے کے کھمبے کو پکڑ لے
صدا سے راہگیروں کو جکڑ لے
یہ پھیلا پھیلا ، میلا میلا دامن
یہ کاسہ ، یہ گلوئے شور انگیز
میرا دفتر ، مری مسلیں ، مرامیز

ابھی کمسن ہے اس کو کیا پڑی ہے
جسے جزداں بھی اِک بارگراں ہے
وہ بچہ بھی سُوئے مکتب رواں ہے
شریکِ کاروانِ زندگانی !
یہ کیا ہے مالکِ زندانِ تقدیر !
جوان و پیر کے پاؤں میں زنجیر !

شبِ رفتہ کی یادوں کو بھلانے
دکاں پر پان کھانے آ گئی ہے
جہاں کا منہ چڑانے آ گئی ہے
ہے اس میں مجھ میں کتنا فرق! لیکن
وہی اِک فکر اس کو بھی، مجھے بھی
کہ آنے والی شب کیسے کٹے گی!

چمکتی کار فراٹے سے گزری
غبارِ رہ نے کروٹ بدلی، جاگا
اُٹھا، اِک دو قدم تک ساتھ بھاگا
پیاپے ٹھوکروں کا یہ تسلسل
یہی پرواز بھی، اُفتادگی بھی،
متاعِ زیست اس کی بھی، مری بھی

گلستاں میں کہیں بھونرے نے چوسا
گلوں کا رس، شرابوں سا نشیلا
کہیں پر گھونٹ اِک کڑوا کسیلا
کسی سڑتے ہوئے جوہڑ کے اندر
پڑا اِک رینگتے کیڑے کو پینا،
مگر مقصد وہی دو سانس جینا

وہ نکلا پھوٹ کر نورِ سحر سے

نظام زیست کا دریائے خوناب

پسینوں، آنسوؤں کا ایک سیلاب

کہ جس کی رَو میں بہتا جارہا ہے

گداگر کا کدو بھی جام جم بھی،

کلھاڑی بھی، درانتی بھی، قلم بھی!،

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں

رواں ہوں ہمرہِ صدکارواں ہوں

(۱۶-۸-۱۹۴۳)

کلبہ وایواں

گھاس کی گٹھڑی کے نیچے وہ روشن روشن چہرہ'
رُوپ' جو شاہی ایوانوں کے پھولوں کو شرمائے
راہگزر پر سُوکھے پتے چننے والی باہنیں...... '
باہنیں جن کو دیکھ کے موجِ کوثر بل کھا جائے
بیلوں کے چھکڑوں کے پیچھے چلتے زخمی پاؤں
پاؤں' جن کی آہٹ سوئی تقدیروں کو جگائے
بھیک کے اک ٹکڑے کو ترستی کھوئی کھوئی آنکھیں
پلکیں' جن کے نیچے لاکھوں دُنیاؤں کے سائے
یہ زخمی رُوحیں' یہ دُکھتے دل' یہ جلتے سینے
کوئی انھیں سمجھائے جا کر' کوئی انھیں بتلائے

تم اچھے ہو ان ہونٹوں سے جن کی خونیں سُرخی
محلوں کے سینوں کے اندر آگ لگاتی جائے
تم اچھے ہو ان زُلفوں سے، جن کی ظالم خوشبو
پھولوں کی وادی میں ناگن بن کر ڈسنے آئے
تم خوش قسمت ہو ان آنکھوں سے جن کی تنویریں
سونے چاندی کے ایوانوں میں، مرگھٹ کے سائے

وہ چھپر اچھے، جن میں ہوں دل سے دل کی باتیں
اُن بنگلوں سے جن میں بسیں گونگے دن، بہری راتیں

(۲۹-۸-۱۹۴۳)

دل دریا سمندروں ڈونگھے......

اتنی آنکھیں، اتنے ماتھے، اتنے ہونٹ
چشمکیں ، تیور ، تبسم ، قہقہے
اس قدر غماز ، اتنے ترجماں
اور پھر بھی لاکھ پیغام اَن کہے
لاکھ اشارے جو ہیں اَن بوجھے ابھی
لاکھ باتیں جو ہیں گویائی سے دُور
دُور — دل کے کُنجِ ناموجود میں
روز وشب موجود، پیچاں، ناصبور !
کون اندھیری گھاٹیوں کو پھاند کر
جائے اُن پرشور سناٹوں کے پار
گونجتے ہیں لاکھ سندیسے جہاں
کان سن سکتے نہیں جن کی پُکار !

یہ جبینوں پر لکیریں — موج موج !
کتنے افسانوں کی ژولیدہ سطور

انکھڑیوں میں ترمراتی ڈوریاں
کتنے قصوں کی زبانِ بے شعور
جام لب کی کھنکھناہٹ میں نہاں
کتنے مے خانوں کا شورِ بے خروش
اِک تبسم ، اِک تکلم ، اِک نگاہ
کتنے احساسات کی صوتِ خموش !

کون اُلٹ سکتا ہے یہ بوجھل نقاب
پردہ در پردہ ، حجاب اندر حجاب
اس طرف میں گوش برآواز ہوں
اس طرف ہر ذرّہ اِک بجتا رباب
کس کو طاقت؟ کس کو یارا؟ کس کو تاب؟
کون ان بیاکل صداؤں کو سنے
اور ضمیر ہر صدا میں ڈوب کر
کون دل کے باغ کی کلیاں چُنے !

کاش میں اِتنا سمجھ سکتا کبھی
جب کوئی کرتا ہے مجھ سے ہنس کے بات
کیا یہ ہو سکتا ہے وقتِ گفتگو
اس کا دل بھی ہنستا ہو ہونٹوں کے سات

مُجھ خراب آرزو کے حال پر
پھوٹ پڑتی ہے کسی کی آنکھ جب
مُجھ کو ڈس جاتا ہے یہ چبھتا خیال'
اس کا دل مجھ پر نہ ہو خندہ بلب !

کیا یہ سب سچ ہے جو کہتے ہیں یہ ہونٹ
ہونٹ' دھبے روح کے قرطاس پر
ہونٹ' قصر دل کے دروازے پہ قفل
ہونٹ' مہریں نامۂ احساس پر

اور ان آنکھوں پہ کس کو اعتبار ؟
آنکھیں پردے روزن ادراک کے
کس طرح سمجھیں رموزِ زیست کو
آئینے پر دو کھلونے خاک کے !

کس طرح مانوں کہ یہ سب سچ ہے سچ
مجھ سے جو کہتے ہیں اس دُنیا کے لوگ
چھو سکا ہے ان کے سینوں کو کبھی!
میرے دل کا درد! میرے من کا روگ!

(۱۳-۱۲-۱۹۴۳)

ڈور کے پیڑ

آج آخر میں نے دل میں ٹھان لی—
آج ان کے پاس جاؤں گا ضرور !
— پار ان پھیلی چراگاہوں کے پار
ہانپتی پگڈنڈیوں سے دُور —دُور

اس طرف سے ایک عمر آیا کیے
میرے نام ان کے بلاوے روز وشب
دل کو سندیسے ' نگہ کو دعوتیں
شوق میں ڈوبے ہوئے پیغام سب

بارہا اٹھی مری حیراں نظر —
صبحدم ان کے ٹھکانوں کی طرف
بارہا دل نے یہ چپکے سے کہا
وہ کھڑے ہیں تیرے ارماں' صف بہ صف!

بارہا جب ان کے محلوں کے کلس
جگمگا اُٹھے فروغِ شام سے '

میں نے دیکھی دُور سے اُٹھتی ہوئی
تودۂ خاکسترِ ایام سے
زندگی کے بے نشاں خوابوں کی دُھند—
منزلیں جن تک کوئی رستہ نہیں
آرزوؤں کی سنہری بستیاں
بستیاں، جن میں کوئی بستا نہیں—

کر رہے ہیں روز و شب اِک عُمر سے
میری شرمیلی تمناؤں سے چھیڑ
دُور، جھکتے آسمان کی اوٹ میں
ٹیکری پر لہلہانے والے پیڑ
آج آخر میں نے دل میں ٹھان لی
آج جا پہنچا میں، جا پہنچا وہاں
خستہ دل پیڑوں کی اِک سُونی قطار
خشک شاخیں، کھڑکھڑاتی ٹہنیاں
بے کفن لاشوں کی طرح آویختہ
اپنی جھولی میں لئے پہنائے دشت
برگ و بر کی لاکھ پشتوں کے مزار
ان میں جھونکوں کی صدائے بازگشت
جس طرح مردے کریں سرگوشیاں

دیکھتا ہوں اور یقیں آتا نہیں

آج ان ویرانیوں کا میرے نام
کوئی پیغامِ حسیں آتا نہیں
کوئی محمل ، کوئی گردِ کارواں
کوئی آوازِ جرس ، کچھ بھی نہیں
آرزوؤں کے سمن زاروں میں آج
رنگ، بو، چھب، روپ، رس کچھ بھی نہیں

ریتلے ٹیلوں کی ڈھلوانوں کے پار
وہ رہا میرا نشیمن ، دُور ادھر
کھیلتا ہے جس کے بام ودر کے ساتھ
ٹیکری سے دور ادھر، اک نور ادھر
نور—اِک رنگیں دُھوئیں کی طرح نور
روشنی —اِک گل بداماں روشنی

میں تجھے ڈھونڈوں کہاں ڈھونڈوں کہاں
میری نظروں سے گریزاں، روشنی !

(۳۰-۱۲-۱۹۴۳)

چولھا

ڈوریاں جب سے تھرتھرائی ہیں
زیست کی نیم باز پلکوں کی
آگ جلتی ہے تیرے سینے میں
روشنی جھونپڑوں ، محلکوں کی
آگ جلتی ہے، زندگی کی آگ !
جس کی لپٹوں پہ ہاتھ سینکتے ہیں
آنسوؤں کی نمی سے ٹھٹھرے راگ !
جس کے زخمی دھوئیں میں چھپ چھپ کر
روح سے روح بات کرتی ہے

دل کے داغوں کی سطحِ سوزاں پر
قہقہوں کی برات اُترتی ہے

تو نے دیکھیں وہ اَن گنت شامیں
جب ترے آہ برلب انگارے
ہوگئے بُجھ کے سرد راکھ کا ڈھیر
چھڑ گئے دو دلوں کے اکتارے
دو نگاہیں اٹھیں، ملیں، چمکیں،
آنے والی سحر کی دھندلی آس
دو تڑپتے دلوں میں تیر گئی

اوندھی ہنڈیا' خنک توے کے پاس

(۱-۲-۱۹۴۴)

پنواڑی

بوڑھا پنواڑی، اس کے بالوں میں مانگ ہے نیاری
آنکھوں میں جیون کی بجھتی اگنی کی چنگاری —،
نام کی اک ہٹی کے اندر بوسیدہ الماری
آگے پیتل کے تختے پر اس کی دنیا ساری
پان، کتھا، سگرٹ، تمباکو، چونا، لونگ، سپاری

عُمر اس بوڑھے پنواڑی کی پان لگاتے گزری
چونا گھولتے، چھالیا کاٹتے، کتھ پگھلاتے گزری
سگرٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتے گزری
کتنے شرابی مشتریوں سے نین ملاتے گزری
چند کسیلے پتوں کی گتھی سلجھاتے گزری

کون اس گتھی کو سلجھائے ' دنیا ایک پہیلی
دو دن ایک پھٹی چادر میں دُکھ کی آندھی جھیلی
دو کڑوی سانسیں لیں' دو چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو' کھیل جو ہونی کھیلی
پنواڑی کی ارتھی اٹھی ' بابا اللہ بیلی

صبح بھجن کی تان منوہر جھنن جھنن لہرائے
ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے
شام کو اس کا کمسن بالا بیٹھا پان لگائے
جھن جھن' ٹھن ٹھن چونے والی کٹوری بجتی جائے
ایک پتنگا دیپک پر جل جائے' دوسرا آئے

(۸-۲-۱۹۴۴)

واماندہ

قافلے کتنے پیش و پس گزرے !
میری واماندگی پہ ہنس گزرے !
کتنے تارے چمک چمک ڈوبے
کتنے بادل برس برس گزرے !
سلسلے ہانپتے زمانوں کے
تیز رفتار ' دور رس ' گزرے
کتنی راتیں تڑپ تڑپ کاٹیں !
کس قدر دن ترس ترس گزرے
وہ نہ پھر لوٹے ' مدتیں بیتیں
اُنھیں دیکھے ہوئے برس گزرے
اب تو یاد اُن کی دل میں آتی ہے
جیسے بجلی بہ نبضِ خس گزرے
ابدی خامشی کی آندھی میں
جیسے کوئی پر مگس گزرے
دُور سے راہرو کے کانوں میں
جس طرح نالۂ جرس گزرے

(۸-۲-۱۹۴۴)

ایک نظم

دوست، یہ سب سچ ہے، لیکن زندگی
کاٹنی تو ہے، بسر کرنی تو ہے !
گھات میں ہو منتظر چلے پہ تیر
ہرنیوں نے چوکڑی بھرنی تو ہے

کاٹ دیں کتنی رُتوں کی گردنیں،
بھاگتے لمحوں کے چلتے آروں نے
ہاں، یہ سب سچ ہے، پر اس کا کیا علاج
چار دن جینا ہے، ہم بے چاروں نے

ہم نے بھی اپنی نحیف آواز کو
شاملِ شورِ جہاں کرنا تو ہے !
زندگی اک گہری، کڑوی، لمبی سانس
دوست، پہلے جی بھی لیں، مرنا تو ہے

موت کتنی تیرہ و تاریک ہے !
ہو گی، لیکن مجھ کو اس کا غم نہیں
قبر کے اندھے گڑھے کے اِس طرف
اس طرف، باہر، اندھیرا کم نہیں

ہاں اسی گُم سُم اندھیرے میں ابھی
بیٹھ کر وہ راکھ چُننی ہے، ہمیں
راکھ، ان دنیاؤں کی، جو جل بُجھیں
راکھ، جس میں لاکھ خونیں شبنمیں
زیست کی پلکوں سے ٹپ ٹپ پھُوٹتی
جانے کب سے، جذب ہوتی آئی ہیں
کتنی روحیں، ان زمانوں کا خمیر
اپنے اشکوں میں سموتی آئی ہیں

جانتا ہوں، میرے دل کی آگ کو
چند ماہ وسال کے ایندھن کا ڈھیر
دیر تک تابندہ رکھ سکتا نہیں

زیست امکانات کا اِک ہیر پھیر
کیا عجب ہے، میرے سینے کا شرر
اک تمنائے بغل گیری کے سات
وقت کے مرگھٹ پہ باہیں کھول دے
اِک نرالی صبح بن جائے یہ رات

(۱۸-۲-۱۹۴۴)

بن کی چڑیا

صبح سویرے بن کی چڑیا — من کی بات بتائے
جنگل میں سرکنڈے کی کونپل پر بیٹھی گائے
ننھی چونچ پہ چوں چر چوں چر چوں کی چونچل بانی
کرن کرن پر ناچ رہی ہے اس کے من کی کہانی
کیا گاتی ہے؟ کیا کہتی ہے؟ کون اس بھید کو کھولے؟
جانے دُور کے کس اَن دیکھے دیس کی بولی بولے؟
کون سنے، ہاں کون سنے، راگ اس کے راگ البیلے
سب کے سب بہرے ہیں — میداں، وادی، دریا، ٹیلے
ظالم تنہائی کا جادو ویرانوں پر کھیلے !
دُور سرابوں کی جھلمل روحوں پر آگ انڈیلے !
نوکِ خار کھلنڈرے ہرنوں کو کلپائے !
گانے والی چڑیا اپنا راگ الاپے جائے

(۱-۸-۱۹۴۴)

بارش کے بعد

حسن تہذیب کا آئینہ خوبی ——بازار
—- چہرۂ شہر پہ دو شوخ لٹوں کا جادہ-
جس کے دو رویہ، پُر آشوب کمیں گاہوں میں
جسم اور دل کے لذائذ کی صفِ استادہ
راہگیروں کی نگاہوں کو صدا دیتی ہے

مینہ تھما ہے، اور ابھی ہلکی پھہار آتی ہے
کچکچاتے ہوئے کیچڑ کو کچوکے دیتی......،
کھلکھلاتی ہوئی——قدموں کی قطار آتی ہے
کھیلتے بولتے انبوہ اور آموں کی دکاں !
نہ پپیہے کی، نہ کوئل کی پکار آتی ہے
آم ! ہاں جن کی غریب الوطنی کی سوغات
دُور سے ریل کے ڈبوں پہ سوار آتی ہے !
آم ہی آم ہیں ! اور اُن کے سوا کچھ بھی نہیں
امریوں کے نہ وہ جھولے، نہ وہ پینگوں کی کمان !
جھیل کے تٹ پہ، گھنی چھاؤں میں جو گونجا کی

ناچتی سکھیوں کی بجتی ہوئی پایل کی وہ تان
سینۂ وقت سے پھوٹی ہوئی موجِ الہام
موت کی نیند ہے گیتوں کی کتابوں میں پڑی
اب یہی رہ گئیں — انسان کے ماتم کے لئے
بڈیاں - بچھڑے ہوئے آموں کی' چھابوں میں پڑی
لوگ' بن گھٹلیوں کے' پچکے ہوئے' چھلکوں سے
رائیگاں چوستے ہیں آموں کی فصلوں کی شراب
آہ ! ساون کا وہ امرت' جو امرس نہ رہا

پاس ہی تھالوں پہ بجتا ہوا بوندوں کا رباب
نانبائی کی دکاں ! جس کے چراغوں کی چمک
جلتے پاتال کے دوزخ سے اُڑا لائی ہے
سینکڑوں بھوک کے مارے ہوئے پروانوں کو
سر پھرے کیڑے ہیں' بازار کی پہنائی ہے
یہ کتلیوں میں شپاشپ' یہ تووں پر تڑ تڑ'
اور وہ اک تھال میں کچھ پَر جلی چاپیں باقی
یہ "اٹکتے ہوئے" لقمے — یہ "پھڑکتے ہوئے" گھونٹ
"مے کی ہر بوند — متاعِ دو جہاں ہے ساقی"

(۱۶-۸-۱۹۴۴)

ایک پُر نشاط جلوس کے ساتھ

کون — اس اُونچی چھت کی بوسیدہ منڈیروں کے قریب؟

نیچے خلعت پوش بازاروں میں، سیلابِ سرور !
ناچتے پاؤں، — تھرکتی باہیں، — محوِ نغمہ ہونٹ

میں بھی آنکلا ہوں — اتنی دُور سے — دردوں سے چور
صرف اس اُمید پر شاید کہ گزرے اب کے بھی،
تیرے گھر کے سامنے والی سڑک کے پاس سے
اس حسیں تہوار کی رنگینیوں کا کارواں — !

شاید اب کے پھر بھی، شوقِ دید کے احساس سے
تو بھی آ نکلے سرِ بام — آہ یہ سودائے خام

جا رہا ہوں زرفشاں پوشاک میں لپٹا ہُوا
زرفشاں پوشاک کے نیچے دلِ حسرت نصیب
اک شرر، پیراہن خاشاک میں لپٹا ہُوا

آج کیوں ان ٹھوکروں کی پے بہ پے اُفتاد میں
اک عجب آسودگی محسوس ہوتی ہے مجھے
کیوں اس انبوہِ رواں کی شورشوں کے درمیاں
اک حسیں موجودگی محسوس ہوتی ہے مجھے

پاؤں تو اُٹھتے ہیں—لیکن آنکھ اُٹھ سکتی نہیں
جا رہا ہوں میں نہ جانے کس سے شرماتا ہوا
میں لرز اُٹھتا ہوں کس کی ٹکٹکی کے وہم سے ؟
میں جھجک جاتا ہوں کس کے سامنے آتا ہوا ؟

کس کا چہرہ ہے؟ کہیں ان گھونگھٹوں کے درمیاں—
چوڑیوں والی کلائی ؟ جھومروں والی جبیں ؟
ممٹیوں پر سے پھسلتا ہی نہیں کنکر کوئی !
کون ہے موجود ؟ جو موجود بھی شاید نہیں ! !

(۲۷-۹-۱۹۴۴)

غزل

کیا روپ دوستی کا ؟ کیا رنگ دشمنی کا ؟
کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا !

اک تنکا ' آشیانہ اِک راگنی ' اثاثہ
اک موسمِ بہاراں ' مہمان دو گھڑی کا

آخر کوئی کنارا اس سیلِ بے کراں کا ؟
آخر کوئی مداوا اس دردِ زندگی کا ؟

میری سیہ شمی نے اِک عمر آرزو کی......
لرزے کبھی اُفق پر تاگا سا روشنی کا !

شاید اِدھر سے گزرے پھر بھی ترا سفینہ
بیٹھا ہوا ہوں ساحل پر نے بلب کبھی کا !

اس التفات پر ہوں لاکھ التفات قرباں
مجھ سے کبھی نہ پھیرا رُخ تو نے بے رُخی کا

اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں'
لیکن یہ ایک میٹھا میٹھا سا روگ جی کا !

او مسکراتے تارو! او کھلکھلاتے پھولو!
کوئی علاج میری آشفتہ خاطری کا

(۲۹-۹-۱۹۴۴)

یاد

ایک اُجلا سا کانپتا دھبا
ذہن کی سطح پر لڑھکتا ہُوا

نقش، جس میں کبھی سمٹ آئی
لاکھ یادوں کی مست انگڑائی

داغ—جس کی جبینِ غم پہ کبھی
ہوگیا آکے لرزہ براندام
کسی بھولے ہوئے حبیب کا نام

زخم جس کی تپکتی تہ سے کبھی
رس پڑے، دُکھتے گھونگھٹ اُلٹا کے
کسی چہرے کے سینکڑوں خاک

عکس اَن دیکھا عکس تیرتا ہے
آنسوؤں کی روانیوں میں رواں
روح کی شورشوں میں سایہ کناں
ذہن کی سطح پر لڑھکتا ہُوا

(۹-۱۲-۱۹۴۴)

اِمروز

ابد کے سمندر کی اِک موج جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے
کسی اَن سنی دائمی راگنی کی کوئی تان — آزردہ' آوارہ' برباد
جو دم بھر کو آ کر مری الجھی الجھی سی سانسوں کے سنگیت میں ڈھل گئی ہے
زمانے کی پھیلی ہوئی بیکراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی میعاد
طلوع و غروب مہ و مہر کے جاودانی تسلسل کی دو چار کڑیاں'
یہ کچھ تھرتھراتے اجالوں کا روماں' یہ کچھ سنسناتے اندھیروں کا قصہ
یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں میں ہوں
یہی میرا حصہ ازل سے ابد کے خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصہ!

مجھے کیا خبر' وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں
مقدر کے کتنے کھلونے' زمانوں کے ہنگامے' صدیوں کے صد ہا ہیولے
مجھے کیا تعلق — میری آخری سانس کے بعد بھی دوش گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشارِ رواں کا وہ آنچل' جو تاروں کو چھو لے

مگر آہ یہ لمحۂ مختصر — جو مری زندگی، میرا زادِ سفر ہے!
مرے ساتھ ہے، میرے بس میں ہے، میری ہتھیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لئے اس خراباتِ شام و سحر میں یہی کچھ!
یہ اِک مہلتِ کاوشِ دردِ ہستی! یہ اک فرصتِ کوششِ آہ و نالہ!

یہ صہبائے امروز، جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بدورِ حیات آ گئی ہے، یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں، پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں
یہ دنیائے امروز میری ہے، میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں!
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے
(۱۸-۳-۱۹۴۵)

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

تنگ پگڈنڈی — سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے، دونوں سمت، گہرے غار، منہ کھولے ہوئے
آگے، ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پَر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آ کے رستے پر کوئی نخلِ بلند
تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے، ڈگمگاتے رہرووں کے قافلے

ایک بوسیدہ، خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ،
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں!
آہ! ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں

(۴-۱۲-۱۹۴۸)

تیرے دیس میں

مدت کے بعد آج ادھر سے گزر ہوا
تیری گلی کے موڑ پہ رُک سا گیا ہوں میں
اِک لمحے کے لئے مجھے بیتے ہوئے سمے
لوٹا دیئے ہیں سلسلۂ صبح و شام نے
ایک ایک کر کے گزرے ہوئے لاکھ واقعات
پھرنے لگے ہیں میری نگاہوں کے سامنے

تو ہی نہیں ہے بلکہ بڑی مدتوں کے بعد
خود آج اپنے آپ کو یاد آ رہا ہوں میں

اب جانے اس کو کتنے زمانے گزر گئے
اک دن تری نگاہ سے میری نگاہ میں
ٹپکا تو تھا وہ حوصلۂ روزگار سوز
تب میں تھا اور دل کی جوالا دھواں دھواں
زنجیریں تپ گئیں مری لیکن نہ کٹ سکیں
میں جل بُجھا اس آگ کے شعلوں کے درمیاں
تیرے ارادہ بخش بلاوے کے باوجود
سہما رہا میں قید گہِ رسم و راہ میں

میں مانتا ہوں میں نے بغاوت ضرور کی
جبر زمانہ سے؟ نہیں، تیری نگاہ سے؟
لائی ہے ایک ان ہوئی ہونی کی یاد آج
پھر تیری رہ پہ دُور بہت تیری راہ سے

(۹-۱۲-۱۹۴۸)

غزل

جنونِ عشق کی رسمِ عجیب، کیا کہنا — !
میں اُن سے دُور، وہ میرے قریب، کیا کہنا — !

یہ تیرگیٔ مسلسل میں ایک وقفۂ نور
یہ زندگی کا طلسمِ عجیب، کیا کہنا — !

جو تم ہو برقِ نشیمن، تو میں نشیمنِ برق
اُلجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب، کیا کہنا — !

ہجومِ رنگ فراواں سہی — مگر پھر بھی
بہار — نوحۂ صد عندلیب، کیا کہنا — !

ہزار قافلۂ زندگی کی تیرہ شبی
یہ روشنی سی افق کے قریب، کیا کہنا — !

لرز گئی تری لَو میرے ڈگمگانے سے
چراغِ گوشۂ کوئے حبیب، کیا کہنا — !

(۱۰-۱۹۴۹)

جبر و اختیار

دف دفِ طبلک ' نفیر نے ' سرودِ ارغنوں !
بہ رہا ہے ایک نغمہ — چار سُو — نکہت فشاں
خواب گوں ایواں میں ' دھندلے قمقموں کے درمیاں
نرم سانسوں میں انگاروں کی لپک تھامے ہوئے
ناچتے پیکر ہیں — اور آشوبِ صد آہنگ ساز
کیا مجال — اِک چاپ بھی ہو کنگری سے بے نیاز

دائروں میں مست روحیں ' موج موج اور زوج زوج
ہر طرازِ آستیں ' اِک گوشۂ داماں میں گُم
شورشِ ارماں ' کنارِ شورشِ ارماں میں گُم

بیتتے لمحوں کی بجھتی مشعلوں سے پھوٹ کر
تیرتی پھرتی ہے حرفِ آرزو کی نغمگی......
سرد ہونٹوں پر کبھی ' مخمور آنکھوں میں کبھی
کالے کالے بادلوں کے دیس سے آتی ہوئی
رقص کی زنجیر کے سرگم سے ٹکراتی ہوئی

(۱۸-۱۲-۱۹۴۹)

راتوں کو......

آنکھوں میں کوئی بس جاتا ہے
میٹھی سی ہنسی ہنس جاتا ہے
احساس کی لہریں ان تاریک جزیروں سے ٹکراتی ہیں
جہاں نغمے پنکھ سنوارتے ہیں
سنگین فصیلوں کے گنبد سے پہرے دار پکارتے ہیں
''کیا کرتا ہے؟''
دل ڈرتا ہے !
دل ڈرتا ہے ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے'

ان سُونی تنہاراتوں میں
دل ڈوب کے گزری باتوں میں
جب سوچتا ہے' کیا دیکھتا ہے' ہرسمت دھوئیں کا بادل ہے
وادی و بیاباں جل تھل ہے
ذخار سمندر سوکھے ہیں' پُر ہول چٹانیں پگھلی ہیں
دھرتی نے ٹوٹتے تاروں کی جلتی ہوئی لاشیں نگلی ہیں

پہنائے زماں کے سینے پر اک موج انگڑائی لیتی ہے!
اس آب و گل کی دلدل میں اک چاپ سنائی دیتی ہے
اک تھرکن سی، اک دھڑکن سی، آفاق کی ڈھلوانوں میں کہیں
تانیں جو ہمک کر ملتی ہیں، چل پڑتی ہیں، رکتی ہی نہیں،
ان راگنیوں کے بھنور بھنور میں صدہا صدیاں گھوم گئیں
اس قرن آلود مسافت میں لاکھ آبلے پھوٹے، دیپ بجھے
اور آج کے معلوم، ضمیر ہستی کا آہنگِ تپاں
کس دور دیس کے کہروں میں لرزاں لرزاں رقصاں رقصاں
اس سانس کی رو تک پہنچا ہے
اس میرے میز پہ جلتی ہوئی قندیل کی لو تک پہنچا ہے

کون آیا ہے؟ کون آتا ہے؟ کون آئے گا؟
انجانے من کی مورکھتا کو کیا کیا دھیان گزرتا ہے
دل ڈرتا ہے!
دل ڈرتا ہے ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے

(۲۸-۱۲-۱۹۴۹)

غزل

میں تڑپا کیا — اور گیسوئے ناز
سنورتے گئے — دن گزرتے گئے

میں روتا رہا — اور بہاروں کے رنگ
نکھرتے گئے — دن گزرتے گئے

مری زیست پر ان کے جلوؤں کے نقش
اُبھرتے گئے — دن گزرتے گئے

گلستاں کے دامن میں کھل کھل کے پھول
بکھرتے گئے — دن گزرتے گئے

میں ان کے تصور میں کھویا رہا
گزرتے گئے دن — گزرتے گئے

چھلکتے ہوئے جام میں ماہ و سال
اُترتے گئے — دن گزرتے گئے

(۲۷-۲-۱۹۵۰)

غزل

عزم نظر نہیں — ہوس جستجو نہیں
کوئی بھی اب شریک غم آرزو نہیں

ہے اس چمن میں نالۂ صد عندلیب بھی
صرف ایک شورِ قافلۂ رنگ و بو نہیں

مرے نصیبِ شوق میں لکھا تھا یہ مقام
ہر سُو ترے خیال کی دُنیا ہے، تو نہیں

ہنستا ہوں پی کے ساغر زہرابِ زندگی
میں کیا کروں کہ مجھ کو تڑپنے کی خو نہیں

(۲۹-۴-۱۹۵۰)

جہانِ قیصر و جم میں

''ہے کس طرف، مرے بیٹے! تمھاری عمر دراز
ہمارے دیس کے فرماں روا کی درگہَ ناز''

شعاعِ اوّلِ خورشید کی نگاہِ خموش
فضائے صبح کی دھندلاہٹوں میں ڈوب گئی
مجھے وہ لمحۂ ظلمت فشاں نہیں بھولا......
— جب ایک پل کے لئے دو جہاں کی تاریکی
مرے ضمیر کی گہرائیوں سے اُچھلی اور
ابھر کے راستوں اور منزلوں پہ پھیل گئی —

''معاف رکھنا، بڑی بی! مجھے نہیں معلوم!''
''کوئی بھی میرا جہاں میں نہیں''
''ترے مقسوم!''

جہانِ قیصر و جم کی شگفتہ راہوں پر
ضعیف قدموں کے جلتے نشاں بکھرتے گئے
غبار راہ کی پیشانیوں سے مٹتے ہوئے

مرے شعور کے الواح پر اُبھرتے گئے
ہزار لُٹتے ہوئے خرمنوں کے نظارے
نظر کے سامنے آتے گئے، گزرتے گئے

''یہاں کہیں بھی مداوائے اضطراب نہیں،
کہاں ہو لوٹ بھی آؤ''
کوئی جواب نہیں !

کسی کے ہانپتے ارماں جنھیں جگہ نہ ملی
نظامِ زر کے چمکتے ہوئے قرینوں میں
اب ایک دوزخِ احساس بن کے کھولتے ہیں
مرے تڑپتے اِرادوں کے آبگینوں میں !!

پڑا رہے گا یونہی کب تک اے حسنِ پامال
بلند محلوں کے رفعت نورد زینوں میں
عطا ہوا ہے تجھے بھی یہ حق مشیت سے
خراج مانگ بہاروں کی بادشاہت سے

(۱۹۵۰-۶)

غزل

کس کی گھات میں گم سم ہو خوابوں کے شکاری جاگو بھی
اب آکاش سے پورب کا چرواہا ریوڑ ہانک چکا

میں جو تیری راگ سبھا میں راس رچانے آیا تھا
دل کی چھنکتی جھانجن تیری پازیبوں میں ٹانک چکا!

بوجھل پردے، بند جھروکا، ہر سایہ رنگیں دھوکا
میں اک مست ہوا کا جھونکا، دوارے دوارے جھانک چکا

اُجڑی یادوں کے شہرِ خاموشاں میں کیا ڈھونڈ ھتے ہو
اب وہ زمانہ وقت کی میلی چادر میں منہ ڈھانک چکا!

کس کو خبر، اے شمع تری اس ڈولتی لو میں پروانہ
کتنے بگولے پھونک چکا اور کتنے الاؤ پھانک چکا!

(۱۹۵۰-۷)

رودادِ زمانہ

مجھ کو تسلیم ہے یہ بات فسانہ ہی سہی
پھر بھی سوچو تو حقیقت ہے کہ اس دُنیا میں
جب سے ویرانۂ ماضی کے اندھیروں میں کہیں،
رینگتے اژدروں کی زہر بھری پھنکاریں......
نفسِ سینۂ انساں کی خبر لائی ہیں،
ہم نے دیکھا ہے یہی کچھ کہ ہر اک دورِ زماں

—— برف زاروں سے پھسلتی ہوئی صدیوں کا خروش
کھولتے لاوے میں جلتے ہوئے قرنوں کا دُھواں،
نردبانِ سحر و شام کے ساتھ اُٹھتی ہوئی
اس صنم خانہ ایام کی اک اک تعمیر،
کچھ اگر ہے بھی، یہ سب سلسلۂ زیست تو ہے
انھی ناگوں کے خم و پیچِ بدن کی تصویر ——

کیا وہ شوریدگیٔ آب و دُخاں کی منزل
کیا یہ حیرت کدۂ لالہ و گُل کی سرحد

جا بجا وقت کے گنبد میں نظر آتے ہیں
یہی عفریت، خدایانِ جہاں کے اَب و جد
زیبِ اورنگ کہیں، زینتِ محراب کہیں،
ان کی شعلہ سی زباں ہے کہ ازل سے اب تک
چاٹتی آئی ہے ان کانپتی روحوں کا لہو،
جن کے ہونٹوں کی ڈلک، جن کی نگاہوں کی چمک
زہر میں ڈوب کے بھی بُجھ نہ سکی، بجھ نہ سکی

ہاں اسی طرح سرِ سطحِ سوادِ ایام !
بارہا جنبشِ یک موج کے ہلکورے میں
بہ گئے غولِ بیاباں کے گرانڈیل اجسام
بارہا تند ہوائیں چلیں طوفاں آئے
لیکن اِک پھول سے چمٹی ہوئی تتلی نہ گری

کوئی سمجھے، تو حقیقت ہے، نہ سمجھے، تو یہ بات
اِک فسانہ سہی، رودادِ زمانہ نہ سہی

(۱۹۵۰-۷)

ہم سفر

ابھی ابھی سبز کھیتیوں پر
جو دُور تک مست آرزوؤں کی موج بن کر لہک رہی ہیں
سیاہ بادل جھکے ہوئے تھے
اور اب، حسیں دھوپ میں نہاتی فضائیں زلفیں چھٹک رہی ہیں

طویل پٹڑی کے ساتھ رقصاں
مہیب پیڑوں کے گونجتے جُھنڈ! دراز سایوں سے بچتی راہیں
کہ جن کی موہوم سرحدوں پر
نکل کے گاڑی کی کھڑکیوں سے، تری نگاہیں مری نگاہیں
الگ الگ آ کے تھم گئی ہیں
اور ایک اندازِ بے کسی میں، مآلِ امروز سوچتی ہیں!

پلٹ پلٹ کر اُمنڈتے بادل!
سمٹ سمٹ کر سرکتے آنچل!
عجیب اِک لذتِ طرب ہے!

(۱۹۵۰-۷)

اور آج سوچتا ہوں......

اور آج سوچتا ہوں کہ کیوں میرا سوزِ دل
تیرے محل کا جشن چراغاں نہ بن سکا
تیری وفا سے پردۂ محمل نہ اُٹھ سکا
میرا جنوں بھی چاک گریباں نہ بن سکا

آنکھوں میں ممکنات کی طغیانیاں لیے
تو ساحلِ حیات پہ حیراں کھڑی رہی
دُور اک تڑپتی ناؤ، اُفق کے نشیب میں
موجوں کی سیڑھیوں سے اُترتی چلی گئی

دَورِ زماں کی ایک چمکتی سی موڑ پر
تیرے قدم کی چاپ کا میں منتظر رہا
دُور اک حجاب نور سے چھنتا ہوا سرود
پل بھر اُبھر کے کھولتے لمحوں میں گھل گیا

آج اس تمام کاہشِ جاں سوز کا مآل
دُکھتی سی اک خراش جبینِ خیال پر......'
بھولی سی ایک یاد' جو اب بھی کبھی کبھی
پَر تولتی ہے کنگرۂ ماہ و سال پر !

دُنیا تو اک طلوعِ مسلسل کا نام ہے
لیکن ہماری زیست کی مچلی ہوئی کرن
جب بُجھ گئی تو تیرگی لازوال ہے
تو شمعِ انجمن ہے نہ میں شمعِ انجمن

یہ غم نہیں کہ قصۂ لیل و نہار میں
ہم اک حسیں باب نہ ایزاد کر سکے
افسوس یہ ہے جی تو رہا ہوں ترے بغیر
لیکن یہ سوچ' تیرے لیے کون مر سکے !

(۶-۱۰-۱۹۵۰)

دورِ نو؟

زندگانی کا یہ فرسودہ نظام !
آنسوؤں کی صبح اور آہوں کی شام
اس نظامِ کہنہ کو بدلے کوئی

سامنے وہ گوشۂ بالائے بام
چند دیواریں — شکستہ، ناتمام
نیچے اِک سونی گلی کے موڑ پر
روز اپنے دیدۂ بے نور سے
ایک کھڑکی جھانکتی ہے دُور سے !
عُمر گزری، عمر گزری دیکھتے
اب وہاں چھت پر کوئی آتا نہیں
کوئی سہما سایہ لہراتا نہیں !

اب کسی آنچل کا عکسِ بے قرار
چوم کر اُونچی منڈیروں کی جبیں !
سیڑھیوں میں جا کے گم ہوتا نہیں
کھائے جاتی ہیں یہ دیواریں مجھے
ان فصیلوں میں گھرا ہے چارسُو
اِک مرا اُجڑا سا شہر آرزو !
کوئی اس دُنیا کا بھی بدلے نظام !

سینکڑوں خفتہ زمانوں کا خروش
کلبلا اُٹھا ہے ہنگامہ بدوش
دوڑتی ہیں زلزلوں کے ساز پر
ایک دورِ نو کی خونیں اُنگلیاں
پھر بھی میرے اور تیرے درمیاں
کہنہ دیواریں ابھی موجود ہیں
کیوں مری چھوٹی سی دنیائے حزیں
اپنی قسمت کو پلٹ سکتی نہیں ؟
کیوں نظر آتی نہیں بالائے بام
اب کسی کی جھینپتی ، ہنستی نگاہ
کون بدلے اس مری دنیا کو ' آہ !

(۱۹۵۰)

نژادِ نو

برہنہ سر ہیں، برہنہ تن ہیں، برہنہ پا ہیں
شریر روحیں،
ضمیر ہستی کی آرزوئیں
چٹکتی کلیاں
کہ جن سے بوڑھی، اُداس گلیاں
مہک رہی ہیں
غریب بچے، کہ جو شعاعِ سحر گہی ہیں
ہماری قبروں پہ گرتے اشکوں کا سلسلہ ہیں

وہ منزلیں، جن کی جھلکیوں کو ہماری راہیں
ترس رہی ہیں
انہی کے قدموں میں بس رہی ہیں
حسین خوابوں
کی دھندلی دنیائیں جو سرابوں
کا روپ دھارے
ہمارے احساس پر شرارے

انڈیلتی ہیں
انہی کی آنکھوں میں کھیلتی ہیں
انہی کے گُم سم
اُداس چہروں پر جھلملاتے ہوئے تبسم
میں ڈھل گئے ہیں ہمارے آنسو، ہماری آہیں

طویل تاریکیوں میں کھو جائیں گے جب اِک دن
ہمارے سائے
اس اپنی دُنیا کی لاش اُٹھائے
تو سیلِ دوراں
کی کوئی موجِ حیات ساماں
فروغِ فردا
کا رُخ پہ ڈالے مہین پردا،
اچھل کے شاید
سمیٹ لے زندگی کی سرحد
کے اس کنارے
پہ گھومتے عالموں کے دھارے
یہ سب بجا ہے، بجا ہے — لیکن ......

یہ توتلی نوخرام روحیں، کہ جن کی ہر سانس انگبیں ہے
اگر انہی کونپلوں کی قسمت میں نازِ بالیدگی نہیں ہے
تو بہتی ندیوں
میں آنے والی ہزار صدیوں
کا یہ تلاطم
سکوتِ پیہم کا یہ ترنم
یہ جھونکے جھونکے
میں کھلتے گھونگھٹ نئی رُتوں کے
تھکی خلاؤں
میں لاکھ اَن دیکھی کہکشاؤں
کی کاوشِ رَم
ہزار نا آفریدہ عالم......
تمام باطل؛
نہ ان کا مقصد نہ ان کا حاصل
اگر انہی کونپلوں کی قسمت میں نازِ بالیدگی نہیں ہے

(۱۹۵۱-۷)

کانٹے کلیاں

تم سے تو یہ ڈسنے والے کانٹے اچھے' ہنستے پھولو !

چنچل کانٹے' لانبی دوب کی ٹھنڈی چھاؤں کے متوالے'
اپنی جلتی جلتی زباں سے چاٹ چاٹ کے دکھتے چھالے'
ہر راہی کا دامن تھام کے کہتے ہیں
''او جانے والے !
چلتے چلتے' جب تم اک دن پھاند کے' یہ گم سم ویرانہ
دور' کسی وادی کے کنارے' کھول کے اپنے دل کا خزانہ
ڈرتے ڈرتے' چھیڑو کوئی دھیما دھیما مست ترانہ
ہم نے ہی یہ بس میں گھول کے رس بخشا تھا' بھول نہ جانا''

تم سے تو یہ ڈسنے والے کانٹے اچھے' ہنستے پھولو !
ظالم پھولو ! کتنے پیاسے خوابوں کے بیتاب ہیولے
کتنی زندگیوں کے بگولے' تمھاری خوشبوؤں کے جھولے
میں دو گھومتے لمحوں کے لب چوم کے اپنا رستہ بھولے
تم سے تو یہ کانٹے اچھے ——

(۱۹۵۱-۹)

غزل

ترے فرقِ ناز پہ تاج ہے، مرے دوشِ غم پہ گلیم ہے
تری داستاں بھی عظیم ہے، مری داستاں بھی عظیم ہے

مری کتنی سوچتی صبحوں کو یہ خیال زہر پلا گیا
کسی تپتے لمحے کی آہ ہے کہ خرامِ موجِ نسیم ہے

تہ خاک، کرمکِ دانہ جُو بھی شریکِ رقصِ حیات ہے
نہ بس ایک جلوۂ طُور ہے، نہ بس ایک شوقِ کلیم ہے

یہ ہر ایک سمت مسافتوں میں گندھی پڑی ہیں جو ساعتیں
تری زندگی، مری زندگی، انہی موسموں کی شمیم ہے

کہیں محملوں کا غبار اڑے، کہیں منزلوں کے دیے جلیں
خَمِ آسماں، رہِ کارواں! نہ مقام ہے، نہ مقیم ہے

حرم اور دیر فسانہ ہے، یہی جلتی سانس زمانہ ہے،
یہی گوشۂ دلِ ناصبور ہی کنجِ باغِ نعیم ہے

(۱۱-۱۹۵۱)

ارے یقین حیات

یہ دورِ رفتہ تبسم، جو میرے ہونٹوں پر
ترے اشارۂ ابرو سے لوٹ آیا ہے
یہ زیست کی سوغات !

سیاہیوں میں گھرے طاق و گنبد و ایواں
کی اوٹ سے یہ اُبھرتی ہوئی شعاعوں کے
لپکتے بڑھتے ہات !

جو تیرے باغ کے گجرے کلائیوں میں لیے
سسکتے لمحوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں
بڑے غور کے سات !

یہ ایک نقش کفِ پا، بہ سطحِ ریگِ رواں
ترے حریمِ فروزاں سے ایک اور چراغ
بہ سینۂ ظلمات !

خروش شام و سحر میں کشید ہوتی ہوئی
شرابِ غم کا یہ اِک جام جس میں اُتری ہے
تجلیوں کی برات !

یہ ایک جرعۂ زہراب جس میں غلطاں ہیں
تری نگاہ کا رس، تیرے عارضوں کے گلاب
ترے لبوں کی نبات !

اسی اسی ترے پیمانۂ نشاط کے دَور
یونہی یونہی ذرا کچھ اور — اے یقینِ حیات
ارے یقینِ حیات !

(۵-۱۹۵۲)

درسِ ایّام

سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر تھی
تخت و کلاہ و قصر کے سب سلسلے گئے
وہ دست و پا میں گڑتی سلاخوں کے رُوبرو
صدہا تبسموں سے لدے طاقچے گئے
آنکھوں کو چھیدتے ہوئے نیزوں کے سامنے
محرابِ زر سے اُٹھتے ہوئے قہقہے گئے
ہر سانس لیتی کھال کھچی ' لاش کے لئے
شہنائیوں سے جھڑتے ہوئے زمزمے گئے
دامن تھے جن کے خون کی چھینٹوں سے گلستاں
وہ اطلس و حریر کے پیکر گئے ' گئے
ہر کنجِ باغ ٹوٹے پیالوں کا ڈھیر تھی
سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر تھی

سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے
یہ ہات، جھریوں بھرے، مرجھائے ہات، جو
سینوں میں اٹکے تیروں سے رستے لہو کے جام
بھر بھر کے دے رہے ہیں تمھارے غرور کو
یہ ہات، گلبن غمِ ہستی کی ٹہنیاں
اے کاش! انھیں بہار کا جھونکا نصیب ہو
ممکن نہیں کہ ان کی گرفت تپاں سے تم
تا دیر اپنی ساعدِ نازک بچا سکو
تم نے فصیل قصر کے رخنوں میں بھر تو لیں
ہم بے کسوں کی ہڈیاں لیکن یہ جان لو
اے وارثانِ طرۂ طرفِ کلاہ کے!
سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے

(۱۹۵۲-۷)

سنہری زُلفوں کے مست سائے

نہ پھر وہ ٹھنڈی ہوائیں لوٹیں
نہ پھر وہ بادل پلٹ کے آئے
نہ پھر کبھی شام کے نم آلود شعلہ زاروں پہ لڑکھڑائے
سنہری زُلفوں کے مست سائے

سنہری زُلفیں، جو اُڑ کے لہرا کے اک شفق گوں محل کی چھت سے
گزر چلی تھیں گزرتے جھونکوں کی سلطنت سے
جھکیں مری سمت بھی گھٹاؤں کی تمکنت سے

کنارِ دل سے حد اُفق تک ، تمام بادل گھنیرے بادل ،
شراب کی مستیوں کے جھونکے ، گلاب کی پنکھڑیوں کے آنچل ،
خیال ، رم جھم ! نگاہ ، جل تھل

پھر ایک اُجڑے ہوئے تبسم کے ساتھ ہر سُو
تلاش میں ہے گلوں کی خوشبو
کبھی پسِ در ، کبھی سرِ کوُ
مگر وہ بادل ؟
مگر وہ گیسُو ؟

(۱۹-۱۱-۱۹۵۲)

منٹو

میں نے اس کو دیکھا ہے
اُجلی اُجلی سڑکوں پر اِک گرد بھری حیرانی میں
پھیلتی بھیڑ کے اوندھے اوندھے کٹوروں کی طغیانی میں

جب وہ خالی بوتل پھینک کے کہتا ہے:
''دُنیا! تیرا حسن، یہی بدصورتی ہے۔''
دُنیا اس کو گھورتی ہے
شورِ سلاسل بن کر گونجنے لگتا ہے
انگاروں بھری آنکھوں میں یہ تند سوال
کون ہے یہ جس نے اپنی بہکی بہکی سانسوں کا جال
بامِ زماں پر پھینکا ہے؟
کون ہے جو بل کھاتے ضمیروں کے پُر پیچ دھندلکوں میں
روحوں کے عفریت کدوں کے زہر اندوز محلکوں میں
لے آیا ہے' یوں بن پوچھے' اپنے آپ'
عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ؟
کون ہے یہ گستاخ؟
تاخ، تڑاخ!

(۱۹۵۲ء)

غزل

کوئی بھی دَور سرِ محفل زمانہ رہا
تمھارا ذکر رہا یا مرا فسانہ رہا

مرے نشانِ قدم دشتِ غم پہ ثبت رہے
اَبد کی لوح پہ تقدیر کا لکھا نہ رہا

وہ کوئی کنجِ سمن پوش تھا کہ تودۂ خس
اِک آشیانہ بہر حال آشیانہ رہا

تم اِک جزیرۂ دل میں سمٹ کے بیٹھ رہے
مری نگاہ میں طوفانِ صد زمانہ رہا

طلوعِ صبح کہاں، ہم طلوع ہوتے گئے
ہمارا قافلہ بے درا روانہ رہا

یہ پیچ پیچ بھنور، اس کی اِک گرہ تو کھُلی
کوئی تڑپتا سفینہ رہا رہا نہ رہا

نہ شاخِ گل پہ نشیمن نہ رازِ گل کی خبر،
وہ کیا رہا جو جہاں میں قلندرانہ رہا

(۱۹۵۲ء؟)

غزل

اس اپنی کرن کو آتی ہوئی صبحوں کے حوالے کرنا ہے
کانٹوں سے اُلجھ کر جینا ہے پھولوں سے لپٹ کر مرنا ہے

شاید وہ زمانہ لوٹ آئے، شاید وہ پلٹ کر دیکھ بھی لیں
ان اُجڑی اُجڑی نظروں میں پھر کوئی فسانہ بھرنا ہے

یہ سوزِ دروں، یہ اشکِ رواں، یہ کاوشِ ہستی کیا کہیے
مرتے ہیں کہ کچھ دن جی لیں ہم، جیتے ہیں کہ آخر مرنا ہے

اک شہرِ وفا کے بند دریچے آنکھیں میچے سوچتے ہیں
کب قافلہ ہائے خندہ گل کو ان راہوں سے گزرنا ہے

اس نیلی دھند میں کتنے بجھتے زمانے راکھ بکھیر گئے
اِک پل کی پلک پر دنیا ہے، کیا جینا ہے کیا مرنا ہے

رستوں پہ اندھیرے پھیل گئے، اک منزلِ غم تک شام ہوئی
اے ہمسفرو! کیا فیصلہ ہے اب چلنا ہے کہ ٹھہرنا ہے؟

ہر حال میں اِک شوریدگیِ افسونِ تمنا باقی ہے
خوابوں کے بھنور میں بہ کر بھی خوابوں کے گھاٹ اُترنا ہے

(۱۹۵۲ء)

افتاد

کوئی دوزخ کوئی ٹھکانہ تو ہو
کوئی غم حاصل زمانہ تو ہو
لالہ و گل کی رُت نہیں نہ سہی
کچھ نہ ہو، شاخِ آشیانہ تو ہو
کبھی لچکے بھی آسمان کی ڈھال
یہ حقیقت کبھی فسانہ تو ہو
ان اندھیروں میں روشنی کے لئے
طاقِ چوبیں پہ شمع خانہ تو ہو
کسی بدلی کی ڈولتی چھایا
کوئی رختِ مسافرانہ تو ہو
گونجتے گھومتے جہانوں میں
کوئی آوازِ محرمانہ تو ہو
اس گلی سے پلٹ کے کون آئے
ہاں مگر اس گلی میں جانا تو ہو
میں سمجھتا ہوں اس سہاروں کو
پھر بھی جینے کا اِک بہانہ تو ہو

(۹-۵-۱۹۵۳)

زندگی، اے زندگی

خرقہ پوش و پا بہ گل

میں کھڑا ہوں، تیرے در پر، زندگی

ملتجی و مضمحل

خرقہ پوش و پا بہ گل

اے جہانِ خار و خس کی روشنی

زندگی، اے زندگی

میں ترے در پر چمکتی چلمنوں کی اوٹ سے

سن رہا ہوں قہقہوں کے دھیمے دھیمے زمزمے

کھنکھناتی پیالیوں کے شور میں ڈوبے ہوئے

گرم، گہری، گفتگو کے سلسلے

منقلِ آتش بجاں کے متصل؛

اور ادھر باہر گلی میں، خرقہ پوش و پا بہ گل

میں کہ اِک لمحے کا دل

جس کی ہر دھڑکن میں گونجے دو جہاں کی تیرگی

زندگی، اے زندگی

کتنے سائے محوِ رقص

تیرے در کے پردۂ گل فام پر

کتنے سائے، کتنے عکس

کتنے پیکر محوِ رقص

اور اِک تو کہنیاں ٹیکے خمِ ایام پر

ہونٹ رکھ کر جام پر

سن رہی ہے ناچتی صدیوں کا آہنگِ قدم

جاوداں خوشیوں کی بجتی گھنگھرو کے زیر و بم

آنچلوں کی جھم جھماہٹ، پائلوں کی چھم چھم

اس طرف، باہر، سر کوئے عدم

ایک طوفاں، ایک سیلِ بے اماں

ڈوبنے کو ہیں مرے شام و سحر کی کشتیاں

اے نگارِ دل ستاں

اپنی نٹ کھٹ انکھڑیوں سے میری جانب جھانک بھی

زندگی، اے زندگی!

(۲۲-۵-۱۹۵۳)

غزل

ایک ایک جھروکا خندہ بہ لب ایک ایک گلی کہرام
ہم لب سے لگا کر جام، ہوئے بدنام، بڑے بدنام
رُت بدلی کہ صدیاں لوٹ آئیں، اف یاد کسی کی یاد
پھر سیلِ زماں میں تیر گیا اک نام، کسی کا نام
دل ہے کہ اِک اجنبیِ حیراں، تم ہو کہ پرایا دیس
نظروں کی کہانی بن نہ سکیں ہونٹوں پہ رُکے پیغام
روندیں تو یہ کلیاں نیشِ بلا، چومیں تو یہ شعلے پھول
یہ غم یہ کسی کی دین بھی ہے، انعام عجب انعام
اے تیرگیوں کی گھومتی رَو، کوئی تو رسیلی صبح
اے روشنیوں کی ڈولتی لَو، اک شام، نشیلی شام
رہ رہ کے جیالے راہیوں کو دیتا ہے یہ کون آواز
کونین کی ہنستی منڈیروں پر، تم ہو کہ غمِ ایّام
بے برگ شجر، گردوں کی طرف پھیلائیں ہمکتے ہات
پھولوں سے بھری ڈھلوان پہ سُوکھے پات کریں بسرام
ہم فکر میں ہیں اس عالم کا دستور ہے کیا دستور!
یہ کس کو خبر اس فکر کا ہے دستورِ دو عالم نام

(۲۳-۵-۱۹۵۳)

غزل

مہکتے ، میٹھے ، مستانے زمانے
کب آئیں گے وہ من مانے زمانے
جو میرے کنج دل میں گونجتے ہیں
نہیں دیکھے وہ دُنیا نے زمانے
تری پلکوں کی جنبش سے جو ٹپکا
اسی اک پل کے افسانے زمانے
تری سانسوں کی سوغاتیں، بہاریں
تری نظروں کے نذرانے، زمانے
کبھی تو میری دُنیا سے بھی گزرو
لیے آنکھوں میں اَن جانے زمانے
انہی کی زندگی جو چل پڑے ہیں
تری موجوں سے ٹکرانے، زمانے !
میں فکر رازِ ہستی کا پرستار
مری تسبیح کے دانے زمانے

(۲۹-۶-۱۹۵۳)

ساجن دیس کو جانا

او طنبور بجاتے راہی، گاتے راہی
جاتے راہی
ساجن دیس کو جانا
منڈلی منڈلی چوکھٹ چوکھٹ
جھاجھن، جھاجھن، ڈِگ تٹ، ڈِگ تٹ
من کی تان اُڑانا
لیکن میرے دُکھوں کے ساجھی، میرے درد نہ گانا

او طنبور بجاتے راہی، گاتے راہی
جاتے راہی
ساجن دیس کو جانا
سوچ بھر مکھ، زہر پیے من
ان کی آس بندھانا
جھنن جھنن جھن، چھنن چھنن چھن
گیت ملن کے گانا
گلی گلی میں ساون رُت کی مست پون بن جانا

او طنبور بجاتے راہی، گاتے راہی
جاتے راہی
ساجن دیس کو جانا
پلک پلک پہ مچل سکتا ہے
آنسو بن کے زمانہ
اک دھڑکن میں ڈھل سکتا ہے
جیون کا افسانہ
ان آنکھوں کو ان ہونٹوں کو سمجھانا، سمجھانا

(۲۰-۱۰-۱۹۵۴)

غزل

دل نے ایک ایک دُکھ سہا، تنہا
انجمن انجمن رہا، تنہا

ڈھلتے سایوں میں تیرے کوچے سے
کوئی گزرا ہے بارہا، تنہا

تیری آہٹ قدم قدم — اور میں
اس معیت میں بھی رہا، تنہا

کہنہ یادوں کے برف زاروں سے
ایک آنسو بہا، بہا تنہا

ڈوبتے ساحلوں کے موڑ پہ دل
اک کھنڈر سا رہا سہا، تنہا

گونجتا رہ گیا خلاؤں میں
وقت کا ایک قہقہہ، تنہا

(۱۵-۱۱-۱۹۵۴)

غزل

کیا سوچتے ہو اب پھولوں کی رُت بیت گئی، رُت بیت گئی
وہ رات گئی، وہ بات گئی، وہ ریت گئی، رُت بیت گئی

اِک لہر اٹھی اور ڈوب گئے ہونٹوں کے کنول، آنکھوں کے دیے
اِک گونجتی آندھی وقت کی بازی جیت گئی، رت بیت گئی

تم آ گئے میری باہوں میں، کونین کی پینگیں جھول گئیں
تم بھول گئے، جینے کی جگت سے ریت گئی، رُت بیت گئی

پھر تیر کے میرے اشکوں میں، گل پوش زمانے لوٹ چلے
پھر چھیڑ کے دل میں ٹیسوں کے سنگیت گئی، رُت بیت گئی

اک دھیان کے پاؤں ڈول گئے، اک سوچ نے بڑھ کر تھام لیا
اِک آس ہنسی، اِک یاد سنا کر گیت گئی، رُت بیت گئی

یہ لالہ و گل؟ کیا پوچھتے ہو، سب لطفِ نظر کا قصہ ہے
رُت بیت گئی، جب دل سے کسی کی پیت گئی، رت بیت گئی

(۱۶-۱۲-۱۹۵۴)

بہ فرشِ خاک

آنکھیں میچوں، دھیان کروں تو صورت تیری مورت تیری
من کے ہنستے بستے دیس کے رستے رستے پر مسکائے
تیری باہیں، گلگوں راہیں، میری جانب بڑھتی آئیں
تیری اکھیاں، جیون سکھیاں، دل کے تٹ پر راس رچائیں
چاروں کھونٹ، گلابی ہونٹ، نگہ کو رس کے گھونٹ پلائیں
لیکن جب میں ہات بڑھاؤں تیرا دامن ہات نہ آئے

اکثر اکثر، سوچتے سوچتے، یوں محسوس ہوا ہے مجھ کو
جیسے اک طوفان میں گِھر کر، گر کر، پھول کی پتی اُبھرے
لہر لہر کے ڈولتے شہر میں دُھندلے دُھندلے دیے لہرائیں
سکھ کی سامگری سے نگری نگری کے آنگن بھر جائیں
گجرے لہکیں، سیجیں مہکیں، گھلتی سانس کے جھونکے آئیں
لیکن جب میں تجھ کو پکاروں دُور اک گونج کی میت گزرے

دل کے بے آواز جزیرے میں چھپ چھپ کے، چپکے چپکے
آنے والو! کیوں چھپتے ہو، گھونگھٹ کھولو، ہنس ہنس بولو
اب تک ہم نے سنوارے نکھارے، منزل منزل، رستے رستے
خوابوں کے مسحور خرابوں میں ارمانوں کے گلدستے
اس مٹی کے گھروندے میں بھی اک دن بیٹھ کے ہنستے ہنستے
اپنے ہات سے میری چائے کی پیالی میں چینی گھولو!

(۱۲-۱۹۵۴)

کون دیس گیو......

کون دیس گیو......

نیناں'

کون دیس گیو......

رُت آئے' رُت جائے' مہاری عمر کٹے رو رو
کجرارے' متوارے نیناں' کون دیس گیو

دیکھتے دیکھتے اس نگری میں چاروں اور اِک نور بہا
ایک گزرتی رتھ سے چھلکا اُٹھ کے جوبن' اہا' اہا
راہ راہ پہ پلک پلک نے سیس نوا کے کہا:
''باوری لہرو
رس کے شہرو
نینو' ٹھہرو' ٹھہرو
چھین نہ لو ان ہنستے جگوں سے سُکھ کا سانس اک رہا سہا''

دھول اُڑی اور پھول گرے
لمحے، خوشبوئیں، جھونکے
اُبھرے، پھیلے، گئے گئے
ایدھر دیکھیں، اودھر دیکھیں، دل کے سنگ نہ کو
کون دیس گیو
کجرارے، متوارے نیناں، کون دیس گیو

اب ان تپتے ویرانوں میں
کانٹے چُن چُن پور دُکھیں
جانے تم کس پھول بھوم میں جھوم جھوم ہنسو
کون دیسو گیو
کجرارے او، متوارے او، نیناں
کون دیس گیو

(۱۹۵۳ء)

ہری بھری فصلو!

ہری بھری فصلو
جُگ جُگ جیو، پھلو
ہم تو ہیں بس دو گھڑیوں کو اس جگ میں مہمان
تم سے ہے اس دیس کی شوبھا، اس دھرتی کا مان
دیس بھی ایسا دیس کہ جس کے سینے کے ارمان
آنے والی مست رُتوں کے ہونٹوں پر مُسکان
جھکتے ڈنٹھل، پکتے بالے، دھوپ رچے کھلیان
ایک ایک گھروندا خوشیوں سے بھرپور جہان
شہر شہر اور بستی بستی جیون سنگ بسو!
دامن دامن، پلو پلو، جھولی جھولی ہنسو
چندن روپ سجو!
ہری بھری فصلو
جُگ جُگ جیو، پھلو

قرنوں کے بجھتے انگار، اِک موجِ ہوا کا دَم
صدیوں کے ماتھے کا پسینہ، پتّیوں پر شبنم
دَورِ زماں کے لاکھوں موڑ، اک شاخِ حسیں کا خم
زندگیوں کے تپتے جزیرے پر رکھ رکھ کے قدم
ہم تک پہنچی عظمتِ فطرت، طنطنۂ آدم
جھومتے کھیتو، ہستی کی تقدیرو، رقص کرو
دامن دامن، پلو پلو، جھولی جھولی ہنسو!
چندن رُوپ سجو!
ہری بھری فصلو!
جُگ جُگ جیو پھلو!

(۱۹۵۳ء)

ایسے بھی دن

پھلواڑی میں پھول کھلے، مرجھائے
کون اب اُن کی مٹی راکھ سے اپنی مانگ سجائے
آتے زمانے نئے پھول اور نئی بہاریں لائے

آتے جاتے زمانوں کی اس گونگی بھیڑ میں بہنے
آئے لاکھوں لمحے، گدلے گدلے فرغل پہنے،
ایک قدم اور اس انبوہ میں کھو گئے ان کے کج مج سائے

پھول نہ گجرے، پلکیں اور نہ کجرے
بیتے سموں کے اُجڑے پنگھٹ، ٹھیکریاں اور بجرے
کون اب ان کی اُڑتی دھول سے من کی پیاس بجھائے

ایسی ہی کتنی صبحیں، کتنی شامیں، پیلی پیلی
جن کے نہ میٹھے ہونٹ رسیلے، جن کی نہ کڑوی دھار کٹیلی
موجیں اُبھریں، موجیں ڈوبیں، رُت آئے، رُت جائے
جن کی پلک پر، جن کے اُفق پر آنسو ہے نہ ستارہ
چپ چپ، گم سُم، تھکے تھکے، آوارہ
آہ وہ دن جو بیت گئے اور یاد نہ آئے

(۲۳-۱-۱۹۵۵)

بس سٹینڈ پر

''خدایا اب کے یہ کیسی بہار آئی''!

''خدا سے کیا گلہ، بھائی!
خدا تو خیر کس نے اس کا عکسِ نقش پا دیکھا
نہ دیکھا تو بھی دیکھا اور دیکھا بھی تو کیا دیکھا
مگر توبہ، مری توبہ، یہ انساں بھی تو آخر اِک تماشا ہے
یہ جس نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا بڑے جتنوں سے سیکھا ہے
ابھی کل تک، جب اس کے ابرؤوں تک مُوئے پیچاں تھے
ابھی کل تک، جب اس کے ہونٹ محرومِ زنخداں تھے
ردائے صدزماں اوڑھے، لرزتا، کانپتا، بیٹھا
ضمیر سنگ سے بس ایک چنگاری کا طلب تھا!''

''مگر اب تو یہ اُونچی ممٹیوں والے جلو خانوں میں بستا ہے
ہمارے ہی لبوں سے مُسکراہٹ چھین کر اب ہم پہ ہنستا ہے
خُدا اس کا' خدائی اس کی' ہر شے اس کی' ہم کیا ہیں!
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرّہ ہیں''

''ہماری ہی طرح جو پائمال سطوتِ میری و شاہی ہیں
لکھوکھا' آبدیدہ' پا پیادہ' دل زدہ' وامانده راہی ہیں
جنھیں نظروں سے گم ہوتے ہوئے رستوں کی غم پیما لکیروں میں
دکھائی دے رہی ہیں آنے والی منزلوں کی دھندلی تصویریں''

''ضرور اِک روز بدلے گا نظامِ قسمتِ آدم
بسے گی اک نئی دُنیا' سجے گا اِک نیا عالم
شبستاں میں نئی شمعیں' گلستاں میں نیا موسم''

''وہ رُت اے ہم نفس جانے کب آئے گی؟
وہ فصل دیر رس جانے کب آئے گی؟
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی''؟

(۲۴-۷-۱۹۵۵)

آٹوگراف

کھلاڑیوں کے خودنوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لئے ہُوئے
کھڑی ہیں منتظر — حسین لڑکیاں!
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر، حسین لڑکیاں!

مہیب پھاٹکوں کے ڈولتے کواڑ چیخ اُٹھے
اُبل پڑے اُلجھتے بازوؤں، چٹختی پسلیوں کے پر ہراس قافلے
گرے، بڑھے، مُڑے بھنور ہجوم کے

کھڑی ہیں یہ بھی، راستے پہ، اک طرف
بیاضِ آرزو بہ کف
نظر نظر میں نارسا پرستشوں کی داستاں
لرز رہا ہے دم بہ دم
کمانِ ابرواں کا خم

کوئی جب ایک نازِ بے نیاز سے
کتابچوں پہ کھینچتا چلا گیا
حروفِ کج تراش کی لکیر سی
تو تھم گئیں لبوں پہ مسکراہٹیں شریر سی

کسی عظیم شخصیت کی تمکنت
حنائی انگلیوں میں کانپتے ورق پہ جھک گئی
تو زرنگار پلوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبض رک گئی

وہ باؤلر ایک، مہوشوں کے جمگھٹوں میں گھر گیا
وہ صفحۂ بیاض پر بصد غرور کلکِ گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں وکٹ گری

میں اجنبی، میں بے نشاں
میں پا بہ گِل
نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل! یہ لوحِ دم!
نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے!

(۱۹۵۵ء)

غزل

روش روش پہ ہیں نکہت فشاں گلاب کے پھول
حسین گلاب کے پھول، ارغواں گلاب کے پھول

اُفق اُفق پہ زمانوں کی دُھند سے اُبھرے
طیور، نغمے، ندی، تتلیاں، گلاب کے پھول

کس انہماک سے بیٹھی کشید کرتی ہے
عروسِ گل بہ قبائے جہاں، گلاب کے پھول

جہاں گریۂ شبنم سے، کس غرور کے سات
گزر رہے ہیں، تبسم کناں، گلاب کے پھول

یہ میرا دامنِ صد چاک، یہ ردائے بہار
یہاں شراب کے چھینٹے، وہاں گلاب کے پھول

کسی کا پھول سا چہرہ اور اس پہ رنگ افروز
گندھے ہوئے بہ خمِ گیسواں، گلاب کے پھول

خیالِ یار، ترے سلسلے نشوں کی رُتیں
جمالِ یار، تری جھلکیاں گلاب کے پھول

مری نگاہ میں دورِ زماں کی ہر کروٹ
لہو کی لہر، دلوں کا دھواں، گلاب کے پھول

سُلگتے جاتے ہیں چُپ چاپ، ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں، گلاب کے پھول

یہ کیا طلسم ہے! یہ کس کی یاسمیں باہیں
چھڑک گئی ہیں جہاں در جہاں گلاب کے پھول

کٹی ہے عُمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

(۱۰-۵-۱۹۵۶)

مقبرہ جہانگیر

زنگ آلود کمر بند' صدف دوز عبا'
یہ محافظ' تہ محراب عصا تھامے ہوئے
کھانستی صدیوں کا تھوکا ہُوا اِک قصہ ہیں
اِسی گرتی ہوئی دیوار کا اِک حِصہ ہیں !

کھردرے' میلے' پھٹے کپڑوں میں بوڑھے مالی
یہ چمن بند' جو گزرے ہُوئے سلطانوں کی
ہڈیاں سینچ کے پھلواڑیاں مہکاتے ہیں
گھاس کٹتی ہے کہ دن ان کے کٹے جاتے ہیں

اور انھیں دیکھو — یہ جاروب کشانِ بے عقل
صبح ہوتے ہی جو چُن چُن کے اُٹھا پھینکتے ہیں
گُٹھلیاں — عشرتِ دزدیدہ کی تلچھٹ سے بھری
کہنہ زینوں میں پڑی' تیرہ دریچوں میں پڑی !

لاکھ ادوار کی لاشوں پہ بچھا کر قالین
چند لوگ اپنی ترنگوں میں مگن بیٹھے ہیں
عکس پڑتا ہے جو نظروں پہ حسیں زُلفوں کا
ڈوب جاتا ہے پیالوں میں دُھواں سُلفوں کا

سنگِ احمر کی سِلوں پر یہ سطورِ پُر نور
جن کی ہر جدولِ گل پیچ کے اُلجھاؤ میں
کتنے صناعوں کی صد عمر عزیز آویزاں
اس جگہ آج سحر خیز مریض آویزاں

موج صد نقش میں لپٹے ہوئے میناروں کے
دُودھیا بُرج ' درختوں کے گھنے جُھنڈ میں گُم
جن کے چھجوں سے نظر آتے ہیں مدفونِ غبار
رینگتی روحوں سے آباد گناہوں کے دیار !

گنبد دل میں لیے رقص مہ وسال کی گونج
یہ جھروکا کہ جو راوی کی طرف کھلتا ہے
اپنی تنہائی ویراں سے اماں مانگتا ہے
ہر گزرتی ہوئی گاڑی سے دُھواں مانگتا ہے !

تین سو سال سے مبہوت کھڑے ہیں جو یہ سرو
اِن کی شاخیں ہیں کہ آفاق کے شیرازے ہیں
صفِ ایام کی بکھری ہوئی ترتیبیں ہیں
اِن کے سائے ہیں کہ ڈھلتی ہوئی تہذیبیں ہیں

مرمریں قبر کے باہر چمن و قصر واُطاق،
کوئلیں، امریاں، جھونکے، روشیں، فوارے
اور — کچھ لوگ کہ جو محرم آداب نہیں !

مرمریں قبر کے اندر، تہِ ظلمات کہیں
کرمک و مور کے جبڑوں میں سلاطیں کے بدن

کوئی دیکھے، کوئی سمجھے تو اس ایواں میں جہاں
نور ہے، حسن ہے، تزئین ہے، زیبائش ہے
ہے تو بس ایک دکھی رُوح کی گنجائش ہے

تم نے دیکھا کہ نہیں آج بھی اِن محلوں میں
قہقہے جشن مناتے ہوئے نادانوں کے
جب کسی ٹوٹتی محراب سے ٹکراتے ہیں
مرقدِ شاہ کے مینار لرز جاتے ہیں !

(۱۹۵۶ء)

ریوڑ

شام کی راکھ میں لتھڑی ہوئی ڈھلوانوں پر
ایک ریوڑ کے تھکے قدموں کا مدھم آہنگ
جس کی ہر لہر دھندلکوں میں لڑھک جاتی
ہے

مست چرواہا، چراگاہ کی اِک چوٹی سے
جب اُترتا ہے تو زیتون کی لانبی سونٹی
کسی جلتی ہوئی بدلی میں اٹک جاتی
ہے

بکریاں، دشت کی مہکار میں گوندھا ہوا دودھ
چھاگلوں میں لیے جب رقص کناں آتی ہیں
کوئی چوڑی خم دوراں پہ چھنک جاتی
ہے

جست بھرتی ہے کبھی اور کبھی چلتے چلتے
ناچتی ڈار ممکتے ہوئے بزغالوں کی،
ہر جھکی شاخ کی چوکھٹ پہ ٹھٹک جاتی
ہے

سان پر لاکھ چھری، تیغ پہ صد پارہ گوشت
پھر بھی مدہوش غزالوں کی یہ ٹولی ہے کہ جو
بار بار اپنے خط رہ سے بھٹک جاتی ہے

شام کی راکھ میں لتھڑی ہوئی ڈھلوانوں پر
کھیلتی ہے غم ہستی کی وہ شاداں سی اُمنگ
جس کی رو وقت کی پہنائیوں تک جاتی ہے

(٣-۵-١٩۵٧)

غزل

دل سے ہر گزری بات گزری ہے
کس قیامت کی رات گزری ہے
چاندنی — نیم وا دریچہ — سکوت
آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے
ہائے وہ لوگ، خوبصورت لوگ
جن کی دُھن میں حیات گزری ہے
کسی بھٹکے ہوئے خیال کی موج
کتنی یادوں کے سات گزری ہے
تمتماتا ہے چہرۂ ایام
دل پہ کیا واردات گزری ہے
پھر کوئی آس لڑکھڑائی ہے
کہ نسیمِ حیات گزری ہے
بجھتے جاتے ہیں دکھتی پلکوں پہ دیپ
نیند آئی ہے، رات گزری ہے

(۱۹۵۷ء)

پیش رَو

پت جھڑ کی اُداس سلطنت میں
اِک شاخِ برہنہ تن پہ تنہا
بے برگ مسافتوں میں حیراں
کچھ زود شگفت شوخ کلیاں
جو ایک سرورِ سرکشی میں
اعلانِ بہار سے بھی پہلے
انجام خزاں پہ ہنس پڑی ہیں
تقدیرِ چمن بنی کھڑی ہیں !

اس یخ کدۂ یقیں غم میں
دیکھو یہ شگفتہ دل شگوفے
ماحول نہ کائنات ان کی
اِک نازِ نمو حیات ان کی

عمران کی بس ایک پل ہے لیکن
آئیں گے انہی کی راکھ سے، کل
ماتھے پہ حسیں تلک لگائے
پھولوں بھری صبح نو کے سائے !

(۱۹۵۷ء)

رفتگاں

رات تھی اور نیم تاباں مشعلوں کی روشنی
رات تھی اور پیاسی آنکھوں، ہنستے چہروں کے ہجوم
سامنے میزوں پہ رنگارنگ جام
پی رہے تھے ہونٹ ارمانوں کی آگ!

جب بھی تارِ ارغنوں سے آ کے ٹکراتی کسی وحشی تمنا کی پکار
جھن جھنا اُٹھتیں دلوں کی بستیاں
اپنی پلکوں کو جھکا لیتیں چراغوں کی لویں
ناچتے جسموں کے جنگل میں بھڑکنے لگتی ارمانوں کی آگ

آہ وہ محدود آہنگوں میں لپٹے زمزمے
جیسے طوفاں میں گھری کشتی سے کوئی ساحلِ گم گشتہ کو آواز دے!
آہ وہ مجروح سینوں سے اُبلتے قہقہے
جیسے انگاروں بھرے جھکڑ میں کوئی بے اماں راہی پکارے
منزلِ روپوش کو!

ہائے وہ مدہوش لوگ
مست پنچھی، جن کے جلتے پنکھ ان کی آتشِ دل کو ہوا دیتے گئے
کس گھپا میں کھو گئے؟
کیا انھیں سکھ کی کہیں بھی وہ کرن حاصل ہوئی
وہ کرن، جو رات بھر ان نیم تاباں مشعلوں کے روپ میں ہنستی رہی
وہ کرن، جو ان کی دنیا میں چمک کر ان کے دل میں بجھ گئی!

(۱۹۵۷ء)

غزل

کب تک گزری باتیں یاد کریں، پچھتائیں
آؤ، آج ان مست ہواؤں میں بہہ جائیں

ٹوٹے پیمانوں کی ٹھیکریوں کے سفینے
بیتے سمے — یادوں کی رو میں بہتے جائیں

کس کو بتائیں اب جو یہ اُلجھن آن پڑی ہے
جب تک تم کو بھول نہ پائیں، یاد نہ آئیں

اکثر اکثر دوری سمٹی، رستے پھیلے
منزل! تیرا قربِ گریزاں، کیا بتلائیں

ان سنگین حصاروں میں دل کا یہ جھروکا
گونجیں جس میں ٹھٹکتے قدموں کی پرچھائیں

(۱۹۵۷ء)

برہنہ

فرنگی جریدوں کے اوراق رنگیں
پہ ہنستی، لچکتی، دھڑکتی لکیریں
کٹیلے بدن، تیغ کی دھار جیسے!
لہو رس میں گوندھے ہوئے جسم، ریشم کے انبار جیسے!

نگہ جن پہ پھسلے، وہ شانے وہ باہیں
مدور اُٹھانیں، منور ڈھلانیں
ہر اک نقش میں زیست کی تازگی ہے
ہر اک رنگ سے کھولتی آرزوؤں کی آنچ آ رہی ہے!

خطوطِ برہنہ کے ان آئنوں میں
حسیں پیکروں کے یہ شفاف خاکے
کہ جن کے سجل روپ میں کھیلتی ہیں
وہ خوشیاں، جو صدیوں سے بوجھل کے اوجھل رہی ہیں!

انھیں پھونک دے گی یہ بے مہر دنیا
فرنگی جریدوں کے اوراقِ رنگیں
کو اک بار حسرت سے تک لو
پھر ان کو حفاظت سے اپنے دلوں کے مقفل درازوں میں رکھ لو!

(۱۹۵۸ء)

جاروب کش

آسمانوں کے تلے، سبز و خنک گوشوں میں
کوئی ہوگا جسے اِک ساعتِ راحت مل جائے
یہ گھڑی تیرے مقدر میں نہیں ہے، نہ سہی

آسمانوں کے تلے، تلخ و سیہ راہوں پر
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں کہ اگر تو چن لے
کوئی اِک غم تری قسمت کو بدل سکتا ہے

آسمانوں کے تلے، تلخ و سیہ راہوں پر
تو اگر دیکھے تو خوشیوں کی گریزاں سرحد
سوزِ یک غم سے شکیب غم دیگر تک ہے

زندگی قہر سہی، زہر سہی، کچھ بھی سہی
آسمانوں کے تلے، تلخ و سیہ لمحوں میں
جرعۂ سم کے لئے عفتِ لب لازم ہے
اور تو ہے کہ ترے جسم کا سایہ بھی نجس

تو اگر چاہے تو ان تلخ و سیہ راہوں پر
جابجا، اتنی تڑپتی ہوئی دنیاؤں میں
اتنے غم بکھرے پڑے ہیں کہ جنھیں تیری حیات
قوتِ یک شب کے تقدس میں سمو سکتی ہے

کاش، تو حیلۂ جاروب کے پَر نوچ سکے!
کاش، تو سوچ سکے......سوچ سکے!

(۱۹۵۸)

حرفِ اوّل

کتنی چھنا چھن ناچتی صدیاں
کتنے گھنا گھن گھومتے عالم
کتنے مراحل —
جن کا مآل — اک سانس کی مہلت

سانس کی مہلت — عمر گریزاں —
جس کی لرزتی روشنیوں میں
جھلمل جھلمل
جھلکے اِک مسحور مسافت!

حدِ نظر تک وسعتِ دوراں
جس کی خونیں سطح پہ تڑپے
طوق و سلاسل
میں جکڑی — انسان کی قسمت

یہ اشکوں، آہوں کی دنیا
اس منڈلی میں پیہم دھڑکے
سازِ غمِ دل
پیہم باجے، درد کی نوبت

یہ جلتے لمحوں کا الاؤ
اس جیون میں، غم، دمِ خنجر
دُکھ — ہم قاتل
میں نے پیا ہر زہر سے امرت!
کیسے کیسے عجب زمانے
پگ پگ شعلے — تٹ تٹ طوفاں
اور مرا دل:
بجھتے جگوں کی راکھ میں لت پت!

بسری یادوں کی بستی کے
بند کواڑوں سے ٹکراتا
میں اِک سائل
میرا رزق، سسکتی چاہت!

شہرِ جنوں کے رنگ نیارے
گلیاں، موڑ، منڈیریں، دوارے
منزل منزل
ارمانوں کی بچھڑتی سنگت!

دُور کہیں، اس پار، وہ دُنیا
آرزوؤں کا دیس کہ جس کی
راہ میں حائل
آنکھ کی جھیلیں، دھوئیں کے پربت!

دردوں کے اس کوہِ گراں سے
میں نے تراشی، نظم کے ایواں
کی اِک اِک سِل،
اِک اِک سوچ کی حیراں مورت!

تجربہ ہائے زیست کے آرے
تلخیِ صد احساس کے تیشے
ان کے مقابل
حرفِ زبوں —— اک کانچ کی لعبت!

عمر اسی الجھن میں گزری
کیا شے ہے یہ حرف و بیاں کا
عقدۂ مشکل؟
صورتِ معنی؟ معنیِ صورت؟

اکثر گردِ سخن سے نہ اُبھرے
وادیِ فکر کی لیلاؤں کے
جُھومتے محمل!
طے نہ ہوا ویرانۂ حیرت!

گرچہ قلم کی نوک سے ٹپکے
کتنے ترانے، کتنے فسانے،
لاکھ مسائل
دل میں رہی سب دل کی حکایت!

بیس برس کی کاوشِ پیہم
سوچتے دن اور جاگتی راتیں
اُن کا حاصل:
ایک یہی اظہار کی حسرت!

(۱۶-۶-۱۹۵۸)

روزِ رفتہ

موجِ تبسم

ستاروں کو نہ آتا تھا ابھی تک مسکرا اٹھنا
دیے بن کر یوں ایوانِ فلک میں جگمگا اٹھنا
حسین غنچوں کے رنگیں لب تھے ناواقف تبسم سے
چمن گونجا نہ تھا اب تک عنادل کے ترنم سے
نہ پروانے تھے جلتے شمعِ سوزاں کے شراروں میں
نہ آئی تھی ابھی ہمت یہ ننھے جاں نثاروں میں
ابھی گہوارۂ ابر بہاری میں وہ سوتی تھی
نہ بجلی یوں شرر بار اور خرمن سوز ہوتی تھی
نہ اب تک ارتعاشِ نغمہ تھا بربط کے تاروں میں
نہ اب تک گونجنے پائے تھے نغمے نغمہ زاروں میں
نہ اب تک آبشاریں پتھروں سے سر پٹکتی تھیں
نہ اب تک رونے دھونے میں یوں راتیں اُنکی کٹتی تھیں
سمجھتا تھا نہ دل اب تک نشاط و رنج و کلفت کو
نہ چھیڑا تھا ابھی تک اس نے اپنے سازِ اُلفت کو

ابھی تیروں کو ترکش ہی میں ڈالے دیوتا کیوپڈ
کھڑا خالی کماں کو تھا سنبھالے دیوتا کیوپڈ
جہاں پر حکمراں تھی ایک ہیبت خیز خاموشی
مصیبت ریز، خوف آمیز، ہول انگیز خاموشی
یکایک بجلیاں ٹوٹیں فغانِ بزمِ ہستی میں
ہزاروں جاگ اُٹھے فتنے اس دُنیا کی بستی میں
خموش و پرسکوں عالم میں دوڑی روحِ بیتابی
ہوئی ہر ذرّہ رقصاں میں پیدا شانِ سیمابی
سمندر کی روانی ہوگئی تبدیل طوفاں میں
پڑا نورس گلوں کے قہقہوں کا غُل گلستاں میں
شبستانوں سے رندوں کی صدائے ہاوہو اُٹھی
دبستانوں سے بُلبل کی نوائے ہاوہو اُٹھی
پٹکنے لگ گئی سر جوئے کہساری چٹانوں سے
مچل کر بجلیاں ٹوٹیں زمیں پر آسمانوں سے
اُٹھایا شور افزا آبشاروں نے رباب اپنا
سنایا گا کے سبزے کو گزشتہ شب کا خواب اپنا
حیاتِ تازہ یوں دوڑی دلوں کی کائناتوں میں
کہ جیسے برق چمکے برشگالی کالی راتوں میں

یم ہستی میں کیف و نور کا سیلِ رواں آیا
ریاضِ دہر میں اک رنگ و بو کا کارواں آیا
جہاں بس رہ گیا بن کر طلسمِ کیف و سرمستی
نشوں کی ایک دُنیا اور کیفیات کی بستی
فلک اِک گنبدِ زریں زمیں اِک بقعۂ نوریں
یہ ساری کائناتِ شش جہت اِک جلوۂ رنگیں
یہ موج بحرِ امکاں جلوۂ موجِ تبسم ہے
چمک کر جو ترے لب پر فروغ افزائے عالم ہے
تبسم جس کی رنگینی ترے ہونٹوں پہ رقصاں ہے
تبسم آہ جس کا رقص مضرابِ رگِ جاں ہے

(۱۹۳۲ء)

اقبال

اقبال! کیوں نہ تجھ کو کہیں شاعرِ حیات
ہے تیرا قلب محرمِ اسرارِ کائنات

سرگرمیِ دوام ہے تیرے لئے حیات
میدانِ کارزار ہے تجھ کو یہ کائنات

مشرق تری نظر میں ہے اُمید کا افق
مغرب تری نگاہ میں ہے غرقِ سیّآت

یورپ کی ساری شوکتیں تیرے لئے سراب
ہنگامۂ تمدنِ افرنگ' بے ثبات

اسلامیوں کے فلسفے میں دیکھتا ہے تو
مظلوم کائنات کی واحد رہِ نجات

تیرا کلام جس کو کہ بانگِ درا کہیں
ہیں اُسکے نقطے نقطے میں قرآن کے نکات

بھولے ہوؤں کو تو نے دیا درسِ زندگی
زیبا ہے گر کہیں تجھے خضرِ رہِ حیات

سینے میں تیرے عشق کی بیتاب شورشیں
محفل میں تیری قدس کی رقصاں تجلیات

عُریاں تری نگاہ میں اسرارِ کن فکاں
مضمر ترے ضمیر میں تقدیرِ کائنات

دُنیا کا ایک شاعرِ اعظم کہیں تجھے
اسلام کی کچھار کا ضیغم کہیں تجھے

(۱۹۳۳ء)

ہوائی جہاز کو دیکھ کر

یہ تہذیب اور سائنس کی ترقی کا زمانہ ہے ۔ رہے گا یوں بھلا کب تک درندوں کی طرح انساں
یہ علم و دانش و حکمت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے ۔ ہوا میں لگ گیا اُڑنے پرندوں کی طرح انساں

وہ دیکھو ہیں فضا میں مائل پرواز طیارے ۔ گرجتے، گھومتے، گرتے، سنبھلتے اور چکراتے
فضائے آسماں کی سیر کرنے والے سیارے ۔ وہ دیکھو جا رہے ہیں گنگناتے، گونجتے، گاتے

اُدھر وہ خوش نصیب اور صاحب اقبال انساں ہیں ۔ جنھیں بخشی گئی ان برق پاروں کی عناں گیری
اُدھر وہ ذوقِ علم و فن سے مالا مال انساں ہیں ۔ جنھیں سونپی گئی دنیائے حکمت کی جہانگیری

اِدھر ہم لوگ ہیں کیفیت فکر و نظر جن کی ۔ جہاں میں قوت پرواز سے محروم رہتی ہے
اِدھر ہم لوگ ہیں دُنیا میں جنکی مضمحل ہستی ۔ حیاتِ جاوداں کے راز سے محروم رہتی ہے

اگر یہ آرزو انساں کے دل میں جلوہ گر ہو گی ۔ کہ چھن جائیں نہ عیش سرمدی کی زینتیں اُس سے
تو اس کی زندگی تابندہ تر پائندہ تر ہو گی ۔ فقط سعی مسلسل سے فقط ذوقِ تجسس سے

(۱-۱۲-۱۹۳۴)

آہ یہ خوش گوار نظارے!

سامنے کیا ہے اک پہاڑی ہے — خوب صورت، بلند اور شاداب
اس کی چیں بر جبیں چٹانوں پر — رقص کرتے ہیں سایہ ہائے سحاب
اس کی خاموش وادیاں، یعنی — ایک سویا ہوا جہانِ شباب
اس کی سقف بلند کے آگے — آسمان ایک سرنگوں محراب
شام کے وقت کوہ کا منظر — جیسے بھولا ہوا طلسمی خواب
جھومتے، ناچتے ہوئے چشمے — پھوٹتا، پھیلتا ہوا سیماب
دوب کی رینگتی ہوئی بیلیں — پتھروں سے پٹے ہوئے تالاب

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

چیل کے اُف یہ بے شمار درخت　　اور یہ ان کی عنبریں بو باس
سنبلیں کونپلوں سے چھنتے ہوئے　　یہ نسیم شمال کے انفاس
سایہ ہائے دراز کے نیچے　　سرنگوں جھاڑیوں کا خوف و ہراس
چیل کی چوٹیوں پہ صبح کے وقت　　سبز پتوں کا زرنگار لباس
یہ دُھواں جھونپڑوں سے اُٹھتا ہُوا　　کوہ کے اس طرف اُفق کے پاس
یہ برستی ہُوئی گھٹا کا سماں　　قلبِ شاعر پہ بارش احساس

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

مرغزاروں میں تا بحد نظر　　لطف افزا فضا مہکتی ہوئی
شب کو دہقاں کے تنگ جھونپڑے سے　　سُرخ سی روشنی جھلکتی ہوئی
ابر میں کوندتی ہوئی بجلی　　دامن آتشیں جھٹکتی ہوئی
کوہ کی سربلند چوٹی سے　　اِک نئی تازگی ٹپکتی ہوئی

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

وادیوں کا ہر ایک خار حقیر　　امتدادِ زمانہ کی تصویر
قدسیوں کی ادائے کج نگہی　　صبح کے آفتاب کی تنویر
جلوہ ہائے شفق کی عُریانی　　ایک رنگین خواب کی تعبیر
زمہریری ہوا کے جھونکوں سے　　ڈبڈبائی ہوئی سی چشم اثیر

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

چاہتا ہوں کہ اپنی ہستی کو　　سرمدی کیف میں ڈبو جاؤں
چاہتا ہوں کہ ان فضاؤں کی　　وسعتِ بیکراں میں کھو جاؤں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں　　جذب ہو جاؤں جذب ہو جاؤں

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

(۱۹۳۴ء)

محبوب خداؐ سے

نو بہارِ گلستانِ معرفت
یعنی اے روح و روانِ معرفت

تیرے دل میں جلوۂ ربِ جمیل
تیری محفل میں سرود جبرئیل

اہتمام و اہتزاز کائنات
تیری اِک ادنیٰ نگاہ التفات

قرب یاب درگہ یزداں ہے تو
ساقی خُم خانہ عرفاں ہے تو

جھک رہا ہے تیرے در پر آسماں
چومتا ہے تیرے قدموں کو جہاں

ترے دم سے دل کی کلیاں کھل گئیں
بدنصیبوں کو مرادیں مل گئیں

تیری چوکھٹ پر جھکی جس کی جبیں
ہو گیا اس کے جہاں زیرِ نگیں

میں سمجھتا ہوں کہ تیری خاکِ پا
کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا

مجھ پہ گر تو لُطف فرمائی کرے
بخت میرا نازِ دارائی کرے

میں بھی ہوں اِک بندہ عصیاں شعار
کشتہ جور و جفائے روزگار

میں بھی تیرا بستہ فتراک ہوں
کس قدر غمگین ہوں غمناک ہوں

میں زمانے بھر سے ٹھکرایا گیا
میں ہر اک محفل سے اُٹھوایا گیا

درگۂ عالم سے دھتکارا ہوا
بخت اور تقدیر کا مارا ہُوا

اب تیرے دربار میں آیا ہوں میں
دل میں لاکھوں حسرتیں لایا ہوں میں

تجھ کو میری بے کسی کا واسطہ
اپنی شانِ خسروی کا واسطہ

مر رہا ہوں زندگی کا جام دے
رحمت جاوید کا پیغام دے

اب زمانے میں مرا کوئی نہیں
آسرا تیرے سوا کوئی نہیں

اِک فقط درد آشنا تو ہی تو ہے
میرے دل کا مدعا تو ہی تو ہے

جب ترے دربار میں آتا ہوں میں
جب تری سرکار میں آتا ہوں

عظمت مفقود کو پاتا ہوں میں
منزل مقصود کو پاتا ہوں میں

تیرے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں میں
جھولیاں بھر بھر کے لے جاتا ہوں میں

زندگی کی زندگی تو ہی تو ہے
روح کی تابندگی تو ہی تو ہے

میرے دل کو مہبطِ انوار کر
مجھ کو بھی بینندۂ اسرار کر

(۱۹۳۴ء)

رازِ گراں بہا

نہ رہنما سے تعلق نہ راستہ معلوم
ترے جنونِ تجسس کا منتہا معلوم

نہ آرزوئے ترقی نہ جستجوئے کمال
تری حیات کا مقصد ہے کیا خدا معلوم

یہی ہے حال اگر پستی عزائم کا
مآلِ خواہش تکمیل ارتقا معلوم

نہاں ہے محنت پیہم میں راحت جاوید
نہیں ہے تجھ کو یہ رازِ گراں بہا معلوم

تو اجتماعِ مصائب سے ڈر رہا ہے کیوں
نہیں تحمل آفات کا صلا معلوم!

حریم قدس کی رنگینیوں کا مرکز ہے
وہ دل کہ جس کو نہیں خوفِ ما سوا معلوم

(۲۴-۱۲-۱۹۳۴)

گاؤں

یہ تنگ و تار جھونپڑیاں گھاس پھوس کی
اب تک جنھیں ہوا نہ تمدن کی چھو سکی

ان جھونپڑوں سے دور اور اس پار کھیت کے
یہ جھاڑیوں کے جھنڈ یہ انبار ریت کے

یہ سادگی کے رنگ میں ڈوبا ہوا جہاں
ہنگامہ جہاں ہے سکوں آشنا جہاں

یہ دوپہر کو کیکروں کی چھاؤں کے تلے
گرمی سے ہانپتی ہوئی بھینسوں کے سلسلے

ریوڑ یہ بھیڑ بکریوں کے اونگھتے ہوئے
جھک کر ہر ایک چیز کی بو سونگھتے ہوئے

یہ آندھیوں کے خوف سے سہمی ہوئی فضا
جنگل کی جھاڑیوں سے سنکتی ہوئی ہوا

یہ شام کے مناظر رنگیں کی خامشی
اور اس میں گونجتی ہوئی جھینگر کی راگنی

بچے غبار رہگزر پھانکتے ہوئے
میدان میں مویشیوں کو ہانکتے ہوئے

برفاب کے دفینے اگلتا ہوا کنواں
یہ گھنگھروؤں کی تال پہ چلتا ہوا کنواں

یہ کھیت، یہ درخت، یہ شاداب گرد و پیش
سیلاب رنگ و بو سے یہ سیراب گرد و پیش

مست شباب کھیتیوں کی گلفشانیاں
دوشیزۂ بہار کی اٹھتی جوانیاں

یہ نزہت مظاہر قدرت کی جلوہ گہ
ہاں ہاں یہ حسن شاہد فطرت کی جلوہ گہ

دنیا میں جس کو کہتے ہیں گاؤں یہی تو ہے
طوبیٰ کی شاخ سبز کی چھاؤں یہی تو ہے

(۲۴-۷-۱۹۳۵)

حالی

مسدس کا مصنف شاعر جادو بیاں حالی ۔ وُہ حالی عندلیب گلشن ہندوستاں حالی
قلم کی نوک سے جس نے ربابِ روح کو چھیڑا ۔ حریم قدس کا وہ مطرب شیریں زباں حالی
جہاں آرا نظر جس کی، رموز آگاہ دل جس کا ۔ وہ اسرار و معارف کا محیط بیکراں حالی
فلک جسکو کرے سجدے زمیں جسکے قدم چومے ۔ وہ حالی ہاں وہی شخصیت گردوں نشاں حالی

وہی حالی جسے دانائے رازِ زندگی کہہ دیں
جسے سرمایہ سوز و گدازِ زندگی کہہ دیں

وہ حالی چھوڑ کر جس نے کہانی بلبل و گل کی ۔ بھلا کر قلقل وجد آفریں میخانہ مل کی
نئے انداز سے چھیڑی فضائے بزم عالم میں ۔ حدیث دل فروز اسلام کے شان و تجمل کی
وہ حالی توڑ کر جس نے طلسم گیسوئے پیچاں ۔ دکھائی شان موج زندگانی کے تسلسل کی
وہ جس نے قصہ ہائے نرگس بیمار کے بدلے ۔ سنائی داستاں اوضاعِ ملت کے تعطل کی

وہ حالی جس کے آنے سے جہاں میں انقلاب آیا
وہ جس کے شعر سے ہندوستاں میں انقلاب آیا

وہی حالی جو سوتوں کو جگانے کیلئے آیا　　وہی حالی جو مُردوں کو جِلانے کیلئے آیا
جسے صحرائے بطحا کے حُدی خوانوں نے چھیڑا تھا　　نئی لے میں اسی نغمے کو گانے کیلئے آیا
وہ حالی ہاں وہ مردِ حق جو کفرستان عالم میں　　خدا کے نام کا ڈنکا بجانے کیلئے آیا
وہ حالی وہ معلم مکتب اخلاق ملت کا　　جو ہر انسان کو انساں بنانے کیلئے آیا

وہ حالی جو علمدار وقار زندگانی ہے
سرورِ جاودانی ہے بہار زندگانی ہے

وہی حالی جو اذکار ونصیحت کیلئے آیا　　وہی حالی جو ارشاد و ہدایت کیلئے آیا
وہی شاعر کہ جس نے شعر کی طرزِ کہن بدلی　　وہی ناقد جو تبلیغ صداقت کیلئے آیا
وہی رہبر کہ جس نے گمرہوں کی رہنمائی کی　　وہ مصلح جو فلاح ملک وملت کیلئے آیا
وہ فخر ایشیا' مہر سپہر شاعری حالی　　وہ مردِ حق جو اظہارِ حقیقت کیلئے آیا

وہ جس کے فکر کیف انداز نے موتی لٹائے ہیں
وہ جس کے خامہ سحر آفریں نے گل کھلائے ہیں

وہی حالی کہ جو آئینہ دار باکمالی ہے　　نظیر بے نظیری ہے مثال بیمثالی ہے
وہی حالی کہ جسکی شاعری سلکِ لآلی ہے　　زباں آب زلالی ہے' بیاں سحر حلالی ہے
وہ جسکے قلب میں ہنگامہ دردنہانی ہے　　وہ جسکی روح میں سرمستی تخییل عالی ہے
ہے گر قومیت ہندوستاں کا ترجماں کوئی　　یقیں رکھو یقین رکھو وہ حالی ہے وہ حالی ہے

اسی حالی اسی حالی کی یہ صد سالہ برسی ہے
جبھی تو چار سُو شانِ جمالی جلوہ گرسی ہے

اسی حالی اسی حالی کا ہے یہ جشن صد سالہ　　جبھی تو آج ہے ہندوستاں کی شان دوبالا
لے پیدا ہوئے سو سال گزرے ہیں مگر اب بھی　　جسے دیکھو وہی اس کی محبت میں ہے متوالا
ابھی تک اک جہاں بے امتیاز مذہب وملت　　کلام حالی مرحوم کا ہے پوجنے والا
ابھی تک ہے وہی جسکی ضیا ریزی جلوخیزی　　کلام حالی مرحوم ہے وہ لولوئے لالا

کلام حالی مرحوم اِک گنجِ معانی ہے
جوادبیات میں اِک شاہکار غیر فانی ہے

ابھی تک چل رہا ہے میکدے میں جام حالی کا　　ابھی تک مرکز تقدیس ہے پیغام حالی کا
ابھی بھولے نہیں اہل جہاں احسان حالی کے　　زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے عام حالی کا
اسی جانب رواں ہیں قافلے اقوام عالم کے　　بڑھا جس منزل مقصد کی جانب گام حالی کا
ابھی تک ان فضاؤں میں ہے مضمر روح حالی کی　　ابھی تک چٹکیاں لیتا ہے دل میں نام حالی کا

ابھی تک آرہی ہے عرش سے آواز حالی کی
ابھی تک کان سنتے ہیں نوائے راز حالی کی

سپہر زندگی کا ضوفشاں ناہید ہے حالی　　نہیں، سر مطلع امید کا خورشید ہے حالی
پیام ولولہ انگیز اس کا مٹ نہیں سکتا　　جہانِ زندگی میں زندۂ جاوید ہے حالی
اگر اب بھی نہیں سمجھے تو لو میں برملا کہہ دوں　　اجی! اِک آنے والے دور کی تمہید ہے حالی

چلے گا حشر تک بزمِ جہاں میں جام حالی کا
رہے گا ثبت لوح کن فکاں پر نام حالی کا

(۱-۱۱-۱۹۳۵)

لہر انقلاب کی

حالت بدل رہی ہے جہانِ خراب کی
لہرا رہی ہے دہر میں لہر انقلاب کی

تخریب جس کی حدت و شدت کا نام ہے
دنیا میں پھر نمود ہے اُس اضطراب کی

سرمائے کے نظام کا انجام ہے قریب
اب اس کی زندگی ہے کہ ہستی حباب کی

پہنچا ہے اختتام پہ دورِ ملوکیت
حد بھی تو ہو کوئی ستم بے حساب کی

بوڑھوں کی مصلحت کو بھلا پوچھتا ہے کون
سرجوشیاں ہیں جوش پہ روحِ شباب کی

اس عہد کے جوانِ جواں عزم کے لیے
تہذیب نو ہے ایک تجلی سراب کی

پھر جاگ اُٹھا ہے جذبۂ آزادیِ وطن
تعبیر اور کیا ہو غلامی کے خواب کی

امجدؔ تو آنے والے تغیر کو بھانپ جا
مستقبل مہیب کی ہیبت سے کانپ جا

(۱۰-۱۹۳۶)

محرومِ ازل

عرصۂ کونین میں کچھ بھی نہیں میرے لیے
خاک ہیں فرشِ زمیں عرشِ بریں میرے لیے

اِک جہاں کے واسطے ہے اِک جہانِ انبساط
اور ہے اشکوں میں ڈوبی آستیں میرے لیے

دوسروں کے واسطے تاج و سریر و آستاں
بندۂ مجبور کی عاجز جبیں میرے لیے

رات بھر دورِ شرابِ ارغواں ان کے لیے
صبح کو محفل کے خالی ساتگیں میرے لیے

اس خیالِ خام کو رہنے بھی دے اختر شناس
آسماں کی وسعتوں میں کچھ نہیں میرے لیے

(۱۶-۱۰-۱۹۳۶)

غزل

عشق کی ٹیسیں جو مضرابِ رگِ جاں ہوگئیں
رُوح کی مدہوش بیداری کا ساماں ہوگئیں

پیار کی میٹھی نظر سے تو نے جب دیکھا مجھے
تلخیاں سب زندگی کی لُطف ساماں ہوگئیں

اب لبِ رنگیں پہ نوریں مسکراہٹ ؟ کیا کہوں
بجلیاں گویا شفق زاروں میں رقصاں ہوگئیں

ماجرائے شوق کی بے باکیاں ان پر نثار
ہائے وہ آنکھیں جو ضبطِ غم میں گریاں ہوگئیں

چھا گئیں دشواریوں پر میری سہل انگاریاں
مشکلوں کا اک خیال آیا کہ آساں ہوگئیں

(۲۴-۲-۱۹۳۷)

نذرِ محبت

(سانیٹ)

میں روتا ہوں مری آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں
پروتے ہیں لڑی سی موتیوں کی، تارِ مژگاں میں
یہ موتی جن میں نورِ قدس کے جلوے جھلکتے ہیں
یہ موتی جو ستارے ہیں عروسِ شب کے داماں میں
یہ موتی جو فروغِ سوزِ الفت سے دمکتے ہیں
بکا کرتے ہیں جیبوں آستینوں کی جو دکاں میں

مری ہستی کا سرمایہ ہیں یہ نور آفریں موتی
کہ سلک کہکشاں بھی جن کی قیمت ہو نہیں سکتی
ابھی ان موتیوں کو عمر بھر دامن میں رولوں گا
اور آخر ان کو اِک رنگین مالا میں پرولوں گا
ترے قدموں میں گر کر پریم مندر کی حسیں دیوی
اسی مالا کو میں ترے گلے میں لا کے ڈالوں گا
اور اپنی زندگی کے آخری مقصد کو پا لوں گا

(۱۶-۴-۱۹۳۷)

پسِ پردہ

میری قیام گاہ کی سمت جنوب مغربی
جس میں کہ خار وخس کی ہے چھوٹی سی ایک جھونپڑی
اُس کے درِ شکستہ پر پردہ ہے اِک پھٹا ہوا
چھید سے جس کے جھانک کر دیکھ رہی ہے (آمنہ)
گائے کا دودھ دوہ کر رکھ رہی ہے وہ آگ پر
میرے قدم کی چاپ پر آ گئی در پہ بھاگ کر
سہمی ہوئی کھڑی ہے وہ ساحرۂ لطیف جاں
سانس سے اس کی لرزشیں پردۂ در پہ ہیں عیاں
دیکھ رہی ہے وہ مجھے ہنستی ہوئی نگاہ سے
ہنستی ہوئی نگاہ کی تابش بے پناہ سے

اُف یہ نگہ فسانۂ شوقِ نہاں لیے ہوئے
سادہ سے ایک پریم کی سادگیاں لیے ہوئے
آہ اُسی نگاہ کے جام کو پی رہا ہوں میں
آج اِک اور عالم نور میں جی رہا ہوں میں
عالم نور ہاں یہی خطۂ کیف ِ سرمدی
میری قیام گاہ کی سمت جنوب مغربی

(۸-۶-۱۹۳۷)

نو وارد

نازنیں ! اجنبی شہرِ محبت ہوں میں — میں ترے دیس کے اطوار سے ناواقف ہوں
دیدۂ شوق کی بیباک نگاہوں پہ نہ جا — کیا کروں جرأت گفتار سے ناواقف ہوں
چل پڑا ہوں ترے دامن کو پکڑ کر لیکن — اس کٹھن جادۂ پُر خار سے ناواقف ہوں
مست ہوں عشرتِ آغاز کی سرمستی میں — میں ابھی عاقبتِ کار سے ناواقف ہوں
سونگھنی ہے تری زلفوں سے ابھی بوئے جنوں — ابھی دامن کے پھٹے تار سے ناواقف ہوں
دیکھ لوں تجھ کو تو بے ساختہ پیار آتا ہے — پیار آتا ہے مگر پیار سے ناواقف ہوں
دل میں یہ جذبۂ بیدار ہے کیا ؟ تو ہی بتا — میں تو اس جذبۂ بیدار سے ناواقف ہوں

اِک مسافر ہوں ترے دیس میں آ نکلا ہوں
اور ترے دیس کے اطوار سے ناواقف ہوں

(۱۴-۹-۱۹۳۷)

جھنگ

یہ خاکداں جو ہیولیٰ ہے ظلمتستاں کا
یہ سرزمیں جو ہے نقشہ جحیم سوزاں کا

یہ تنگ و تیرہ و بے رنگ و بو دیارِ مہیب
یہ طرفہ شہر عجیب و غریب و خفتہ نصیب

یہاں خیال ہے محروم اہتزاز حیات
یہاں حیات ہے دوزخ کی ایک کالی رات

یہاں پہ درد دروں کی دَوا نہیں ملتی
یہاں پہ قلب و نظر کو غذا نہیں مِلتی

یہاں کلیدِ حقیقت نہیں کسی کے پاس
یہاں کے تحفے حسد اور عداوت اور افلاس

یہاں ارادہ و ہمت کی وسعتیں محدود
یہاں عروج و ترقی کے راستے مسدود

ہر اک بشر ہے یہاں تنگدستیوں کے قریب
بلندیوں سے بہت دور، پستیوں کے قریب

یہاں نہ روح کو راحت، یہاں نہ دل کو سرور
یہاں ہے طائر پر بستہ آدمی کا شعور

یہاں نہ پرورشِ شوقِ علم کے امکاں
یہاں نہ تربیت ذوقِ شعر کے ساماں

کبھی سے پاپ کی بھٹی میں سڑ رہا ہوں میں
ندیم جھنگ سے اب تنگ آ گیا ہوں میں

(۸-۱۰-۱۹۳۷)

تیرے بغیر

زندگی بھولا ہوا سا خواب ہے تیرے بغیر
سازِ دل اِک سازِ بے مضراب ہے تیرے بغیر

روح برمائی ہوئی بے تاب ہے تیرے بغیر
آنکھ خوں روتی ہوئی بے خواب ہے تیرے بغیر

ضبطِ غم دشوار ہے آسان ہے جو کچھ بھی ہو
ضبطِ غم کرنے کی کس کو تاب ہے تیرے بغیر

کاش ہو معلوم تجھ کو ساقی جامِ حیات
زندگی اِک جرعہ زہراب ہے تیرے بغیر

ملگجی پلکوں پہ رسوا، رائیگاں، رم آشنا
دل کا اِک اِک قطرۂ خوناب ہے تیرے بغیر

پھر مرے جذبات کا وہ پرسکوں بحرِ رواں
یم بہ یم گرداب در گرداب ہے تیرے بغیر

میری پاکیزہ جوانی صرفِ عصیاں ہو نہ جائے
جنس تقدیس وفا نایاب ہے تیرے بغیر

چاند کی کرنوں کے زینوں پر قدم دھرتی ہوئی
آ بھی جا سونی شب مہتاب ہے تیرے بغیر

آ کہ پھر اس آسماں کو حکم دیں سجدے کا ہم
دشمن جاں گردشِ دولاب ہے تیرے بغیر

(۲۷-۱۰-۱۹۳۷)

یہی دُنیا......؟

عشق پیتا ہے جہاں خونابہ دل کے ایاغ
آنسوؤں کے تیل سے جلتا ہے اُلفت کا چراغ
جس جگہ روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں مدام
سیم و زر کے دیوتاؤں کے سیہ قسمت غلام
جس جگہ حب وطن کے جذبے سے ہو کر تپاں
سُولی کی رسی کو ہنس کر چومتے ہیں نوجواں
جس جگہ انسان ہے وہ پیکر بے عقل و ہوش
نوچ کر کھاتے ہیں جس کی بوٹیاں مذہب فروش
جس جگہ یوں جمع ہیں تہذیب کے پروردگار
جس طرح سڑتے ہوئے مردار پر مردار خوار

جس جگہ اُٹھتی ہے یوں مزدُور کے دل سے فغاں

فیکٹری کی چمنیوں سے جس طرح نکلے دُھواں

جس جگہ سرما کی ٹھنڈی شب میں ٹھٹھرے ہونٹ سے

چومتی ہے رو کے بیوہ گال سوتے لال کے

جس جگہ دہقاں کو رنج محنت و کوشش ملے

اور نوابوں کے کتوں کو حسیں پوشش ملے

تیرے شاعر کو یقیں آتا نہیں، ربِ العلا!

جس پہ تو نازاں ہے اتنا، وہ یہی دُنیا ہے کیا؟

(۱۴-۱۲-۱۹۳۷)

شرط

تجھکو یہ ڈر ہے کہ ناموس گہِ عالم میں عشق کے ہاتھوں نہ ہو جائے تو بدنام کہیں!
آج تک مجھ سے جو شرما کے بھی تو کہہ نہ سکی وہ ترا راز زمانے میں نہ ہو عام کہیں !
کسی شب ایسا نہ ہو نالۂ بیتاب کیساتھ تیرے ہونٹوں سے نکل جائے مرا نام کہیں!
روزن در سے لگی، منتظر، آنکھوں کا حال جا کے تاروں سے نہ کہدے شفقِ شام کہیں!
اسکی پاداش میں ساقی فلک چھین نہ لے مرے ہونٹوں سے ترے ہونٹوں کا یہ جام کہیں!
یہ تری شرط وفا ہے کہ وفا کا قصہ دیکھ! سن پائے نہ گردش گر ایام کہیں

ہاں مری رُوح پہ مسطور ہے یہ شرط تری
مجھے منظور ہے منظور ہے یہ شرط تری

تو یقین رکھ، کہ ترے عشق میں جیتے جیتے عدم آباد کی آغوش میں سو جاؤں گا
ایک دن دل سے جب آوازِ شکست آئیگی اس کے آہنگِ فنا رقص میں کھو جاؤں گا
موت کے دیو کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے جو جذب اس شعلۂ جاں سوز میں ہو جاؤں گا

اور خدا پوچھے گا وہ راز باصرار ترا
اس کے اصرار سے ٹکرائے گا انکار مرا

(۲۶-۱۲-۱۹۳۷)

اقبال

(۱)

مشعلِ زندگی کی ضو' اقبال   رہبر دوجہاں جلو اقبال
محفل طور جس سے روشن تھی   اسی شمع ازل کی ضو' اقبال
خس وخاشاک کفر کے حق میں   ایک سیلاب تند رو' اقبال
اُفق تیرۂ دوعالم پر   پرتوِ نورِ صبحِ نو ' اقبال

شاعر زندگی پیام اقبال
زندہ و زندۂ دوام اقبال

(۲)

ساقی بادہ حیات ' اقبال   مطرب ساز کائنات اقبال
موج تہذیب نو ہے جس کیلئے   ورطہ بحر سیآت اقبال
جس کے شعروں کا نقطہ نقطہ ہے   لئے قرآن کے نکات اقبال
راہِ اسلام کو سمجھتا ہے   وہ جو واحد رہِ نجات اقبال

رہ نمائے جہانیاں ' اقبال
فخر ہندوستانیاں ' اقبال

ثبت لوحِ جہاں پہ نام اس کا　　زندۂ جاوداں کلام اس کا
حشر تک گونجتا رہے گا یوں　　دہر میں سرمدی پیام اس کا
تابدور فلک' زمانے میں　　دور کرتا رہے گا جام اس کا
جس رہِ منزلِ حقیقت پر　　اٹھ چکا ہے خجستہ گام اس کا

تم بھی اس راستے پہ بڑھتے چلو
نردبانِ فلک پہ چڑھتے چلو

(۸-۱-۱۹۳۸)

مطربہ سے

فضا میں بحرِ موسیقی رواں معلوم ہوتا ہے   جہاں کا ذرّہ ذرّہ نغمہ خواں معلوم ہوتا ہے

سنبھلنے دے ذرا او مطربہ یہ نشتریں نغمہ   جگر کے زخم پر زخمہ کناں معلوم ہوتا ہے

یونہی گائے جا گائے جا ترا سوز آفریں دیپک   مری ہی زندگی کی داستاں معلوم ہوتا ہے

تو گاتی ہے تو میرے سامنے نظارۂ عالم   کسی فردوسِ رنگیں کا سماں معلوم ہوتا ہے

تو گاتی ہے تو آنکھیں کھول کر لیتی ہے انگڑائی

ربابِ دہر کے نغموں کی محو خواب رعنائی

تو گاتی ہے تو تیرے رُخ پہ زلفیں جھوم جاتی ہیں   تو گاتی ہے تو تیری مدھ بھری آنکھیں بھی گاتی ہیں

تو گاتی ہے تو تیرے چمپئی ہونٹوں کی مہکاریں   شرابِ نغمہ کی سرمستیوں میں ڈوب جاتی ہیں

تو گاتی ہے تو گاتے وقت تیرے روئے تاباں پر   جمالِ زہرہ کی زیبائیاں جادو جگاتی ہیں

تو گاتی ہے تو تیری راگنی کی مست کن تانیں   مری رگ رگ کو نیش درد بن کر گدگداتی ہیں

مرے خلد تصور کی فضا کو ہمہمائے جا

یونہی گائے جا، گائے جا، یونہی گائے جا گائے جا

(۲۴-۱-۱۹۳۸)

فانی جگ

دنیا کی ہر شے ہے پیارے فانی، فانی، فانی
حسن بھی فانی، عشق بھی فانی، فانی مست جوانی

فانی جگ کی سب جگمگ ہے جانی، آنی، فانی

الفت دل کا جذبہ، جذبہ سپنا، سپنا سایہ
سایہ دھوکا، دھوکا دنیا، دنیا رام کہانی

فانی جگ کی سب جگمگ ہے جانی، آنی، فانی

پیاسے رہ گئے کلیوں اور پھولوں کے پیاسے ہونٹ
آیا جھونکا اور چلی گھنگھور گھٹا مستانی

فانی جگ کی سب جگمگ ہے جانی، آنی، فانی

تپتی ریتوں کو جو سمجھے چشموں کی جھلکاری
آخر کو شعلوں پر لوٹے وہ مورکھ سیلانی

فانی جگ کی سب جگمگ ہے جانی، آنی، فانی

(۲۴-۲-۱۹۳۸)

عورت

تو پریم مندر کی پاک دیوی تو حسن کی مملکت کی رانی
حیاتِ انساں کی قسمتوں پر تری نگاہوں کی حکمرانی
جہانِ اُلفت تری قلمرو حریم دل تیری راجدھانی

بہار فطرت ترے لب لعل گوں کی دوشیزہ مسکراہٹ
نظام کونین تیری آنکھوں کے سرخ ڈوروں کی تھرتھراہٹ
فروغِ صد کائنات تیری جبین سیمیں کی ضو فشانی

بھڑکتے سینوں میں بس رہی ہیں قرار بن کر تری ادائیں
ترستی روحوں کو جامِ عشرت پلا رہی ہیں تری وفائیں
رگ جہاں میں تھرک رہی ہے شراب بن کر تری جوانی

دماغِ پروردگار میں جو ازل کے دن سے مچل رہا تھا
زبانِ تخلیق دہر سے بھی نہ جس کا اظہار ہو سکا تھا
نمود تیری اسی مقدس حسین تخیل کی ترجمانی

ہے؛ وادیٔ نیل پر ترا ابر زلف سایہ کناں ابھی تک

ہیں جامِ ایراں کی مے میں تیرے لبوں کی شیرینیاں ابھی تک

فسانہ گو ہے تری ابھی تک حدیث یوناں کی خوں چکانی

ہے تیری اُلفت کے راگ پر موجِ رودِ گنگا کو وجداب تک

تری محبت کی آگ میں جل رہا ہے صحرائے نجد اب تک

جمال زہرہ ترے ملائک فریب جلوؤں کی اِک نشانی

تری نگاہوں کے سحر سے گل فشاں ہے شعروادب کی دنیا

ترے تبسم کے کیف سے ہے یہ غم کی دنیا طرب کی دنیا

ترے لبوں کی مٹھاس سے شکریں ہے زہراب زندگانی

ترا تبسم کلی کلی میں ترا ترنم چمن چمن میں

رموزِ ہستی کے پیچ وخم تیرے گیسوؤں کی شکن شکن میں

کتابِ تاریخ زندگی کے ورق ورق پر تری کہانی

جو تو نہ ہوتی تو یوں درخشندہ شمع بزمِ جہاں نہ ہوتی

وجودِ ارض و سما نہ ہوتا نمودِ کون و مکاں نہ ہوتی

بشر کی محدودیت کی خاطر ترستی عالم کی بیکرانی

(۳۱۔۳۰۔۳۸)

نفیرِ عمل

آہ کب تک گلۂ شومئ تقدیر کریں ‏ ‏ کب تلک ماتم ناکامئ تدبیر کریں
کب تلک شیون جورِ فلکِ پیر کریں ‏ ‏ کب تلک شکوہ بے مہرئ ایام کریں

نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

آج برباد خزاں ہے چمنستانِ وطن ‏ ‏ آج محروم تجلی ہے شبستانِ وطن
مرکز نالہ و شیون ہے دبستانِ وطن ‏ ‏ وقت ہے چارۂ دردِ دلِ ناکام کریں

نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

آؤ اُجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد کریں ‏ ‏ آؤ جکڑی ہوئی روحوں کو پھر آزاد کریں
آؤ کچھ پیروی مسلکِ فرہاد کریں ‏ ‏ یہ نہیں شرطِ وفا بیٹھ کے آرام کریں

نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

ایک ہنگامہ سا ہے آج جہاں میں برپا ‏ ‏ آج بھائی ہے سگے بھائی کے خوں کا پیاسا
آج ڈھونڈے سے نہیں ملتی زمانے میں وفا ‏ ‏ آؤ اس جنس گرانمایہ کو پھر عام کریں.

نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

جامِ جم سے نہ ڈریں شوکتِ کَے سے نہ ڈریں حشمتِ رُوم سے اور صولتِ رَے سے نہ ڈریں
ہم جواں ہیں تو یہاں کی کسی شے سے نہ ڈریں ہم جواں ہیں تو نہ کچھ خدشۂ آلام کریں
نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

رشتۂ مکر و ریا توڑ بھی دیں، توڑ بھی دیں کاسۂ حرص و ہوا پھوڑ بھی دیں، پھوڑ بھی دیں
اپنی یہ طرفہ ادا چھوڑ بھی دیں، چھوڑ بھی دیں آؤ کچھ کام کریں، کام کریں، کام کریں
نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

(۸-۵-۱۹۳۸)

ابر صبوح

تیرتے بادل خنک جھونکے خمار آگیں سماں آسماں پر ناچتی اُڑتی ابابیلوں کے راگ
اس طرح لہرا رہی ہیں اودی اودی بدلیاں جیسے اک کافرادا کے دوش پر زلفوں کے ناگ
جیسے نیلی جھیل میں بہتی ہوئی اک اوڑھنی
بھول آئی ہو جسے معصوم پنہارن کوئی
گدرے گدرے ابر پاروں کی چھلکتی چھاگلیں اس طرح ٹپکا رہی ہیں اس بھری مدرا کا جھاگ
جس طرح رو دے کوئی مہجور پی کی یاد میں سونپ کر جذبات کی اندھیاریوں کو دل کی باگ
جیسے سیمیں انگلیوں سے مغبچہ ہائے بہشت
چھانتے ہوں حور کے گیسو میں صہبائے بہشت
وہ اُٹھی کالی گھٹا اُٹھ بھی مری مست شباب وہ اُڑا جاتا ہے بادل ہاں اُڑا بوتل کا جھاگ
بجھ چلا ہے روح کا آتش کدہ لا بھی شراب پھونک دے میرے رگ و پے میں کوئی بہتی سی آگ
تجھ کو جام مے کے ان ہنستے شراروں کی قسم
ان ہواؤں کی قسم ان ابر پاروں کی قسم

(۱۱-۶-۱۹۳۸)

سرِ بام!

لو آ گئی وہ سرِ بام مسکراتی ہوئی
لئے اُچٹتی نگاہوں میں اک پیامِ خموش

یہ دھندلی دھندلی فضاؤں میں انعکاسِ شفق
یہ سونا رستہ، یہ تنہا گلی، یہ شامِ خموش

گلی کے موڑ پہ اک گھر کی مختصر دیوار
بچھا ہے جس پہ دھندلکوں کا ایک دامِ خموش

یہ چھت کسی کے سلیپر کی چاپ سے واقف
کسی کے گیتوں سے آباد یہ مقامِ خموش

کسی کے ہونٹوں کے اعجاز سے یہ چاروں طرف
تبسّوں کے ضیا پاروں کا خرامِ خموش

کسی کے مدبھرے نینوں سے یہ برستا خمار
کسی کی نقرئی باہوں کا یہ سلامِ خموش

مُنڈیر پر بصد انداز کہنیاں ٹیکے
کھڑی ہوئی ہے کوئی شوخ لالہ فامِ خموش

لئے اُچٹتی نگاہوں میں اِک پیامِ خموش

(۱۸-۶-۱۹۳۸)

قیدی

سخت زنجیریں ہیں قیدی ! سخت زنجیریں ہیں یہ
ان کو ڈھالا ہے جہنم کی دہکتی آگ میں
انکی کڑیاں موت کے پھنکارتے ناگوں کے پیچ
انکی لڑیاں زندگی کی اُلجھنوں کے سلسلے
انکی گیرائی کے آگے تیری تدبیریں ہیں یہ
تیری تدبیریریں ؟ عبث سب تیری تدبیریں ہیں یہ
سخت زنجیریں ہیں قیدی' سخت زنجیریں ہیں یہ

بیڑیاں' قیدی ترے پاؤں میں ہیں تاگے نہیں
دیکھ پاپی ! اپنے سر پر تیز سنگینوں کی چھت
چارسُو لوہے کی سیخوں کی فصیل بیکراں
تو ادھر بے دست و پا بے حس و حرکت بے سکت
اور ادھر اس سوچ میں ہیں تیرے ظالم پاسباں
دُکھ کی کالی کوٹھڑی سے تو کہیں بھاگے نہیں
بیڑیاں' قیدی ! ترے پاؤں میں ہیں تاگے نہیں

(۲۹-۹-۱۹۳۸)

کون؟

زمانے پہ چھاتی ہیں جب کالی راتیں مرے دل سے کون آ کے کرتا ہے باتیں؟
چمکتے ہیں جب جھلملاتے ستارے مرے من میں کیوں کوندتے ہیں شرارے؟
اُٹھاتی ہے جب کہکشاں چندر گاگر اُبلتا ہے کیوں میرے اشکوں کا ساگر؟
گزرتے ہیں جب بادلوں کے سفینے دھڑک اُٹھتے ہیں کیوں اُمیدوں کے سینے؟
کلی جب ہے شبنم کے جُھومر سے سجتی مری روح میں کس کی بنسی ہے بجتی؟
گلستاں میں جب پھول کھلتے ہیں ہر سُو مجھے کس کی زُلفوں کی آتی ہے خوشبو؟
یہ کیا بھید ہے کوئی بے نام ہستی ہے آباد جس سے مرے من کی بستی
ہر اک لحظہ اک خوشنما روپ دھارے مری روح سے کر رہی ہے اشارے

میں اس شکل موہوم کو ڈھونڈتا ہوں
میں اس سر مکتوم کو ڈھونڈتا ہوں

(۱-۱۱-۱۹۳۸)

صبحِ نو

اے دوست! ہو نوید کہ پت جھڑ کی رُت گئی چٹکی ہے میرے باغ میں پہلی نئی کلی

پھر جاگ اٹھی ہیں راگنیاں آبشار کی پھر جھومتی ہیں تازگیاں سبزہ زار کی

پھر بس رہا ہے اِک نیا عالم خمار کا

پھر آرہا ہے لوٹ کے موسم بہار کا

اے دوست! اس سے بڑھ کے نہیں کچھ بھی میرے پاس یہ پہلا پھول بھیج رہا ہوں میں تیرے پاس

کومل سا، مسکراتا ہوا، مشکبار پھول پروردگارِ عشق کا یہ بے زباں رُسول

آتا ہے اک پیام رسانی کے واسطے بسرے دنوں کی یاد دہانی کے واسطے

اے دوست ایک پھول کی نکہت ہے زندگی اے دوست ایک سانس کی مہلت ہے زندگی

وہ دیکھ پَو پھٹی، کٹی رات اضطراب کی اُچھلی خطِ اُفق سے صراحی شراب کی

آ آ یہ صبحِ نو ہے غنیمت، مرے حبیب!

آیا ہے پھر بہار کا موسم! زہے نصیب!

(۶-۱۲-۱۹۳۸)

ریل کا سفر

کراچی کو جاتی ہوئی ڈاک گاڑی
دھوئیں کے سمندر میں تیراک گاڑی

مسافت کو یوں طے کیے جا رہی ہے
سفر کو غٹاغٹ پیے جا رہی ہے

یہ چٹیل سے میداں یہ ریتوں کے ٹیلے
ہیں جن پر بچھے دوب کے زرد تیلے

یہ کپاس کی کھیتیوں کی بہاریں
یہ ڈوڈوں کو چنتی ہُوئی گلعذاریں

گھنے بن کی پھلواڑیوں کی تگ و دَو
اور ان پر بگولوں کی زُلفوں کے پَرتو

یہ چھوٹی سی بستی، یہ ہل اور یہ ہالی
یہ صحرا میں آوارہ، بھیڑوں کے پالی

یہ حیران بچے یہ خاموش مائیں
یہ گوبر کی چھینٹوں سے لتھڑی قبائیں

یہ نہروں میں بہتا ہوا مَست پانی
یہ گنّوں کی رت کی سنہری جوانی

یہ اینٹوں کا آوا، یہ اُونٹوں کی ڈاریں
یہ کیکر کے پیڑوں کی لمبی قطاریں

درختوں کے سایوں سے آباد رستے
یہ آزاد راہی، یہ آزاد رستے

بدلتے چلے جا رہے ہیں نظارے
نئے سے نئے آ رہے ہیں نظارے

یہ صحرا جو نظروں کو برما رہا ہے
مرے ساتھ بھاگا چلا آ رہا ہے

نظر ایک منظر پہ جمتی نہیں ہے
یہ موج آ کے ساحل پہ تھمتی نہیں ہے

کنواں بن میں برباد سا اک پڑا ہے — کسی یادِ رنگیں میں ڈوبا ہُوا ہے
بہت دُور ادھر ایک محمل دواں ہے — دُلھن کوئی میکے کو شاید رواں ہے
کھجوروں کا جھُرمٹ نظر آ رہا ہے — پتا رودِ راوی کا بتلا رہا ہے
وہ گاڑی کے پہیوں کی دلدوز آہٹ — وہ اُڑتے ہوئے بگلوں کی پھڑ پھڑاہٹ
یہ شام دلآرا یہ پُل کا نظارا — نگاہوں سے چھپتا ہُوا وہ کنارا
وہ اُٹھتا ہوا مرتعش ناتواں سا — بہت دُور اک جھونپڑے سے دُھواں سا
وہ ویراں سی مسجد، وہ ٹوٹی سی قبریں — وہ تارا شفق کے گلابی دُھویں میں
نیا رنگ ہر دم دکھاتے ہیں منظر — نہیں ختم ہونے میں آتے ہیں منظر
ہر اک شے میں حرکت ہے جولانیاں ہیں — ہر اک ذرّے میں وجد سامانیاں ہیں
کشش ہے فسوں ہے نہ جانے وہ کیا ہے — جو گاڑی کو کھینچے لیے جا رہا ہے

مرا خطۂ نور و رنگ آ گیا ہے
مرا سُکھ بھرا دیس جھنگ آ گیا ہے

مدّوکی جھنگ: (۱۲-۱۲-۱۹۳۸)

یہ سچ ہے

یہ سچ ہے اس کی دُنیا میں کوئی قیمت نہیں ہوتی
پڑا رہتا ہے جب تک بحر کی آغوش میں موتی
یہ سچ ہے پھول جب تک شاخ سے توڑا نہیں جاتا
کسی کے گیسوئے پُر پیچ میں جوڑا نہیں جاتا
شراب ناب جب تک بٹ نہیں جاتی کٹوروں میں
جھلک سکتی نہیں ان مدبھری آنکھوں کے ڈوروں میں
یہ سچ ہے جب ندی اپنی روانی چھوڑ دیتی ہے
تو اس کے ساز کے تاروں کو فطرت توڑ دیتی ہے
یہ سچ ہے اپنے جوہر کھو رہا ہوں دیس میں رہ کر
گزرتی زندگی کو رو رہا ہوں دیس میں رہ کر

اسی ماحول تک محدود ہے نغمہ مری نے کا
فضا کی تنگیوں میں گھٹ رہا ہے دم مری لے کا
مجھے آفاق کی پہنائیاں آواز دیتی ہیں
مجھے دنیا کی بزم آرائیاں آواز دیتی ہیں
مگر میں چھوڑ کر یہ دیس پیارا جا نہیں سکتا
بھلا کر میں ان آنکھوں کا اشارہ جا نہیں سکتا
وہ آنکھیں جن کی اشک افشانیاں جانے نہیں دیتیں
وہ جن کی ملتجی حیرانیاں جانے نہیں دیتیں

(۱۹۳۸ء)

انقلاب

مری آنکھوں میں برستے ہوئے آنسو نہ رہے
دل کی دُنیا نہ رہی، درد کے پہلو نہ رہے
آہوں سے رُوح کی اگنی کی بھبھک جاتی رہی
خشک ہونٹوں سے شرابوں کی مہک جاتی رہی
نیند کا چین گیا جاگنے کی بات گئی
نشوں کا دن گیا اور مستیوں کی رات گئی
ذرّوں کے سینوں میں مہتابوں کی دُنیا نہ رہی
قرمزی رنگوں میں گم خوابوں کی دُنیا نہ رہی
ڈال رکھا تھا تخیل نے جو رنگیں پردا
رُخِ ہستی سے ہے اُٹھنے لگا رفتہ رفتہ
اب حقیقت مری آنکھوں کے قریب آتی ہے
نظر اب دُنیا کی تصویر مہیب آتی ہے
اب تبسم مجھے غنچوں کا رُلا دیتا ہے
دل کے شعلوں کا ہر اک جھونکا ہوا دیتا ہے
حسن کے ناز و ادا جانتا ہوں جانتا ہوں
اس کا سحر اس کا فسوں مانتا ہوں مانتا ہوں
چاند کی قاش سے ماتھے کی صباحت! سچ ہے
پھول کی طرح حسین چہرے کی رنگت! سچ ہے
مست نظروں میں شرابوں کی ملاوٹ! سچ ہے
سرخ ہونٹوں میں نباتوں کی گھلاوٹ! سچ ہے
دیکھتی ہیں مگر اب میری نگاہیں کچھ اور!
اب مرے فکر پہ ہیں کھل گئیں راہیں کچھ اور
اب ہر اِک شے کی حقیقت پہ گماں رکھتا ہوں
اپنی تخییل کے قدموں پہ جہاں رکھتا ہوں
دیکھتا ہوں کہ نہیں کچھ بھی یہاں میرے بغیر
خس و خاشاک کا ہے ڈھیر جہاں میرے بغیر

حسن اک دھوکا ہے اور عشق ہی خود بھول ہے اِک
تتلی کیوں گل پہ گرے تتلی ہی خود پھول ہے اِک

(۱۹۳۹-۱-۱)

یہیں پہ رہنے دے صیاد' آشیانہ مرا

یہ باغ تیرا ہے یہ پھول تیرے ہیں چن لے
گلوں کے ریشوں سے دام حسین کوئی بن لے
ابھی بچھا نہ اسے' ایک التجا سن لے
مرے بغیر اُجڑ جائے گا ٹھکانہ مرا
یہیں پہ رہنے دے صیاد' آشیانہ مرا

یہ سچ ہے' تیرے چمن سے چرایا ہے میں نے
یہ ایک تنکا یہیں سے اُٹھایا ہے میں نے
کہ جس پہ اپنا بسیرا بسایا ہے میں نے
ترے چمن میں تھا حق اس قدر بھی کیا نہ مرا؟
یہیں پہ رہنے دے صیاد آشیانہ مرا

یہیں پہ بیٹھ کے میں چپکے چپکے رو لوں گا
کلی کلی مجھے چھیڑے گی، میں نہ بولوں گا
نہ گاؤں گا، میں زباں تک نہ اپنی کھولوں گا
تری فضاؤں پہ گر بار ہے ترانہ مرا
یہیں پہ رہنے دے صیاد، آشیانہ مرا

تجھے ہے یاد؟ یہاں ایک پنچھی رہتا تھا
وہ جس کے نغموں کی رہ میں زمانہ بہتا تھا
یہاں سے جانے لگا وہ تو رو کے کہتا تھا
"رفیق! جاتا ہوں! پھر جانے کب ہو آنا مرا
ترے سپرد یہ چھوٹا سا آشیانہ مرا"

اندھیرے میں کوئی پتہ جو سرسراتا ہے
تو اب بھی راتوں کو دل میرا چونک جاتا ہے
سمجھتا ہوں وہ مرا ہم سرود آتا ہے
ہے جس کی ایک امانت یہ آشیانہ مرا
یہ ٹوٹی ٹہنی پہ برباد سا ٹھکانہ مرا

کبھی تو آئے گا وہ مژدۂ امید لیے
اِک اور جنت گلپوش کی کلید لیے
اک اور گلشن آزاد کی نوید لیے
بلا کے نام باندازِ محرمانہ مرا
وہ آکے سر پہ اُٹھا لے گا آشیانہ مرا

وہ دیکھ! شاخیں ہلی ہیں — وہ آ رہا ہوگا
حسین کلیاں کھلی ہیں — وہ آ رہا ہو گا
رُتیں رُتوں سے ملی ہیں — وہ آ رہا ہوگا
یہیں، ادھر ہی، وہ سُکھ سنگتی پرانا مرا
یہیں پہ رہنے دے صیاد، آشیانہ مرا

(۱-۲-۱۹۳۹)

بیساکھ

بیساکھ آیا' آئی فسوں زائیوں کی رُت
آئی حسین کلیوں کی برنائیوں کی رُت !
گاؤں کے مرد وزن نے اُٹھائیں درانتیاں
آئی سنہری کھیتیوں کی لائیوں کی رُت
گندم کی فصل کاٹنے کے خوشگوار دن
محنت کشوں کی زمزمہ پیرائیوں کی رُت
خوشوں کے بکھرے بکھرے سے انباروں کا سماں
کھلواڑوں کے نگاروں کی رعنائیوں کی رُت
کھیتوں میں دھیمے قہقہوں کا موسم حسیں
رستوں پہ گونجتی ہوئی شہنائیوں کی رُت
دہقان کی اُمید کی بار آوری کا وقت
دُنیا کے سوئے بخت کی انگڑائیوں کی رُت

(۲۴-۴-۱۹۳۹)

غزل

یہ دنیا ہے اے قلب مضطر سنبھل جا
یہاں ہر قدم پر ہے ٹھوکر سنبھل جا

بڑے شوق سے پی مگر پی کے مت گر
ہتھیلی پہ ہے تیری ساغر سنبھل جا

جہاں حق کی قسمت ہے سولی کا تختہ
یہاں جھوٹ ہے زیب منبر سنبھل جا

قیامت کہاں کی، جزا کیا، سزا کیا
ہے ہر سانس اک تازہ محشر سنبھل جا

وہ طوفاں نے پر خوف جبڑوں کو کھولا
وہ بدلے ہواؤں کے تیور سنبھل جا

نہیں اس خرابات میں اذنِ لغزش
یہ دنیا ہے اے قلب مضطر سنبھل جا

(۳۰-۴-۱۹۳۹)

قیصریت

ایک قطرہ سلطنت کی موج کا   اک سپاہی بادشہ کی فوج کا !

دوش پر تیر و کماں باندھے ہوئے   جا رہا تھا رخت جاں باندھے ہوئے

چوم کر اس کے گلابی گال کو   جاتے دم کہتا تھا اپنے لال کو

''دیکھتی ہے راستہ امی تری   جاؤ بیٹا ! جاؤ ! میں آیا ابھی''

بچہ مڑ کر چل پڑا ماں کی طرف   اور سپاہی خونی میدان کی طرف

وہ سپاہی جنگ میں مارا گیا   ڈوب اسکی زیست کا تارا گیا

لاش اسکی جوئے خوں میں بہہ گئی   کشتوں کے پشتوں میں کھو کر رہ گئی

لُٹ گیا جب اس کی دلہن کا سہاگ   تھام لی شیطان نے اسکے دل کی باگ

اُس نے کر لی ایک اور شادی کہیں   حسن اور خوئے وفا ؟ ممکن نہیں

اس سپاہی کا وہ اکلوتا یتیم
آنکھ گریاں، روح لرزاں، دل دونیم
بادشہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس
لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس
اسکے ننگے تن پہ کوڑے مار کر
پہرے داروں نے کہا دھتکار کر
کیا ترے مرنے کی باری آ گئی
دیکھ وہ شہ کی سواری آ گئی
وہ مُڑا چکرایا اور اوندھا گرا
گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روندا گیا
دی رعایا نے صدا ہر سمت سے
''بادشاہِ مہرباں ! زندہ رہے''

(۲۳-۶-۱۹۳۹)

قیدی دوست

میرے قیدی دوست! تو مغموم سا رہتا ہے کیوں؟
لگ کے زنداں کی سلاخوں سے کھڑا رہتا ہے کیوں؟
رات دن پتھرائی آنکھوں سے مجھے تکتا ہے تو
بات وہ کیا ہے جو مجھ سے کہہ نہیں سکتا ہے تو
تیرے سینے کی نوائے راز کو سنتا ہوں میں
جب تری زنجیر کی آواز کو سنتا ہوں میں
لیکن اے ساتھی نہ گھبرا، مژدہ ہو، کل رات کو
سنتری دہرا رہے تھے راز کی اس بات کو
"حکم آیا ہے کہ اس زنداں میں ہیں جتنے اسیر
جن کے دکھیارے دلوں میں ہیں کھٹکتے غم کے تیر
ایک آہن پوش کشتی پر انھیں کر کے سوار
بھیج دو اس بحر کے پُرخوف طوفانوں کے پار"
دیکھ! اُفق پر صبح کی دھندلاہٹوں کے درمیاں
وہ نظر آیا سفینے کا سنہری بادباں!

اب ہماری قید گہ کے قفل کھولے جائیں گے
اس سفینے پر ہر ایک بد بخت کو لے جائیں گے
اُس جگہ اِک دُوسرے کے متصل بیٹھیں گے ہم
چند گھڑیوں کے لئے آپس میں مل بیٹھیں گے ہم
اپنی اپنی داستاں رو رو کے کہہ جائیں گے ہم
چند لمحوں کے لئے نشوں میں بہ جائیں گے ہم
بیڑیوں پر تیری رکھ کے اپنی سیمائے نیاز
میں پڑوں گا میرے قیدی دوست ! اُلفت کی نماز
اتنے میں کشتی کنارے سے لپٹ جائے گی دوست
اور مرے سجدوں کی عمر شوق کٹ جائے گی دوست
پھر قدم رکھتے ہی ساحل پر جدا ہو جائیں گے
ازسرِنو قیدیٔ دامِ بلا ہو جائیں گے

(۲۴-۶-۱۹۳۹)

بیسویں صدی کے خدا سے

انھیں آنکھوں سے میں نے ربِ اکبر تیری دنیا میں
غرورِ حسن کو برباد و رسوا ہوتے دیکھا ہے
زر و دولت کی بے حس مورتی کے پاؤں پر میں نے
حسیں فاقہ کشوں کی انکھڑیوں کو روتے دیکھا ہے ۵
چمکتی دھوپ میں مزدور دوشیزہ کو رستوں پر
کڑکتے کوڑوں کی چھاؤں میں اینٹیں ڈھونڈتے دیکھا ہے
جوانی کی مہکتی رت میں بیواؤں کی آنکھوں کو
جگر کے زخم نمکیں آنسوؤں سے دھوتے دیکھا ہے
تری جنت پہ مجھ کو کیوں یقیں آئے کہ دنیا میں
گل اندامون کو میں نے خار و خس پہ سوتے دیکھا ہے
وہ جن پر تو نے برسائے ہیں اپنی بخششوں کے پھول
انہی کو میں نے ہر رستے پہ کانٹے بوتے دیکھا ہے
تری آنکھیں نہیں لیکن سنا ہے دیکھتا ہے تو
ذرا دیکھ اپنے بندوں کی نظر سے گر رہا ہے تو

(۸-۷-۱۹۳۹)

بھکشا

پھرتا پھرتا دکھ کی وادی میں کھویا کھویا سا
لے کر اپنے اُجڑے دل کا ٹوٹا پھوٹا کاسا
آ پہنچا ہے تیرے در پر یہ دکھیا بھکیاری
سینے میں طوفان تمنا آنکھ سے آنسو جاری
تیرے اونچے ایواں کی یہ کنگریاں چمکیلی
چوم رہی ہیں جن کو سورج کی کرنیں البیلی
مرمر کی محرابوں کے نیچے وہ بند دریچے
جیسے بیٹھے ہوں جنت کے غلماں آنکھیں میچے
بھینی خوشبوؤں سے مہکا جالی دار جھروکا
جس کی چلمن پر ہر ہلتا سایہ رنگیں دھوکا
تیرے دوارے پر آ کر میں اوگن ہار بھکاری
آنکھوں کے رستے ٹپکا کر سینے کی چنگاری
ذرّوں کو آج اشکوں کی برساتیں بانٹ رہا ہوں
خاکِ در پر سجدوں کی سوغاتیں بانٹ رہا ہوں
دیکھ اب ڈوبتی ڈوبتی نبضیں کھاتی ہیں ہچکولے
روح کا پنچھی دل کی مٹی پر ہے کندے تولے
خاک میں مل جانے کو ہے اِک چندروپ جوانی
جیون کی بھکشا دے دے او راج محل کی رانی

(۲۴-۷-۱۹۳۹)

گراس جہان میں جینا ہے

نہ تاجِ سر کو تو بیچ اور نہ تو سریر کو بیچ
گر اس جہان میں جینا ہے تو ضمیر کو بیچ
حیا کو اپنی نگاہوں سے حکمِ رخصت دے
زباں کو زہر ملے شہد کی حلاوت دے
فریب سجدہ سے اپنی جبیں کو واقف کر
ریا کے آنسوؤں سے آستیں کو واقف کر
ہے ترے دل میں جو چنگاری اس کا نام نہ لے
خودی کا رُتبۂ خود داری ! اس کا نام نہ لے

(۱۹۳۹ء)

گھٹا سے

گھٹا ! نہ رو ! مرے دردوں پہ اشکبار نہ ہو
مجھ ایسے سوختہ ساماں کی غمگسار نہ ہو

لپیٹ لے یہ خنک چادریں ہواؤں کی
کسے طلب ہے تری مست کار چھاؤں کی

تو اپنے ساتھ ہی لے چل یہاں سے جاتے ہوئے
کھلونے اپنی پھواروں کے جھنجھناتے ہوئے

یہ بوندیوں کی نوائیں تجھے مبارک ہوں
یہ بہکی بہکی فضائیں تجھے مبارک ہوں

یہ نزہتیں مری محفل سے اے گھٹا لے جا
یہ اپنی بجلیوں کے ارغنوں اُٹھا لے جا

میں سن چکا ہوں بہت تیری داستانیں، بس
خموش ! مجھ کو نہیں راس ترے نغموں کا رس !

نہ چھیڑ آج یہ اپنی رسیلی شہنائی !
ہے مشکلوں سے مرے آنسوؤں کو نیند آئی !

(۱-۲-۱۹۴۰)

بیاہی ہوئی سہیلی کا خط

کیا یہ سچ ہے مری سہیلی کہ تم
جلد ہی اب بیاہی جاؤ گی

اک نئی زندگی میں اُترو گی
اک نئی قیدگہ بساؤ گی

آج تک جن سے تم بچھڑ نہ سکیں
ان کو اس طرح چھوڑ جاؤ گی

ایک گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپ کر
زیست کی قید کاٹ جاؤ گی

نقرئی بندھنوں میں جکڑی ہُوئی
راہِ ہستی پہ ڈگمگاؤ گی

پھر بھی آئیں گی چاندنی راتیں
تم مگر یوں نہ گنگناؤ گی

آنکھ میں ہونگے سرمہ آلود اشک
آہ !تم پھر بھی مسکراؤ گی

آندھیوں کی زدوں میں آئی ہوئی
شمع کی طرح بجھتی جاؤ گی

آہ ! یہ دُکھ بھرا نظامِ حیات
جس کے پنجے میں تلملاؤ گی

آہ ! یہ طوق رسم و راہِ جہاں
جس کو زیب گلو بناؤ گی

جس میں جلتا ہے دل سہاگن کا
اس جہنم میں ہنستی جاؤ گی

مان لوں کیا یہ میں کہ آج کی رات   آخری گیت اپنا گاؤ گی
پانی بھرنے کے اِک بہانے سے   اپنی گاگر اُٹھا کے آؤ گی
آ کے ندی کنارے لہروں کو   دیر سے منتظر سا پاؤ گی
ایک لمحے کے بعد کیا ہوگا   ان کی گودی میں تھرتھراؤ گی
زندگانی کے قید خانے کی   ساری زنجیریں کاٹ جاؤ گی

کاش پہنچے یہی نوید مجھے
مِلے اس خط کی یوں رسید مجھے

(۱۷-۲-۱۹۴۰)

کہاں؟

موت کی گفتگو نہ کر اے دوست — آہ یہ آرزو نہ کر، اے دوست
جب تلک سانس کی روانی ہے — تیرے جیون کی رُت سہانی ہے
جب تلک دل کے داغ روشن ہیں — شش جہت میں چراغ روشن ہیں
دوست! جب تک ترا حریم نگاہ — دے رہا ہے تجلیوں کو پناہ
زندگی جام ہے محبت کا — زندگی نام ہے محبت کا!
ہم نشیں، کس قدر قریب ہیں ہم — زندگی ہے تو خوش نصیب ہیں ہم
دل سے دل کی طرب نوازی ہے — روح سے روح محوبازی ہے
آنکھیں آنکھوں میں مے انڈیلتی ہیں — انگلیاں گیسوؤں سے کھیلتی ہیں
شانے سے شانہ بھڑ رہا ہے یہاں — نغمے سے نغمہ چھڑ رہا ہے یہاں
جو بھی ارماں دلِ حیات میں ہے — آج تو دامِ ممکنات میں ہے
کل نہ معلوم کیا سے کیا ہو جائے — کل کا مفہوم کیا سے کیا ہو جائے
اُلجھے اُلجھے اجل کے دھارے سے — جا کے ٹکرائیں کس کنارے سے

کس نشیمن میں، کس ٹھکانے، کہاں —؟
اپنی منزل ہو پھر نہ جانے کہاں —؟

(۱۵-۳-۱۹۴۰)

عقدۂ ہستی

(ریل کے ایک سفر کے زبانی تاثرات)

خشک ندی کے کنارے، ریل کی پٹڑی کے پاس
کھل رہا ہے دشت میں اک لالہ آتش لباس
اس طرف کمھلائی دوب اور اس طرف سُوکھا ببول
پل رہا ہے جن کی بے احساس گودی میں یہ پھول
کھیلتا ہے گرچہ انگاروں سے اس کا ہر نفس
مٹ رہا ہے خاروخس میں ہم نشینِ خاروخس
درد کی فطرت کا دم اس طرح گھٹتا دیکھ کر
دیکھ کر اس سوز کی دولت کو لٹتا دیکھ کر
مجھ کو نظمِ زیست کی بربادیاں یاد آ گئیں
میری آنکھوں میں برستی بدلیاں لہرا گئیں
اس پر اک ساتھی نے حیرت سے کہا" کیوں کیا ہوا
او مسافر بھائی تو کیوں رو پڑا؟ کیوں' کیا ہُوا؟"

ایسے لمحے میں حقیقت کو چھپانے کے لئے

ڈور کیوں جائے بھلا انساں بہانے کے لئے

مُسکرا کر میں نے جھٹ اس سے کہا "کچھ بھی نہیں

یونہی بیٹھے بیٹھے آنکھیں میری دھندلا سی گئیں"

عقدۂ ہستی کو سلجھایا ہے کس نے اور کب ؟

آہ اس دُنیا میں دل روتے ہیں اور ہنستے ہیں لب !

(۸-۳-۱۹۴۰)

مسافر

گزر گاہِ جہاں پر — ہم مسافر !
شکستہ دل ، شکستہ دم ، مسافر
عجب کچھ زندگانی کا سفر ہے
مسافر کا نہیں محرم مسافر
گلے ملتی ہے رو رو کر گلوں سے
کہ اس گلشن میں ہے شبنم مسافر
کٹھن ہے عشق کی منزل کٹھن ہے
چلے ہیں اس روش پر کم مسافر
ابد اک موڑ تیرے راستے کا
تو سیلِ شوق ہے، مت تھم مسافر !
گلہ کیوں شومئی قسمت کا امجدؔ ؟
کرے کیوں فکر بیش و کم مسافر

(۲۷-۱۰-۱۹۴۰)

ساز فقیرانہ

گلوں کی سیج ہے کیا، مخملیں بچھونا کیا
نہ مل کے خاک میں گر خاک ہوں تو سونا کیا
فقیر ہیں دو فقیرانہ ساز رکھتے ہیں
ہمارا ہنسنا ہے کیا اور ہمارا رونا کیا
ہمیں زمانے کی ان بیکرانیوں سے کام!
زمانے بھر سے ہے کم دل کا ایک کونا کیا
نظامِ دہر کو تیورا کے کس لئے دیکھیں
جو خود ہی ڈوب رہا ہو اُسے ڈبونا کیا
بساط سیل پہ قصرِ حباب کی تعمیر
یہ زندگی ہے تو پھر ہونا کیا، نہ ہونا کیا
نہ روکہ ہیں ترے ہی اشک ماہ و مہر امجدؔ
جہاں کو رکھنا ہے تاریک اگر تو رونا کیا

(۳-۱۲-۱۹۴۰)

سفرِ حیات

ہر اک نقشِ پا کی زباں پر فسانے
ہر اک ڈوب میں مضطرب سو ترانے
ہر اک موڑ پہ اس کے لاکھوں زمانے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا، نہ جانے ؟

کسی بوستانِ حسیں کے کنارے ؟
کسی وادیٔ شبنمیں کے دوارے ؟
کسی خارزار حزیں کے ٹھکانے ؟
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا، نہ جانے ؟

اُمیدوں پہ حسرت سی برسا رہے ہیں
پس و پیش سے کان میں آ رہے ہیں
بھٹکتے ہُوئے قافلوں کے ترانے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا، نہ جانے ؟

ہر اک گام کی زد میں خاموش لاشیں
جبینوں کے ٹکڑے تو سینوں کی قاشیں
یہ گزرے ہوئے رہرووں کے ''فسانے''
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا ' نہ جانے ؟

مسافر رواں ہیں ادھر آنکھ میچے
ادھر تنکے تنکے کی چلمن کے نیچے
بچھا رکھا ہے دام اپنا قضا نے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا ' نہ جانے ؟

نگاہوں کے آگے اجل کی سیاہی
کرے کیا بچارا تھکاہارا راہی
چلا تو ہے تقدیر کو آزمانے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا ' نہ جانے ؟

(۱۹۴۰ء)

چچی

آگ لینے آئی جب کوئی پڑوسن شام کو یوں چچی نے وا کیا اپنے لبِ دشنام کو
''اس موئی پاپن نے تو مجھ کو جلا ڈالا بہن! کوئی ہو اس بے حیا سے پوچھنے والا' بہن
یہ نگوڑی کیوں گلی کے موڑ پر کل پچھلی رات کر رہی تھی جانے کیا سرگوشیاں اور اسکے سات''
وہ بچاری آلوؤں کو چھیلتی بے اختیار ہاتھ میں اپنے چبھو بیٹھی چھری کی تیز دھار
صبح کو گونجی فضا میں جب کسی بنسی کی لے اسکے سینے میں تڑپ اُٹھی کوئی بیتاب شے
ہاتھ سے چلتی ہوئی چکی کا دستہ چھٹ گیا اِک جہاں اسکے تصور میں بسا اور لُٹ گیا
اتنے میں ظالم چچی کی غیظ ناک آواز پر جھک گئی پھر سے وہ سنگِ آسیا کے ساز پر
کیوں نہ ہو اس دُکھ کی ماری کیلیئے جینا وبال اک چچی کے ہاتھ میں ہو جسکے گھر کی دیکھ بھال
باپ جس کا کارخانے میں کہیں مزدُور ہو اپنی اکلوتی جواں بیٹی سے کوسوں دُور ہو

جس کی ماں پھر لوٹ کر فردوس سے آئی نہ ہو
وہ ابھاگن! جس بچاری کا کوئی بھائی نہ ہو

(۱۹۴۰ء)

ملاقات

تم کو شہروں نے پکارا، سبزہ زاروں نے مجھے — تم کو پھولوں نے صدا دی اور خاروں نے مجھے
میں انہی پگڈنڈیوں پر بانسری چھیڑا کیا — بے ارادہ، جانے کس کا، راستہ دیکھا کیا
جب ندی پر ترمراتا شام کی مہندی کا رنگ — میرے دل میں کانپ اٹھتی کوئی ان بوجھی اُمنگ
جب کھلنڈری ہرنیوں کی ڈار بن میں ناچتی — کوئی بے نام آرزو سی میرے من میں ناچتی
ریت کے ٹیلے پہ سرکنڈوں کی لہراتی قطار — نیم شب! میں! اور میری بانسری! اور انتظار!
آہ یہ سرسبز میداں، دم بخود، لامنتہی — جن کی وسعت میں جوانی میری آوارہ رہی
بعد مدت کے تمھارا آج اِدھر آنا ہُوا — وہ زمانہ بچپنے کا، "آہ"، افسانہ ہُوا
کتنے سلجھے بال، کیسی نرم و نازک آستیں — ہنس رہے ہو؟ اِک تمھارا قہقہہ بدلا نہیں
مجھ کو دیکھو میں ابھی وابستۂ آغاز ہوں — ان حسیں ویرانیوں میں گوش برآواز ہوں
دوڑتی جاتی ہے دُنیا وقت کے محمل کے سات — میرے حصے میں وہی بیتاب دن، بےخواب رات
ڈھونڈتا ہوں، گم ہوئی ہے میری دُنیائے حسیں — ہاں، انہی پھیلے بیابانوں کے پچھّم میں کہیں!

ایک دن جب میرے مرنے کی خبر پائے گی وہ
میری تربت پر تو آئے گی، ضرور آئے گی وہ

(۱۹۴۱ء)

راجا پرجا

راجے کا کل آج !
سارا جہاں محتاج
سُکھ، دھن، باج، خراج
گدی، مسند، تاج
تیس برس کا راج
اور پھر اس کے بعد
اک روضہ ویراں

پرجا کا آج نہ کل
شاخ نہ پھول، نہ پھل
بھٹکے دل کا دَل
بھوکا، پیاسا، شل
لاکھ برس کا پل
اور پھر اس کے بعد
مٹتے گورستاں

راجا، پرجا کہاں ؟
اک بہتا طوفاں
کوہ عظیم و گراں
کاہِ سبک ساماں
جھونپڑیاں، ایواں
نغمہ اور فغاں
ہر شے اس میں رواں
ہر شے اس میں نہاں
اور پھر اس کے بعد
ایک وہی طوفاں

(۱۹-۱۲-۱۹۴۲)

کون؟

چاندی کی پازیب کے بجتے گھنگھروؤں سے کھیلے
ریشم کی رنگیں لنگی کی سُرخ البیلی ڈوری
نازک نازک پاؤں برقعے کو ٹھکراتے جائیں
چھم چھم بجتی جائے پائل' ناچتی جائے ڈوری!
ہائے سنہری تِلے کی گلکاری والی چپلی
جس سے جھانکے مست سہاگن مہندی چوری چوری
جانے کتنی سندر ہوگی روپ نگر کی رانی
اُف چپلی میں سکڑی سکڑی اُنگلیاں گوری گوری
جھونکوں کی خوشبو' ذرّوں میں نور لٹاتی جائے
مجھ بھاگوں کے مارے کی قسمت کوری کی کوری!

(۲۰-۱۲-۱۹۴۲)

صبح وشام

تجھ کو خبر ہے کتنی صبحیں
کتنی صبحیں بن گئیں شامیں
آرزوؤں سے مہکی صبحیں
بن کے پرانی پیاسی شامیں
ڈوب رہی ہیں ڈوب چکی ہیں
وقت کے طوفانی دریا میں
کتنی صبحیں کتنی شامیں

اب بھی رواں ہے ناؤ میری
اب بھی رواں ہے دھیرے دھیرے
دُور ہے اُمیدوں کا کنارا
دُور ہیں ارمانوں کے جزیرے
دُور، اُفق سے دُور، وہ دُنیا
جس کی فضا میں جھومیں جھامیں
نوریں صبحیں، رنگیں شامیں

ان صبحوں کو ان شاموں کو
کون مری دُنیا میں لائے
ہائے میری دُکھیا دنیا
جس کے اُجالے بھی ہیں سائے
وہ سائے جن کی ظلمت کو
سونپ چکی ہیں اپنی اگامیں
میری صبحیں میری شامیں

(۲۴-۱۲-۱۹۴۲)

غزل

کیا گریباں چاک صبح اور کیا پریشاں زلف شام
وقت کی لامنتہی زنجیر کی کڑیاں تمام

دیکھیے تنکے کی ناؤ کب کنارے جا لگے
موج ہے دہشت خروش اور سیل ہے وحشت خرام

شمع کے دامن میں شعلہ، شمع کے قدموں میں راکھ
اور ہو جاتا ہے ہر منزل پہ پروانے کا نام

زیست کی صہبا کی رو تھمتی نہیں، تھمتی نہیں!
ٹوٹتے رہتے ہیں نشے، پھوٹتے رہتے ہیں جام

(۱۹۴۲ء)

ارتھی

تو نے کیا دیکھا؟ تو نے کیا سمجھا؟
جب تری زندگی نواز آنکھیں
گوشۂ بام کی بلندی سے
فرطِ حیرت سے، دردمندی سے
جُھک پڑیں اُس ہجومِ گریاں پر
جو گزرتا تھا تیرے کوچے سے
ایک ارتھی اُٹھائے شانوں پر

چند سہمے سے پھول اور اک چادر
زندگی کی بہار کا انجام؟
بحرِ ہستی کی آخری منجدھار؟
تیرے حسن اور مرے جنوں کا مآل؟
اپنا احساس تھا کہ میرا خیال؟
میں نے دیکھا تو سوگوار سی تھی
تو نے کیا سوچا؟ تو نے کیا سمجھا؟

(۱۲-۱-۱۹۴۳)

حسینؓ

وہ شام، صبحِ دو عالم تھی جب بہ سرحدِ شام
رُکا تھا آ کے ترا قافلہ، ترے خیّام!
متاعِ کون و مکاں، تجھ شہید کا سجدہ
زمینِ کرب و بلا کے نمازیوں کے امام
یہ نکتہ تو نے بتایا جہان والوں کو!
کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیل اک گام
سوارِ مرکبِ دوشِ رسولؐ — پورِ بتولؓ
چراغِ محفلِ ایماں ترا مقدس نام!

(۱۳-۱-۱۹۴۳)

ہزاروں راستے ہیں

ہزاروں راستے ہیں منزلیں ہیں
سمندر اور صحرا بھی ہیں حائل
مگر رہبر ستارے کی شعاعیں
ہیں ہر رہرو کے سینے کی متاعیں
ہر اک کشتی سمجھتی ہے کہ تارا
رواں ہے ساتھ اس کے بن کے رہبر

تمھاری رَہ مری منزل الگ ہے
تمھارے دل سے میرا دل الگ ہے
سمندر اور صحرا ان میں حائل
کسے معلوم ہے یہ دو مسافر
کبھی اک دوسرے سے مِل سکیں گے
کبھی شاید یہ غنچے کھِل سکیں گے !

مگر دونوں کا رہبر ہے وہ تارا
جو اِک دن میرے حرفِ آرزو پر
تمھاری انکھڑیوں سے گر پڑا تھا
جبینِ وقت پر تاباں ہُوا تھا

شب و روز آئے اس کے بعد لاکھوں
ابھی تک اس کی کرنوں کے اشارے
صدا بھٹکے ہوؤں کو دے رہے ہیں
ہماری کشتیوں کو کھے رہے ہیں
ہمارے راستے کتنے الگ ہوں
ہماری منزلیں کتنی جُدا ہوں
مگر رہبر ستارا تو وہی ہے
امیدوں کا کنارا تو وہی ہے
(۱۸-۱-۱۹۴۳)

نعتیہ مثنوی

شہر مکہ بتوں کی بستی ہے
چار سو تیرگی برستی ہے

لو وہ اِک نور کی کرن پھوٹی
بزمِ آفاق جگمگا اُٹھی

دیکھنا اک یتیم بے ساماں
بے نوا، کم سخن، تہی داماں

جس نے یوں سال وسن گزارے ہیں
بھوک میں اپنے دن گزارے ہیں

پیرہن تن پہ تارتار اس کا
کوئی محرم نہ دوستدار اس کا

تپتی ریتوں پہ محوِ خواب کہیں
تیز کانٹوں سے زخم یاب کہیں

چلتی تیغوں کے درمیان کبھی
کنکروں سے لہولہان کبھی

ذرّہ ذرّہ عدوئے جاں اس کا
تشنۂ خوں ہے اِک جہاں اس کا

ہاں مگر لب جب اُسکے ہلتے ہیں
دل کے مرجھائے پھول کھلتے ہیں

جب وہ پیغامِ حق سناتا ہے
وجد میں دوجہاں کو لاتا ہے

جب وہ اُونچی صدا سے کہتا ہے
ہادیانہ ادا سے کہتا ہے

گمرہو! تم یہ کیا سمجھتے ہو
پتھروں کو خدا سمجھتے ہو

دل دہلتے ہیں قہرمانوں کے
دیئے بجھتے ہیں کفرخانوں کے

بات یہ کیا زبان سے نکلی
لاکھ تلوار میان سے نکلی

ظالموں کی اذیتیں اِک سمت
اور خدا کی مشیتیں اِک سمت

دیکھنا تیز دھوپ کی لَو میں
آندھیوں کی شرارہ گوں رَو میں

مکے سے دُور اور مدینے کے پاس
جا رہا ہے کوئی بہشت انفاس

جا رہا ہے وہ کوئی راہ نورد
دو جہاں اسکی پاک پلکوں کی گرد

سانڈنی پر سوار جاتا ہے
درمیانِ غبار جاتا ہے

ساتھ اک صدقِ جاں روانہ ہے
عشق کا کارواں روانہ ہے

سرِ مکّہ کچھ اور منظر ہے
مرتضیٰؓ ہے نبیؐ کا بستر ہے

شب ہے اندھیرا گھرا گھرا ہے
چار سُو قاتلوں کا پہرا ہے

وہ پیمبر کی چارپائی پر
ہنستا ہے بے سمجھ خدائی پر

سوئے یثرب نبیؐ کی باگ اُٹھی
کُفر کے خرمنوں سے آگ اُٹھی

روئے صحرا کے ٹیلے ٹیلے پر
آج قدغن ہے ہر قبیلے پر

اس طرف سے رسولؐ اگر گزرے
تو وہ کٹوا کے اپنا سر گزرے

آہ وہ راستہ بیاباں کا
خطِ نوری جبینِ ایماں کا

اس کی پاکیزہ خاک کیا کہنا !
خاک اور تابناک کیا کہنا !

جس کے ذروں کو رشکِ ماہ تمام
کر گیا ناقۂ نبیؐ کا خرام

نقشِ پا دے کے جس کے سینے کو
میرا آقاؐ گیا مدینے کو

کاش وہ خاک مجھ کو مل جائے
سُرمۂ پاک مجھ کو مل جائے

میں اِسے رکھ کر آنکھ کے تِل میں آنکھ کے تِل میں، دیدۂ دل میں
جگمگاتا پھروں زمانے میں زندگی کے سیاہ خانے میں

جو نبیؐ کے قریب ہیں وہ لوگ کس قدر خوش نصیب ہیں وہ لوگ
اسکے قدموں کے ساتھ رہتے ہیں اس کی موجوں کے ساتھ بہتے ہیں
اسکے ابرو کے ہر اشارے پر تیرتے ہیں لہو کے دھارے پر
اسکی عزت پہ سر کٹاتے ہیں آخری وقت مسکراتے ہیں
انکے قدموں میں دولتِ کونین انکا ایک ایک سانس بدر وحنین
ہاں وہ دیکھو بلالؓ کی حالت چور زخموں سے خون میں لت پت
گرم ریتی پہ تلملاتا ہے تازیانوں کی چوٹ کھاتا ہے
موت کا خوف ہے نہ زیست کی فکر اس کے ہونٹوں پہ لَا اِلٰہ کا ذکر

دیکھنا جنگ اُحد کی جاری ہے وقت اسلامیوں پہ بھاری ہے
چارسو کافروں کا ریلا ہے ابن سکن زیادؓ اکیلا ہے
اُس نے دیکھا کہ چند پیکرِ شر وار کرنے کو ہیں محمدؐ پر
دوڑ کر آکے درمیانِ نبیؐ جان دے کر بچائی جانِ نبیؐ
لاش اس کی اُٹھا کے لاتے ہیں سامنے مصطفیٰؐ کے لاتے ہیں

ابھی کچھ اس میں ہوش باقی ہے — اک نفس کا خروش باقی ہے
دمِ آخر کے وقتِ مشکل میں — ابھی کچھ آرزو سی ہے دل میں
اپنے سینے کے بل گھسٹتا ہے — پائے محبوبؐ سے چمٹتا ہے
اُن کے قدموں کو چوم لیتا ہے — مسکراتا ہے جان دیتا ہے
آہ یہ رُتبۂ فدائے نبیؐ — آخری سانس اور بہ پائے نبیؐ
آہ یہ شمعِ حق کے پروانے — دُرجِ انسانیت کے دُردانے
کیا محبت ہے کیا ارادت ہے — موت اُن کیلئے عبادت ہے

جنگِ موتہ کا اِک سماں دیکھو — زیدؓ کے ہاتھ میں نشاں دیکھو
زیدؓ وہ اک غلام پاک نہاد — جس کو اسلام نے کیا آزاد
جب نبیؐ کی اسے غلامی ملی — دونوں عالم میں شادکامی ملی
ہر گھڑی، راحتوں میں، صدموں میں — ہے وہ شاہِ عرب کے قدموں میں
یہ ہے رنگِ اُخوت اسلام — آج سردارِ فوج ہے وہ غلام
وہ جری تیس سو سپاہ کے ساتھ — لڑتا ہے فوجِ بے پناہ کے ساتھ
ہو محبت رسولؐ سے جس کو — لائے خاطر میں وہ بھلا کِس کو
اس کی ہمت کو کون ٹوک سکے — اس کے طوفاں کو کون روک سکے
ہیں رواں زندگی کے ہنگامے — تسمہ اس کی رکاب کا تھامے

جو کچھ اس محفل حیات میں ہے — اسکی باگ اسکے پاک ہات میں ہے

موت اس کیلئے ہے شیریں جام — آخری گھونٹ اور عمر دوام

آرہی ہے وہ فتحیاب سپاہ — لاشِ زید شہیدؓ کے ہمراہ

میرِ لشکر نہیں ہے لشکر میں — صفِ ماتم بچھی ہے گھر گھر میں

وہ گہراب نہیں خزینے میں — ایک کہرام ہے مدینے میں

آب گوں دیدۂ پیمبرؐ ہے — مرنے والے کا کیا مقدر ہے

اسکے زخموں کا خون چہرے کی دھول — پا رہی ہے نبیؐ کی آنکھ سے پھول

وہ عدم کی طرف روانہ ہے — ساتھ یہ بے بہا خزانہ ہے

اس کی بچی کو دیکھ کر رنجور — اسکے اشکوں کو چومتے ہیں حضورؐ

باپ کا صدمہ کیا پڑا اُس پر — جُھک پڑی رحمتِ خُدا اُس پر

رحمتِ دو جہاں کے سائے میں — فرق کیا اپنے اور پرائے میں

جس کے سر پر نبیؐ کا سایہ ہے — اسکی دُنیا ہے اس کی مایا ہے

اس کا جینا ہے اس کا مرنا ہے — ڈوب کر بھی اُسے اُبھرنا ہے

ایک منزل ہے اس کے ایماں کی — سربلندی مقام انساں کی

لو لگا کر خُدا کی ہستی سے — آدمی کو اُٹھانا پستی سے

رُوح میں شورشیں زمانوں کی — سانس میں کروٹیں جہانوں کی

دل میں سامان سو اُجالے کا — ہاتھ میں پلو کملی والے کا

(۲۶-۳-۱۹۴۳)

زندانی

دردوں کے مارے دو قیدی !
زنجیروں کی چھنکاروں میں
اک غم گیں سا ' اک حیراں سی
کالی کالی کوٹھڑیوں میں
دونوں کی نظروں پر پہرے
ہونٹوں پر مہریں چسپاں سی
لاکھوں آرزوئیں ' اُمیدیں
دوزخ کے ناگوں کی صُورت
سینوں میں غلطاں غلطاں سی
سہمے سہمے سے قدموں کی
آہٹ کان میں آجاتی ہے
آہٹ ! مدھم سی ' بے جاں سی
تو اِک چرخے کی گھوں گھوں میں
گُم سی ہو کر رہی جاتی ہے
خوف زدہ ' پُرمعنی کھانسی
پھر وہی جلادوں کی نگاہیں
پھر وہی سنگینوں کی نوکیں
پھر وہی خنجر ' پھر وہی پھانسی

(۱۱-۵-۱۹۴۳)

ریڈنگ روم

میز پر اخبار کے پھیلے ورق
بکھرے بکھرے، تیرہ تیرہ، چاک چاک
ڈھل گئی ہے قالبِ الفاظ میں
سینۂ ہستی کی آہِ درد ناک
پاس ہی دیوار کو ٹیکے ہوئے
ریڈیو گرمِ سخن ، محوِ بیاں
چیختی ہیں جامۂ آواز میں
خون کے چھینٹے، لہو کی بوندیاں

شام ریڈنگ روم کی مغموم شام
چند کان ، اعلانچی کی بات پر
چند آنکھیں، سوچ میں ڈوبی ہوئیں
مرتکز ، اخبار کے صفحات پر
ایک کمرے میں سمٹ کر آگئے
کتنے دکھڑوں کے صداپیکر حروف

کتنے دردوں کے مسطر زمزمے
کتنے اندھے گیانی، بہرے فلیسوف!

پھر بھی کچھ ادراک میں آتا نہیں
کیا ہے رقصِ گردشِ ایام، کیا!
اِک شکستہ ناؤ اِک خونی بھنور
کیا ہے اس افسانے کا انجام، کیا؟
یہ مفکر کچھ سمجھ سکتے نہیں!

چھت کے نیچے، روزنوں کے درمیاں
گول گول آنکھوں کے اندر محوِ دید
کالے پارے کی مرقص پتلیاں

کاش یہ حیراں کبوتر جانتے
خفتہ ہے ان کاغذوں کی سطح پر
کتنے پھنکتے آشیانوں کا دھواں
کتنے نخچیروں کی آہوں کے شرر
ہیں ان آوازوں کے اندر پرکشا

کتنے کرگس، جن کو مرداروں کی بو
کھینچ لائی ہے سرِ دیوارِ باغ !
چھت کے نیچے، مضطرب، نظارہ خو
فکر مند آنکھوں میں حیراں پتلیاں

یہ کبوتر، دیکھتے تھکتے نہیں
دیکھتے ہیں-سوچتے ہیں-کیا کریں-
یہ مفکر کچھ سمجھ سکتے نہیں !

(۱۰-۱-۱۹۴۴)

لاہور میں

ڈاک خانے کے ٹکٹ گھر پر خریداروں کی بھیڑ!
ایک چوبی طاقچے پر کچھ دواتیں — اِک قلم
یہ قلم میں نے اُٹھایا اور خط لکھنے لگا:-
''پیارے ماموں جی!
''دُعا کیجیے — خدا — رکھ لے — بھرم
''آج انٹرویو ہے! - کل تک فیصلہ ہو جائے گا
''دیکھیں کیا ہو؟ مجھ کو ڈر ہے...........''
اتنے میں تم آ گئیں!
'' اک ذرا تکلیف فرما کر پتہ لکھ دیجیے''
میں نے تم سے وہ لفافہ لے لیا، جھجکا نہیں،
''بے دھڑک'' لکھ ڈالا میں نے ''کانپتے ہاتھوں'' کیساتھ
مختصر، رنگیں پتہ: ''گلگت میں - گوہر خاں کے نام!''
''شکریہ'' - ''جی کیسا؟'' - اِک ہنستی نگہ زیرِ نقاب
ڈاک میں خط — تانگہ ٹمپل روڈ کو — قصہ تمام!

(۱۲-۳-۱۹۴۴)

غزل

آ ، سازِ گلستاں کو بہ مضرابِ خار چھیڑ
مطرب ، کوئی ترانہ بیادِ بہار چھیڑ

سوئے ہوئے سکوتِ چمن کو ذرا جگا ،
کچھ تو — نواطرازِ غمِ روزگار — چھیڑ

کل یہ جگہ تھی وادیٔ نکہت ، رباب اُٹھا
کل یاں ہجومِ گل تھا ، سرودِ بہار چھیڑ

قِصہ کوئی بہ ماتمِ جام و سبو سنا
نغمہ کوئی بہ تعزیتِ سبزہ زار چھیڑ

کچھ بھی نہ ہو خزاں تو ہے ، اک راگنی الاپ
ہر خس ہے ایک سازِ نوا در کنار چھیڑ

شاید پلٹ کے آنہ سکے اب بہار ، گا
پژمردہ شاخسار پہ جھک کر ستار چھیڑ

(۲۷-۱۱-۱۹۴۴)

قبلا خاں

ظانادو میں قبلا خاں کے رنگ محل کے سائے
لرزیں اس دیوانی ندی پر جس کی مقدس موجیں
گہری اور اتھاہ دراڑوں کے سینوں کو ڈستی
گھور اندھیروں کے ساگر میں بسالیں اپنی بستی
دُور دُور تک سونا اگلتی دھرتی کا پھیلاؤ
جس کے چاروں اور فصیلیں، گنبد اور منارے
باغ — جو ہنستی آب جُوؤں کی چنچلتا سے چمکیں
بوجھل بوجھل خوشبوؤں سے لدے پھندے اشجار
بوڑھے جنگل — جیسے پرانے پہاڑوں کے ہمزاد
کہیں کہیں جن کی وسعت میں
دھوپ میں لپٹے سبزہ زار

اوہ! وہ دیکھو
گھنے گھنیرے پیڑوں کے اس پار
سبز چٹانوں کے سینوں میں گھرے بھیانک غار
ہیبت ناک مقام
رسی بسی پاکیزگیوں کا ایک فسونِ دوام

جیسے ڈھلتے چاند کی پیلی چھایا میں گھل جائیں
برہا کی اگنی میں جل مٹنے والی اک دیواداسی کی پرچھائیں
یہی وہ غار یہی وہ گھاؤ
جس کی تھاہ سے اُچھلے کھولے
ایک اُبلتے چشمے کی اَن تھک آوازوں کا وہ الاؤ
جو دھرتی کی ہانپتی چھاتی میں بے کل سانسوں کی مانند
تڑپے اور تڑپتا جائے
جس سے جھم جھم برسیں
جلتی چٹانوں کے سیال انگارے
جیسے تپتے توے پر بھجتے دانوں کی کلپاہٹ
انہی اُچھلتی چٹانوں کے جُھرمٹ سے اُبھر کر ڈوبے
وہی مقدس دریا جس کی موجیں
گہری اور اتھاہ دراڑوں کے سینوں کو ڈستی
گھور اندھیروں کے ساگر میں بسالیں اپنی بستی
یہی ہے وہ ہنگامۂ صوتِ سنگ و فروش دریا
جس کے روپ میں قبلا خاں کے کانوں سے ٹکرائیں
گزرے بلوانوں کی صدائیں
جنگ کے نقارے کی دھم دھم

(۱۹۴۴ء؟)

ایک دُعا

(جسے درجہ ٔ قبولیت نصیب ہوا)

خلاقِ دو جہاں! مری آنکھوں کو نور دے
چھینی ہوئی یہ دولتِ کیف وسرور دے
پھر قوت نظارۂ دشت و دیار بخش!
پھر طاقت مشاہدۂ نزد و دُور دے
مجھ پر نگاہِ مہر "سَمِیُع" "بَصِیُر" کر
مجھ کو نویدِ لطف خدائے غفور دے
اللہ! مجھ کو دیدۂ بینندہ کر عطا
مولا! تو ہی دوائے دلِ ناصبور دے
پھر سونپ میری آنکھوں کو آنکھوں کی روشنی
یہ میری چیز پھر مجھے دے اور ضرور دے

(۲۲-۱۲-۱۹۴۶)

غزل

ضمیر راز داں ہے اور، میں ہوں
جہاں اندر جہاں ہے اور میں ہوں

در پیر مغاں ہے اور میں ہوں
وہی رطل گراں ہے اور میں ہوں

وہی دورِ زماں ہے اور میں ہوں
وہی رسمِ فغاں ہے اور میں ہوں

فریبِ رنگ و بو ہے اور تم ہو
بہارِ صد خزاں ہے اور میں ہوں

جہاں ہے — اور سکوت نیم شب ہے
مرا قلبِ تپاں ہے اور میں ہوں

یہ دو ساتھی نہ جانے کب بچھڑ جائیں
مری عمر رواں ہے اور میں ہوں

(۴-۲-۱۹۵۰)

غزل

چمن چمن میں بہ طغیان رنگ لالہ پھرو
ختن ختن میں بہ انبوہِ صد غزالہ پھرو

سجا کے ہونٹوں پہ اِک جشن زہر خند چلو
چھپا کے سینے میں صد موجِ آہ و نالہ پھرو

روش روش پہ بچھی ہے سیاہیوں کی بساط
پلک پلک پہ جلا کر چراغِ لالہ پھرو

چکید اشک فراواں سے ہے کشید شراب
جہانِ قیصر و جم میں تہی پیالہ پھرو

کنارِ دل سے گزرتی اُداس راہوں پر
ہر ایک سانس ہے عمر ہزار سالہ پھرو

(۱۹۵۰ء)

مشرق و مغرب

نہ خوابِ مشرق
نہ سحرِ مغرب
بس اِک پھبکتی گداز مٹی
کی چادرِ سبز، جس کے دامن
میں کل تھے انبانِ گندم و جو
اور آج انبارِ سیم و آہن

یہ کون سمجھے
یہ کون جانے
کہ اس تڑپتے ہوئے زمانے
کے سائے میں ڈولتی سی شمعوں
کی روشنی، جو پیالہ گل
صراحی سنگ، کوزۂ مس
کو پھاند کر، شہر و دشت و ساحل
سے اُٹھتے گرز و سنان و خنجر

پہ جم گئی تھی — وہ کانپتی لَو
جو آج بھی طاقِ زندگی پر
سلگ رہی ہے، اسی کا پرتو
جہانِ نو کے فروغِ منزل
میں ڈھل گیا ہے
عجیب قصہ ہے ضربِ خارا
سے ذہن فولاد جل اُٹھا ہے

نہ کوئی مشرق
نہ کوئی مغرب
مگر وہ اک زینۂ مراتب
جو اَن گنت، بے زباں غلاموں
کی ٹوٹتی پسلیوں، پہ، کل بھی،
ہزار کف در دہاں خداؤں
کے بوجھ سے کچکچا رہا تھا
اور آج بھی اک وہی ترازو
کہ جس میں زنجیر پوش روحوں
کے شعلہ اندام دست و بازو

بہ مژدیک اشک، تل رہے ہیں
اگر یہی تھا نصیبِ دوراں
یہ نالۂ غم، یہ اک مسلسل
خروشِ انبوہِ پابجولاں
ازل کی سرحد سے نسل آدم
کی یہ کراہیں، جو روز و شب کے
عمیق سناٹے سے پیہم
اُبھر رہی ہیں، یہ چشم و لب کے
فسانہ ہائے سرشک و شیون
اگر مقدر یہی تھا اپنا
تو یہ مقدر یقین جانو اٹل نہیں تھا

یہی ہے مشرق
یہی ہے مغرب

وہ پارہ ہائے سفال و خارا
وہ عقلِ حیراں کی کارگاہیں
وہ جنسِ نایاب، کل ہمارے
جہانِ صد ریزۂ خزف میں

ہماری دولت تھے، ہم خدا تھے
اور آج بھی یہ شرار پیکر
حقیقتوں کے طلسمِ سوزاں
یہ وسعت بحر و بر میں غلطاں
ضمیر آہن کی جلتی سانسیں
یہ ذرّے ذرّے کے قلب پیچاں
میں کھولتی قوتوں کے طوفاں
زمانہ ہے جن کی رو میں تنکا
جو آج بھی ہو وجود ان کا
ہماری مٹھی میں، ہم خدا ہیں
سیاہیوں کے چھلکتے خُم سے
اُبھرتی کرنوں کا حوصلہ ہیں

(۱۲-۳-۱۹۵۱)

ایک شام

ندی کے لرزتے ہوئے پانیوں پر
تھرکتی ہوئی شوخ کرنوں نے چنگاریاں گھول دی ہیں
تھکی دھوپ نے آ کے لہروں کی پھیلی ہوئی ننگی باہوں پہ اپنی لٹیں کھول دی ہیں!

یہ جوئے رواں ہے
کہ بہتے ہوئے پھول ہیں جن کی خوشبوئیں گیتوں کی سسکاریاں ہیں
یہ پگھلے ہوئے زرد تانبے کی چادر پہ اُلجھی ہوئی سلوٹیں ہیں
کہ زنجیر ہائے رواں ہیں!

بس اک شورِ طوفاں!
کنارا نہ ساحل!
نگاہوں کی حد تک
سلاسل! سلاسِل!
کہ جن کو اٹھائے ہوئے ڈولتی پنکھڑیوں کے سفینے بہے جا رہے ہیں
بہے جا رہے ہیں
کہیں دُور ان گھور اندھیروں میں جو فاصلوں کی ردائیں لپیٹے کھڑے ہیں
جہاں پر اَبد کا کنارا ہے ـــــ اور اِک وہ گاؤں:
وہ گنّے کے کیاروں پہ آتی ہوئی ڈاک گاڑی کے بھورے دھوئیں کی چھلچھلتی سی چھاؤں!

(۱۹۵۱-۱۲)

منزل

اس ایک بات سے انکار ہو نہیں سکتا
کہ ہم نے اپنے لہو سے، بساطِ عالم پر
لکیر کھینچی ہے جس سلطنت کی، اس کا وجود
ہے ایشیا کے شبستاں میں، صبحِ نو کی نُمود!

یہ سب بجا ہے، کہ ہم جن جگر کے ٹکڑوں کو
بہ شہر و قریہ، بہ دشت و چمن، بہ کوچہ و بام
بھڑکتی آگ میں بہتے لہو میں چھوڑ آئے
وہ روحیں، جن کے سیہ پوش، ماتمی سائے
ہمارے ہنستے ہوئے پیکروں سے لپٹے ہیں
وہ قافلے، کہ جنھیں مہلت سفر نہ مِلی
انہی کے سڑتے ہوئے لوتھڑوں کی ہونکتی بو
انہی کی ڈوبتی فریادیں، چیختے آنسو
ہمارے محلوں کے نغمے، ہمارے باغوں کے پھول!

مگر یہ پھول، یہ نغمے، یہ نکہتوں کے ہجوم
سحر سحر کو اگر مشکبار کر نہ سکے
نَفَس نَفَس کو امینِ بہار کر نہ سکے
وہ جن کے واسطے یہ گلستاں سجایا گیا
گراس طرح تہی داماں، تہی سَبَد ہی رہے
تو سوچ لو کہ یہ نازک، لطیف پرتوِ نور
یہ لڑکھڑاتی ہواؤں میں ٹھہرا غرور
ہزار ساعت بے برگ کے بیاباں میں
یہ اک امنگوں بھری سانس!

اس کا مستقبل؟
ہماری زندگیوں سے اِک اِک تڑپ لے کر
پروئے ہیں جو فلک نے، بہ سلکِ شام وسحر
گلوئے غم کے لئے، چہرۂ طرب کے لئے
سدا بہار ارادوں کے ہار

ان کا مآل؟

یہی سوال ہے رازِ غم زمان و زمیں!
حضور! ان کا جبین پرشکن جواب نہیں

(۱۲-۱۹۵۱)

دُھوپ چھاؤں

ناچتی ندیاں
جُھومتے جھامتے پیڑ
اُجیالی دھوپ
ان سے بھی آگے، دُور کہیں وہ دُنیا
جس کا رُوپ
آنے والے مست دنوں کے ہونٹوں پر مُسکان!
سمے سمے کا دھیان!

پھیکی پھیکی چاندنیاں
اور کجلی کجلی دُھوپ
جن کی اُڑتی راکھ میں جھلکے بیتے دنوں کا رُوپ
سناٹوں کی گھمر گھمر میں ڈوبتا ڈوبتا گیت
سمے سمے کی ریت

من کی یہ چنچل لہریں، ان کا کوئی نہ ٹھور مقام
دن گزرے تو صبح سویرا، رات کٹے تو شام
ساون ساون، جلتے جھونکے
پلک پلک، برسات
سمے سمے کی بات

(۱۲-۱۹۵۱)

اکھیاں کیوں مسکائیں

کون بتائے رُوپ نگر کی سکھیاں اکھیاں کیوں مسکائیں'
دل کے راگ محل کی تانیں'
سندیسوں کے دیس سے ہو کے
پائل کی جھنکار کو رو کے
جب ہونٹوں کے دروازوں پر' چھپ چھپ آئیں' رُک رُک جائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

چھاند کے سناٹوں کے جزیرے
مہر بلب سانسوں کے بیاباں
آن بسیں جب رقصاں رقصاں
اِک لمحے کے رین بسیرے میں ارمانوں کی پرچھائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

گھونگھٹ کھولے، نہ منہ سے بولے
من کی بانی، چنچل رانی،
جب یہ کہانی، دُور انجانی
دنیاؤں سے گزرے بن کر دھیمی بانسریوں کی صدائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

(۸-۱۲-۱۹۵۲)

ایک خیال

تمھارے ہونٹ وہ گھلتے سے ریزہ ہائے نبات
مرے لبوں سے ملے، جھکتی جھکتی پلکوں کے سات
تو جھونکے جھونکے میں لہرا گئی شمیمِ حیات

کسے خبر، کہ پھسلتا ہوا وہ جسم حسیں
مری بھنچی ہوئی باہوں کی دولتِ رنگیں
اب اس کی خاک بھی خاکِ لحد میں ہے کہ نہیں

تمھاری گردِ کفن اور ہجوم کرمکِ گور
مصاحبانِ اجل، گنگ و پابریدہ و کور
بس ایک مری نوائیں، تمھاری روح کا شور

میں زندہ ہوں تو مری زندگی تمھاری حیات
وگرنہ یوں تو ہے کس کو دوام، کس کو ثبات
نفس نفس، سرِ ظلمات، پرتوِ ظلمات

(۸-۶-۱۹۵۳)

جیون دیس

مجھے یقیں تھا
میں جانتا تھا
کہ اس اندھیرے گھنیرے جنگل میں جس کے شانوں
پہ تیرتے بادلوں کے سائے — سیاہ گیسو
بکھر گئے ہیں، ضرور کرنوں لدے جہانوں
کا کوئی پرتو، ڈھلی ڈھلی دھوپ کا تبسم
کہیں درختوں کے مخملیں سبز سائبانوں
سے چھن کے اس نغمہ رو ندی پر جھلک اُٹھے گا
جو آنکھ اوجھل مسرتوں کے حسین ٹھکانوں
کی اوٹ سے پھوٹتے اُجالوں میں بہہ رہی ہے
مرے خیالوں میں بہہ رہی ہے!

یہ کون جانے
یہ کون سمجھے
کہ جب بھی اس گھومتی زمیں پر کسی سہانے
سمے کی دھن میں، اٹھی ہیں ترسی ہوئی نگاہیں
تو ذرّے ذرّے میں زندگی کے نگار خانے
کی جگمگاتی ہوئی سگندھیں سما گئی ہیں
اَبد کی خاموشیوں میں ڈوبے ہوئے ترانے
ندی کے سینے سے موج بن کر گزر گئے ہیں
مرے خیالوں میں بھر گئے ہیں

(۱۹۵۳ء)

نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیم طرب

کیا کہوں، کتنے غموں، کتنے غموں کی شکن آلود بساط
وقت کے گھومتے زینوں پہ مرے رُکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح بچھتی لپٹی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں یہ کہانی بڑی طولانی ہے

یہ مرا قصۂ غم کون سنے ؟ کس کو سناؤں — کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں — جس کو
پیتے پیتے مری اِک عمر کٹی ہے اِک عمر
دیکھتے ہو وہ جو اک جادؤ نورانی ہے

وہ جو اک موڑ ہے اور وہ جو جھروکا ہے سر بام بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند
وہ جو جھکتی ہوئی مڑتی ہوئی دیواریں ہیں
جن کا منصب انہی گلیوں کی نگہبانی ہے

وہ جو ہر شام انہی گلیوں میں کوئی مست سی لے
بند ہوتے ہوئے دروازوں کے آہنگ میں گھل جاتی ہے
وہ خموشی، سفرِ شب کے تسلسل کی نقیب
جسکی میت پہ اندھیروں نے ردا تانی ہے
میں نے اک عمر اسی معمورۂ ظلمات میں رقصاں، جولاں
ہر قدم اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں، لرزاں
جگر جام سے چھینے ہوئے نشوں میں مگن
خاک ان راہوں کی یوں خاک بہ سر چھانی ہے
جس طرح ایک سہارے کی تمنا میں کسی ٹوٹتے تارے کی حیات
مہ و انجم کے سفینوں کی طرف اپنے بڑھائے ہوئے ہات
خمِ افلاک سے ٹکرا کے بھسم ہوجائے
(ان خلاؤں میں کسے تاب پرافشانی ہے!)

میں بھی پلکوں پہ امنگوں کے دیے لے کے گرجتے ہوئے طوفانوں میں
منتظر تھا کہ اچانک کہیں باغوں میں، بیابانوں میں
آ کے بس جائے کسی نغمۂ شیریں کی بہار!
یہ مرے گرد جو پھیلی ہوئی ویرانی ہے

کب یہاں ریزۂ صد ساغرِ بشکستہ سے کلیاں پھوٹیں
میں نہیں کہتا کہ کلیاں نہیں مہکیں مرے گلزاروں میں

مجھ کو یہ غم ہے وہ اک لمحۂ نایاب کہ جو
حاصل سلطنتِ عالمِ امکانی ہے
جب مری زیست سے ٹکرا کے بھسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہُوا
تب میں سمجھا، کہ یہ راہیں، یہ گھروندے، یہ پھبکتی دنیا
اب یہ سب کچھ غمِ جاوید کی اِک دھڑکن ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغل مگس رانی ہے

آج بھی جب کہیں رستے میں، کسی موڑ، کسی منزل پر
کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن کہ جسے نازِ گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لئے اُڑتا ہے سمٹتا ہے تو دھیرے دھیرے
کوئی لے سی مرے احساس میں بھر جاتی ہے
تارِ بربط کی کوئی لرزش پنہانی ہے

جو شب و روز کے ایواں میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے، زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو، کس کی یہ آواز ہے، پہچانی ہے؟

''یوں کب تک صبح و شام جلیں
بے سُود جلیں، ناکام جلیں
جب دنیا والے سو جائیں
میٹھے سپنوں میں کھو جائیں......
جب چلتے دریا تھم جائیں
تاروں کی نگاہیں جم جائیں
جب آگ بجھے چوپالوں کی
جب آنکھ لگے رکھوالوں کی
دیوار و در سے چمٹتے ہوئے
سائے کی طرح سمٹتے ہوئے
دو بھک منگوں کے بھیس میں ہم
جا نکلیں اک اور دیس میں ہم
کچھ دور، اُفق کے پار، اُدھر
ہے ایک نیا سنسار، ادھر
خوشیوں کی سنگاروں کی دُنیا
پھولوں کی بہاروں کی دُنیا''

آج اس فرصتِ یک گام کو روتا ہوں جب اک لغزش پا

چھین کر لے گئی مجھ سے وہ امنگوں سے چھلکتی دُنیا

آہ وہ دُنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
یوں تو آفاق میں دنیاؤں کی ارزانی ہے
ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں، خورشید بھی ہے، ماہ بھی ہے
کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے
لیکن اک دنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
جس کے ماتم میں مری چاک گریبانی ہے
میری سم خوردہ تمناؤں کی نظروں سے گریزاں ہی رہی
لاکھ ڈھونڈھا، مگر افسوس کہ اک رنج پشیماں نگہی
بوجھ بن کر مری تقدیر کی پلکوں پہ رہا
اب مرا دل ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
اب یہ دُنیا، یہ صدا کوش نصیبوں سے بھرے شہرو دیار
غموں خوشیوں کے جھمیلوں میں نہاتی ہوئی روحوں کا نکھار
مجھ سے پوچھو تو مرے سامنے اب یہ دُنیا
ورقِ مصحفِ اندوہِ گراں جانی ہے

سوچتا ہوں یہی دو گھونٹ جو میں نے خُمِ دوراں سے پیے
یہی دو سانس، شبستانِ ابد میں یہی دو بُجھتے دیے——
دوش و فردا کی فصیلوں میں یہی دو رخنے
یہی جو سلسلۂ زندگیِ فانی ہے

کیا اسی ساعتِ محرومیٔ غم تاب کی خاطر میں نے
وسعتِ وادیٔ ایام میں کانٹوں کے قدم چومے تھے ؟
لاکھوں دُنیاؤں کے لٹتے ہوئے کھلیانوں سے
میرا حصہ یہی میری تہی دامانی ہے ؟

کیا اسی واسطے ماضی کے نخستانوں سے اک موجِ حیات
اپنے ہمراہ لیے ناچتی گاتی ہوئی صدیوں کی برات
آکے اس ساحلِ گل پوش سے ٹکرائی ہے؟
کیا یہی مقصدِ صد عالمِ امکانی ہے
کہ جب اس سطحِ خروشندہ پہ ڈھونڈھوں میں کوئی رختِ طرب
کوئی مکھ، کوئی نگہ، کوئی تبسم، کوئی جینے کا سبب
آسمانوں سے صدا آئے "تو کیا ڈھونڈھتا ہے
تیرا ساماں تو یہی بے سروسامانی ہے"

عقل حیران ہے، یہ طرفہ حجاباتِ حریمِ اسرار
عقدہ راحت و غم، رازِ جہانِ گل و خار
پا بہ زنجیر ارادوں کا خروشِ پیہم
یہی مستقبلِ معمورۂ انسانی ہے ؟
کس کی فتراک میں ہیں عرشِ بریں فرشِ زمیں؟ کون کہے
پس صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں ؟ کون کہے —

جانے کن گہرے دھندلکوں سے ضیا پاتی ہے
درحقیقت یہ حقیقت کی جو تابانی ہے
اتنے زخموں سے سجا کر دلِ بے تاب کی پژمردہ جبیں —
کس نے بھیجا ہمیں اس جلتے ہوئے دیس میں؟ معلوم نہیں!
یوں نہ اپنے دمِ امید کو بہلائے کوئی'
کون کہتا ہے گلستان میں بہار آنی ہے

جی میں آئی ہے کہ اک بارِ غمِ زیست پہ احساں دھر کر
دیگِ گردوں میں اُبلتے ہوئے زہراب سے اِک خُم بھر کر
(دیگِ گردوں کہ اَبد زنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامہ لافانی ہے)
اسی زہراب سے خُم بھر کے چِھڑک دُوں اُفقِ دوراں پر
آگ ہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پر

اب یہی دھن ہے کہ اس ظلمتِ بے پایاں کو
جو مری روح کے ایوان کی زندانی ہے

اُٹھ کے پھیلا دوں انہی اُونچے درختوں سے ڈھکی راہوں پر
انہی گدرائی ہوئی دھوپ میں لہراتی چراگاہوں پر

اب ارادہ ہے کہ ان بس بھرے ارمانوں کو
جنکے سایوں میں مری زیست کی ویرانی ہے
گھول دوں جھومتے جھونکوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
سینہ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں

چاہتا ہوں کہ یہ زیتون کے جنگل کا سکوت
جس کی وسعت ہے کہ اِک عالمِ حیرانی ہے
میری کھوئی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے تھرا اُٹھے——

اب یہ ٹھانی ہے کہ جمتی ہوئی بوندوں کے یہ بیکل چھینٹے
تیز جھالوں کے یہ چابک سے کہ جن کی زد پر
کبڑے رستوں کی تھکی پیٹھ کی عُریانی ہے
یہ دھواں دھوپ ترائی' یہ دھواں دھار پہاڑوں کی فصیل
دُور تک چوٹیوں اور بدلیوں کے دیس کی سرحدِ جمیل
برف سی بدلیاں' جن کے لب تر سے پیوست
برف کی چوٹیوں کی دودھیا پیشانی ہے
ہاں یہ سب سلسلہ رنگ' یہ گہوارۂ حسن و افسوں——
میں اسے اپنی دُکھی روح کی ان راگنیوں سے بھر دوں

جن کی لہریں کبھی آنسو ہیں، کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ کبھی پانی ہے

کوئی غایت، کوئی منزل، کوئی حاصل سفرِ ہستی کا —
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا ؟ —
کوئی مشعل بھی نہیں کوئی کرن بھی تو نہیں
شب اندھیری ہے گھٹا ٹوپ ہے، طوفانی ہے
بولو اے نغمہ سرایانِ تحیر کدۂ کاہکشاں
میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں ؟

نغمہ کواکب

دائموس:

ناچ ناچ جھوم جھوم
گھوم گھوم گھوم گھوم
دیکھنا ادھر ضرور اک نظر
ناچتا ہے نزد و دور بے خبر
دامن نگارِ نور تھام کر
کہکشاں کے موڑ پر فاصلوں کا اک ہجوم
ناچ ناچ گھوم گھوم

وسعت ابد پناہ　　اِک ترنگ
عالمِ شب سیاہ　　اِک امنگ
منزلیں، نشان راہ　　سحرِ رنگ
شعلہ شعلہ انگ انگ　　آگ آگ روم روم
گھوم گھوم　　گھوم گھوم

فیبوس:
دیے جلتے رہے دیے جلتے رہے
گھُم گھُم اُڈے دھوئیں کے دَل
جُگ جُگ پھیل گئے کاجل
دم دم، دھم دھم، گرے محل
مٹتی ہوئی صدیوں میں پل
ڈھلتے رہے
دیے جلتے رہے!

کتنے زمانے، کتنے سپن
توڑ گئے اپنے درپن
نیر بہاتے رہے نین

وقت کے جھکڑ گگن گگن
جلتے رہے
دیے جلتے رہے !

اندھیاروں کے زہر پیے
آنکھوں کو گل رنگ کیے
اَمر اُجالے لو میں لیے
جیون کی منڈلی میں دیے
جلتے رہے
دیے جلتے رہے !

اُرناؤس :

بھنور بھنور مری نوکا

کوئی ساحل ہے نہ کنارا
اِک پھیلتا بڑھتا دھارا
بہے نگر نگر مری نوکا ' بھنور بھنور

ہر آن رُتوں کا میلہ
ہر سمت سمے کا ریلا
چلے گھمر گھمر مری نوکا ' بھنور بھنور

بوجھ اتنے ہیں کڑیل جن کے
یہ دُکھ سکھ، بہتے تنکے
گریں اُبھر اُبھر مری نوکا، بھنور بھنور
کہتی ہوئی من کی بانی
تقدیر جہاں کی رانی
پھرے سنور سنور مری نوکا، بھنور بھنور

پلوطو:
کتنی اندھیری رات ہے چمکو
چمکو
شام وسحر کی اوٹ سے ہر دم
پیہم
گھور رہے ہیں طوفاں ہم کو،
چمکو!

دیکھو، تیرگیوں کے فتنے،
کتِنے
روند چلے عالم عالم کو
چمکو!

سُکھ میں سمو لو اِک اِک پل کو
جھلکو!
من میں بجھا لو شعلۂ غم کو
چمکو!

آتے ہوئے قرنوں کا تبسم
ہم تم
جگمگ دمکو، جھم جھم جھمکو
چمکو
کتنی اندھیری رات ہے چمکو
چمکو

کرۂ ارض:
نہ عکسِ خاک کہیں اور نہ رقصِ نور کہیں
نہ کوئی وادیِ ایمن نہ شمعِ طور کہیں
بجھی ہے راکھ میں غلطاں مئے طہور کہیں
پڑا ہے شیشۂ افلاک چور چور کہیں
پَلوں کے جھنڈ میں لرزے ابد کی پینگ کوئی
نظر کے سامنے، حدِ نظر سے دُور کہیں
مقدروں کے جہاں درجہاں اندھیروں میں

بھٹک نہ جائے مرا شوقِ ناصبور کہیں
یہ اضطرابِ مسلسل کی خوں چکاں گھڑیاں
ہے ان سے بڑھ کے کوئی دولت سرور کہیں
اگر ہمیں بھری دنیا میں مُسکرا نہ سکے
تو ڈول جائیں گے یہ سلسلے ضرور کہیں

شہر در شہر منادی ہے کہ ''اے خندہ فروشانِ حیات!
ہر بجھی رُوح کے آنگن میں کھلا ہے چمن امکانات
نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب
زندگی ہی فقط آئین جہاں بانی ہے!
جانے کس تیرہ اُفق سے یہ گھٹاؤں کے تھرکتے سائے
ماہتابوں کے چمکتے ہوئے سینوں سے نتھر کر آئے
ساتھ لے کر وہ خُنک موج، خماریں جھونکے
جن کی زد میں مری تپتی ہوئی پیشانی ہے
اپنے سینے میں جگا کر انہی دردوں، انہی یادوں کے فسوں
پھر تمناؤں کے تصویر کدے میں نگراں بیٹھا ہوں
سامنے صفحۂ صد رنگِ رموزِ کونین
کانپتی انگلیوں میں موقلم مانی ہے!

(۲۰-۱۰-۱۹۵۴)

نرگس

میں نے حسرت بھری نظروں سے تجھے دیکھا ہے
جب تو روز، اک نئے بہروپ میں، روز اِک نئے انداز کے سات
اپنی ان گاتی ہوئی انکھڑیوں کی چشمک طناز کے سات
روز اِک تازہ صنم خانۂ آہنگ میں در آئی ہے!

ایکٹریس! رُوپ کی رانی! تجھے معلوم نہیں،
کس طرح تیرے خیالوں کے بھنور میں جی کر
کن تمناؤں کا تلخابۂ نوشیں پی کر
میں نے اِک عمر ترے ناچتے سایوں کی پرستش کی ہے
تو نے اِک عظمتِ صد رنگ سے جس جذبے کو
آج تک اپنے لیے مُژدِ ہزار اشک سمجھ رکھا ہے
وہ محبت مرے سینے میں تڑپتی ہوئی اِک دُنیا ہے
جو ترے قدموں کی ہر چاپ پہ چونک اُٹھتی ہے

کاش میں بھی وہی اِک عکسِ درخشاں ہوتا
دلِ انساں سے اُبھرتی ہوئی موہوم تمناؤں کا عکس
ایک مانگی ہوئی اچکن میں سمایا ہُوا اماموِ رفغاں شخص
جس کے پہلو میں تری روح دھڑک سکتی ہے

(۱۹۵۶ء)

غزل

اِک وہ کہ جن کی فکر ہے ارض و سما شکار
اِک تو کہ ہے طلسمِ شب و روز کا شکار

لاؤ کہیں سے کوئی ضمیرِ فرشتہ صید،
ڈھونڈھو کہیں سے کوئی نگاہِ خُدا شکار

اس انجمن میں دیکھیے اہل وفا کے ظرف
کوئی اداشناس ہے کوئی ادا شکار

آتا ہے خود ہی چوٹ پہ صیدِ سبک مراد
ہوتا ہے ورنہ کون زکارِ قضا شکار

ظلِ ہما کی اوٹ میں چلّے پہ تیر رکھ
آساں نہیں نگاہ کے نخچیر کا شکار

جولاں گہِ حیات انھی کی ہے، دوستو
فتراک میں ہے جن کے دلِ مدعا شکار

(۲۴-۸-۱۹۵۶)

غزل

نہیں سنتا کوئی مجھ کشتۂ آلام کے شکوے
کیے میں نے ہر اک ایواں کی چوکھٹ تھام کے شکوے

شفق کے رنگ آنکھوں میں، سحر کی اوس پلکوں پر
نہ آئے پھر بھی لب پر چرخِ نیلی فام کے شکوے

یہ کیسا دَور ہے جس میں مجھے سننے پڑے ساقی
وبالِ ہوش کے طعنے، شکستِ جام کے شکوے

اب ان بھولے ہوئے قصوں کو دہرانے سے کیا حاصل
یہ اب کیا آپ لے بیٹھے دلِ ناکام کے شکوے

تماشا ہے کہ جن کے واسطے گردش میں تھے عالم
انھیں بھی سوجھتے ہیں گردشِ ایام کے شکوے

(۱۹۵۶ء)

غزل

چاندنی میں سایہ ہائے کاخ و کو میں گھومیے
پھر کسی کو چاہنے کی آرزو میں گھومیے

شاید اک بھولی تمنا، مٹتے مٹتے جی اُٹھے
اور ابھی اس جلوہ زارِ رنگ و بُو میں گھومیے

رُوح کے در بستہ سناٹوں کو لے کر اپنے ساتھ
ہمہماتی محفلوں کی ہاؤ ہو میں گھومیے

کیا خبر، کس موڑ پر مہجور یادیں آ ملیں
گھومتی راہوں پہ، گردِ آرزو میں گھومیے

زندگی کی راحتیں ملتی نہیں، ملتی نہیں
زندگی کا زہر پی کر جستجو میں گھومیے

کنجِ دوراں کو نئے اِک زاویے سے دیکھیے
جن خلاؤں میں نرالے چاند گھومیں گھومیے

(۱۹۵۶ء)

بھکارن

تیز قدموں کی آہٹوں سے بھری
رہگزر کے دو رویہ سبزہ و کشت
چار سُو ہنستی رنگتوں کے بہشت

صد خیابانِ گل، کہ جن کی طرف
دیکھتا ہی نہیں کوئی راہی !
سُرخ پھولوں سے اِک لدی ٹہنی
آن کر بچھ گئی ہے رستے پر
کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے
راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے

''میں کہاں روز روز آتی ہوں
ہے مرے کوچ کی گھڑی نزدیک،
جانے والو، بس اِک نگاہ کی بھیک''

(۲۸-۳-۱۹۵۷)

موجودگی

پھر آج دل میں کوئی موجِ غم مچلتی ہے
شب خیال میں قندیل عود جلتی ہے
پھر اک ادائے حجاب
رسومِ دہر کی زنجیر اُتار آئی ہے
بہار آئی ہے

رسومِ دہر کی اس آتشیں فصیل کے پار
گداز سینوں کی مخمور دھڑکنوں کے دیار
محبتوں کے سراب
کہ جن کو تیر کے آتی ہے پائلوں کی جھنک
مرے دکھے دل تک!

ہر اک طرف ہوسِ دید کے نیستاں میں
کسی حسین سی موجودگی کی خوشبوئیں
خمارِ قرب کے خواب
ہزار غم کہ جنھیں کیف شوق کی نیندیں
پیامِ تسکیں دیں

(۳-۱۹۵۷)

کہانی ایک ملک کی

راج محل کے دروازے پر
آ کے رُکی اک کار
پہلے نکلا بھدا' بے ڈھب' بودا'
میل کچیل کا تودا
حقہ تھامے اک میراسی'
عمر اس کی کوئی اسی بیاسی
پیچھے اس کا نائب' تمباکو بردار'
باہر رینگے اُس کے بعد قطار' قطار
عنبر بار
نمبردار
ساتھ سب ان کے دم چھلے
ایم اَیلے

راج محل کے اندر اک اک رتناسن پر
کوڑھی جسم اور نوری جامے
روگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے
جہل بھرے علامے
ماجھے، گامے
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ پہ شہد ــــــ اور جیب میں چاقو
نسلِ ہلاکو!

راج محل کے باہر، سوچ میں ڈوبے شہر اور گاؤں
ہل کی انی، فولاد کے پنجے
گھومتے پہیے، کڑیل باہیں،
کتنے لوگ کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں
سُکھ کی سیجیں،
لیکن جو ہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ پئیں اور پھول کھلائیں

(۴-۱۹۵۷)

دیکھ اے دِل!

دیکھ اے دل، کیا سماں ہے، کیا بہاریں شام ہے،
وقت کی جھولی میں جتنے پھول ہیں، انمول ہیں
نہر کی پٹڑی کے دو رویہ، مسلسل دُور تک
برگدوں پر پنچھیوں کے غل مچاتے غول ہیں

دیکھ اے دل، کتنے ارمانوں کا رس برسا گئیں
بدلیاں، جب ان پہ چھینٹے نور کے چھن کر پڑے
کتنی کومل کامناؤں کی کہانی کہہ گئے
پیپلوں کے پیلے پیلے پات پتھ پتھ پر پڑے

دیکھ اے دل اس رسیلی رُت کے کتنے رُوپ ہیں
جُھومتے جھونکے ہیں، جھکتی جھاڑیوں کے جھنڈ ہیں
ہائے ان پھیلی ہوئی پھلواڑیوں کے درمیاں
یہ تری تپتی ہوئی تنہائیاں اور ایک میں

(۴-۱۹۵۷)

غزل

جھونکوں میں رس گھولے دل
پون چلے اور ڈولے دل

جیون کی رُت کے سَو روپ
نغمے، پھول، جھکولے، دل

تاروں کی جب جوت جگے
اپنے خزانے کھولے دل

یادوں کی جب پینگ چڑھے
بول البیلے بولے دل

کس کی دھن ہے باورے من؟
تیرا کون ہے؟ بھولے دل

(۲۵-۷-۱۹۵۷)

غزل

وہ شے جو ایک نئے دَور کی بشارت ہے
ترے لہو کی تڑپتی ہوئی حرارت ہے

نظامِ کہنہ کے سائے میں عافیت سے نہ بیٹھ
نظامِ کہنہ تو گرتی ہُوئی عمارت ہے

وطن چمکتے ہوئے کنکروں کا نام نہیں
یہ تیرے جسم تری روح سے عبارت ہے

یہ کہہ رہی ہے صدا ٹوٹتے سلاسل کی
کہ زندگی تو فقط اِک حسیں جسارت ہے

یہ اِک جھلک ہے بدلتے ہوئے زمانوں کی
جبیں جبیں پہ شکن بھی کوئی بجھارت ہے

چمن میں اہل چمن کے یہ طور، ارے توبہ
کلی کلی کی ہنسی خندۂ حقارت ہے

دلوں کی جھونپڑیوں میں بھی روشنی اُترے
جو یوں نہیں تو یہ سب سیلِ نور اکارت ہے

(۱۲-۱۹۵۷)

غزل

دن کٹ رہے ہیں کش مکش روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایۂ ابرِ بہار میں

آتی ہے اپنے جسم کے جلنے کی بو مجھے
لٹتے ہیں نکہتوں کے سبو جب بہار میں

گزرا ادھر سے جب کوئی جھونکا تو چونک کر
دل نے کہا: یہ آ گئے ہم کِس دیار میں'

اے کنجِ عافیت تجھے پا کر پتہ چلا
کیا ہمہمے تھے گردِ سر رہگزار میں

میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

(۱۹۵۷ء)

غزل

اُمیدِ دیدِ دوست کی دُنیا بسا کے ہم
بیٹھے ہیں مہر و ماہ کی شمعیں بُجھا کے ہم

وہ راستے خبر نہیں کس سَمت کھو گئے
نکلے تھے جن پہ رختِ غمِ دل اُٹھا کے ہم

پلکوں سے جن کو جلتے زمانوں نے چُن لیا
وہ پھول، اس روش پہ، ترے نقشِ پا کے ہم

آئے کبھی تو پھر وہی صبحِ طرب کہ جب
روٹھے ہوئے غموں سے ملیں مسکرا کے ہم

کس کو خبر کہ ڈوبتے لمحوں سے کس طرح
اُبھرے ہیں یادِ یار، تری چوٹ کھا کے ہم

(۱۹۵۷ء)

غزل

قریب دل، خروشِ صد جہاں ہم
جو تم سن لو، تمھاری داستاں ہم

کسی کو چاہنے کی چاہ میں گُم
جئے بن کر نگاہِ تشنگاں ہم

ہر اک ٹھوکر کی زد میں لاکھ منزل
ہمیں ڈھونڈھو، نصیب گمرہاں ہم

ہمیں سمجھو، نگاہِ ناز والو!
لبوں پر کانپتا حرفِ بیاں ہم

بجھی شمعوں کی اِس نگری میں، امجد
اُبھرتے آفتابوں کی کماں ہم

(۴-۱-۱۹۵۸)

آورد

دھیان کا جب بھی کوئی پٹ کھولا
''میری بات نہ کہہ......'' دل بولا
دل کی بات کہی بھی نہ جائے
ضبط کی ٹیس سہی بھی نہ جائے
نظم میں کِس کا ذکر کروں اب
فکر میں ہُوں کیا فکر کروں اب
ایک عجب اُلجھن میں گھرا ہوں
کیا سوچوں ' یہ سوچ رہا ہوں

(۱۹۵۸ء)

امروز

پکار

کالی چونچ اور نیلے پیلے پنکھوں والی
چوں چوں، چرر چرر، چچلائی ''لالی''
بیٹھے بیٹھے، اُڑ کر
اُڑتے اُڑتے مُڑ کر
بجلی کے اک تار پہ آ کر بیٹھ گئی ہے
موت کا جھولا جھول رہی ہے

میرے دل سے چیخ اک اُبھری، میں للکارا
(جیسے کوئی بجے نقارہ)
میری صدا پر بامِ اجل سے کندے تول کے اُڑ گئی ''لالی''
نیلے پیلے پنکھوں والی

اور اک تم ہو
انگاروں پر بیٹھے ہو اور پھولوں کے سپنوں میں گم ہو
میرے دل کی اک اک چیخ تمہیں بے سود پکارے

(۸-۱۹۵۸)

شاخِ چنار

یہ کیا دیکھتا ہوں'
کھڑا سوچتا ہوں'
اس اِک لمحے کے چوکھٹے میں یہ منظر
اُتارا ہے کس نے؟

چنارِ شرر برگ کی ایک ٹہنی'
کسی جابرِ برف پیکر کے پھیلے ہوئے منجمد بازوؤں سے
نکل کر......' پھسل کر......'
فرازِ فضا میں' بڑی خود فروزی سے' لہرا رہی ہے'
نجانے اسے ماگھ رُت کے سہانے سمے میں سموئے ہوئے نیلگوں آسماں سے
پکارا ہے کس نے؟

(۱۴-۹-۱۹۵۸)

Richard Aldrige کی نظم کا ترجمہ

دو چیزیں

آنسو کیا ہے ؟ قطرۂ آب ؛ — ذی جسم اور سیال
غم کیا شے ہے ؟ دل کی آگ ' — جلتا جلتا کوئی خیال

کاہے کو ہم کریں تمھارا دل مجروح
مان لی ہم نے بات تمھاری '
ایک چیز ہے جسم '
ایک چیز ہے روح

جھانکو اپنی روح کے اندر ' — ہے کوئی ایسا تٹ
جہاں خلا کے خول میں ڈولیں جسموں کے جمگھٹ
ڈھونڈھو اپنے جسم کے اندر — ہے کوئی ایسی نخ
جہاں دھوئیں کی دُھند میں کھولیں — رُوحوں کے دوزخ

یہ سب سچ ہے، لیکن رکھیو — ایک اس بات کا دھیان
کس طرح من کی ہر کروٹ کو — شکتی دیتے ہیں پر ان
سوچو کس طرح دل سے اُٹھ کر — ایک خیال کی لہر
دیکھتے دیکھتے بن جاتی ہے — صد ہنگامۂ دہر!

سچ پوچھو تو جیون اپنا — ایک عجیب طلسم
گُتھ مِتھ، رس بس، گُھل مل جائیں...... جس میں روح اور جسم

(۱۸-۹-۱۹۵۸)

Donald Babcock
کی نظم کا ترجمہ

کوئٹے تک

صدیوں سے راہ تکتی ہوئی گھاٹیوں میں تم
اِک لمحہ آ کے ہنس گئے، میں ڈھونڈھتا پھرا
ان وادیوں میں برف کے چھینٹوں کیساتھ ساتھ
ہر سُو شرر برس گئے، میں ڈھونڈھتا پھرا
راتیں ترائیوں کی تہوں میں لڑھک گئیں
دن دلدلوں میں دھنس گئے میں ڈھونڈھتا پھرا
راہیں دھوئیں سے بھر گئیں میں منتظر رہا
قرنوں کے رُخ جھلس گئے میں ڈھونڈھتا پھرا
تم پھر نہ آسکو، بتانا تو تھا مجھے
تم دُور جاکے بس گئے، میں ڈھونڈھتا پھرا

برس گیا بہ خراباتِ آرزو، ترا غم
قدح قدح تری یادیں، سبو سبو ترا غم
ترے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں سُو بہ سُو ترا غم
غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈھتی کرن، تری دھن!
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبجُو ترا غم
ندی پہ چاند کا پرتو، ترا نشانِ قدم
خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص، تو، ترا غم
ہیں جسکی رو میں شگوفے، وہ فصلِ سم، ترا دھیان
ہے جس کے لمس میں ٹھنڈک، وہ گرم لو ترا غم
نخیلِ زیست کی چھاؤں میں نے بلب تری یاد
فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جو ترا غم
طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہی شب
تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم
نگہ اٹھی تو زمانے کے سامنے ترا روپ
پلک جھکی تو مرے دل کے رُوبرو ترا غم

(۲۲-۱۱-۱۹۵۸)

غزل

قاصد مست گام ' موجِ صبا
کوئی رمز خرام ' موجِ صبا
وادیٔ برف کا کوئی سندیس
میرے اشکوں کے نام موجِ صبا
کوئی موجِ خیال میں بہتی
منزلوں کا پیام ' موجِ صبا
سو سمٹتی مسافتوں کا طلسم !
تیری کروٹ کا نام ' موجِ صبا
تیرے دامن کی خوشبوؤں میں ہیں گم
سو سہانے مقام ' موجِ صبا
آتی پت جھڑ کے ساتھ لوٹتے وقت
اِک بہاریں پیام ' موجِ صبا
اِک نوید نگاہ ' پیکِ حبیب '
اک جوابِ سلام ' موجِ صبا '

(۱۹۵۸ء)

میونخ

آج کرسمس ہے
شہر میونخ میں آج کرسمس ہے

رودبارِ عسار کے پُل پر
جس جگہ برف کی سلوں کی سڑک
فان کاچے کی سمت مڑتی ہے
قافلے قہقہوں کے اُترے ہیں

آج اس قریۂ شراب کے لوگ
—جن کے رُخ پر ہزیمتوں کا عرق
جن کے دل میں جراحتوں کی خراش
ایک عزمِ نشاط جو کے ساتھ
اُمڈ آئے ہیں مست راہوں پر
باہیں باہوں میں، ہونٹ ہونٹوں پر!

برف گرتی ہے ساز بجتے ہیں
کوئے میریں کے اک گھروندے میں
ایک بوڑھی، اُداس، ماں کے لئے
پھول اک طاقچے پہ ہنستے ہیں
گرم انگیٹھی کے عکسِ لرزاں سے
آگ اِک آئنے میں جلتی ہے!
ایک دستک ہے! کون آیا ہے!
زرد کمرے کے گوشے گوشے میں
جورِ ماضی کا سایۂ مصلوب
آخری سانس لینے لگتا ہے!

ماں کے چہرے کی ہر عمیق شِکن
ایک حیران مسکراہٹ کے
دلنشیں زاویوں میں ڈھلتی ہے
''میری شالاط' اے مری شالاط
اے میں قرباں، تم آگئیں، بیٹی!''
اور وہ دُختِ ارضِ الماں جب

سر سے گٹھڑی اُتار کر جھک کر
اپنی امی کے پاؤں پڑتی ہے
اس کی پلکوں پہ ملک ملک کی گرد
ایک آنسو میں ڈوب جاتی ہے

ایک مفتوح قوم کی بیٹی
پارۂ ناں کے واسطے' تنہا
رُوئے عالم کی خاک چھان آئی

دس برس کے طویل عرصے کے بعد
آج وہ اپنے ساتھ کیا لائی ؟
روح میں' دیس دیس کے موسم !

بزمِ دوراں سے کیا ملا اس کو
سیپ کی چوڑیاں ملایا سے
کینچلی چین کے اِک اژدر کی
ٹھیکری اِک مہنجوداڑو کی
ایک نازک بیاض پر' مرا نام

کون سمجھے گا ' اس پہیلی کو ؟

فاصلوں کی کمند سے آزاد '
میرا دل ہے کہ شہرِ میونخ ہے
چار سو ' جس طرف کوئی دیکھے
برف گرتی ہے ' ساز بجتے ہیں

(۱۹۵۸)

غزل

کیا کہیے کیا حجابِ حیا کا فسانہ تھا !
سب کچھ بس اِک نگاہِ کرم کا بہانہ تھا

دیکھا تو ہر تبسم لب والہانہ تھا
پرکھا تو ایک حیلۂ صنعت گرانہ تھا

دنیا ' اُمیدِ دید کی دنیا تھی دیدنی
دیوار و در اُداس تھے ' موسم سہانا تھا

ہائے وہ ایک شام کہ جب مست ' نے بلب
میں جگنوؤں کے دیس میں تنہا روانہ تھا

یہ کون ادھر سے گزرا ' میں سمجھا حضور تھے
اِک موڑ اور مڑ کے جو دیکھا ـــــ زمانہ تھا

اک چہرہ اُس پہ لاکھ سخن تاب رنگتیں
اے جرأتِ نگہ، تری قسمت میں کیا نہ تھا

ان آنسوؤں کی رَو میں نہ تھی موتیوں کی کھیپ
ناداں سمندروں کی تہوں میں خزانہ تھا

اے غم انیس دل، یہ تری دلنوازیاں
ہم کو تری خوشی کے لئے مسکرانا تھا

اک طرفہ کیفیت، نہ توجہ نہ بے رُخی
میرے جنونِ دید کو یوں آزمانا تھا

ہائے وہ دھڑکنوں سے بھری ساعتیں مجید
میں اُن کو دیکھتا تھا، کوئی دیکھتا نہ تھا

(۱۹۵۸ء)

جیون دیس

پیلے چہرے، ڈوبتے سورج! روحیں، گہری شامیں!
زندگیوں کے صحن میں کھلتے — قبروں کے دروازے!
سانس کے آخری سلوٹ کو پہچاننے والے گیانی،
ڈولتی محرابوں کے نیچے آس بھرے اندیشے!
بوڑھی کبڑی دیواروں کے پاؤں چاٹتی گلیاں،
ٹوٹتے فرش، اُکھڑتی اینٹیں - گزرے دنوں کے ملبے!
دُکھے دلوں کے سجدے، چنتی پلکیں، بچھڑے پریمی!
بجھے جھروکوں سے ٹکراتی یادیں، ڈھلتے سائے!
بجتی ڈھولک، گاتی سیاں، نیر بہاتی خوشیاں،
جاگتے ماتھے، سوچتے نیناں — آنے والے زمانے!
خونی بازاروں میں بکتی اِک اِک میلی چوڑی،
پنکھیاں جھلتی ننگی باہیں، نیند آنند پنگھوڑے،
کنٹھا پہنے اک متوالا بالا، رہڑی والا،
موڑ موڑ پہ جیون رُت کی زخمی کلیاں بانٹے!
جینے کے یہ سارے جتن، انمول سمے کی مایا،
سدا رہیں ان سدا بہار دکھوں کے روپ سہانے
تو بھی رُک کر اس بھنڈار سے اپنی جھولی بھر لے
تیری تڑپ کا انت یہی ہے، اے دل، اے دیوانے

(۱۹۵۸)

افسانے

پھر کلی بن کے کوئی ناچتی آہٹ نہ کھلی — پھر کوئی بنسی نہ بجی
ریگ زاروں کے تپکتے سے، چمکتے سے نشیب، — منزلِ لیلیٰ کے قریب !
قصرِ پرویز کی دہلیز پہ روندی ہوئی سِل — دل، کسی فرہاد کا دل
اک بھنور، ایک گھڑا، ایک خیالِ محبوب — سو دُکھی روحوں کا غروب
برف ابنار دیاروں کے کسی پھول کا دھیان — پرجلی تتلی کی اُڑان !

ہاں یہ سب جھلسی روایات ہیں اگنی بھرے خواب — دشتِ حقیقت کے سراب
ہاں یہ سب کچھ فقط آرائشِ افسانہ سہی، — صورتِ دنیا نہ سہی !

پھر بھی سچ پوچھو تو یہ آندھیاں جلتی بھی رہیں — مشعلیں جلتی بھی رہیں
کاش میں بھی ترے سوچوں بھرے نینوں میں جلوں — اک فسانے میں ڈھلوں

(۳۰-۶-۱۹۵۹)

غزل

اِک شوقِ بے اماں کے یہ نخچیر کون ہیں
اے موجۂ ہوا، تہِ زنجیر کون ہیں

دیوارِ دل کے ساتھ بہ پیکانِ غم گڑے
آ دیکھ یہ ترے ہدفِ تیر کون ہیں

یہ بدلیوں کا شور، یہ گھنگھور قربتیں
بارش میں بھیگتے یہ دو رہگیر کون ہیں

ان ریزہ ریزہ آئینوں کے روپ میں بتا
صدیوں کے طاق پر، فلکِ پیر، کون ہیں

جن کی پلک پلک پہ ترے بام و در کے دیپ
پہچان تو سہی کہ یہ دلگیر کون ہیں

امجد، دیارِ لعل و گہر میں کسے خبر،
وہ جن کی خاکِ پا بھی ہے اکسیر کون ہیں

(۳۰-۷-۱۹۵۹)

ریلوے سٹیشن پر

آہنی، سبز رنگ، جنگلے کے پاس
باتوں باتوں میں ایک برگِ عقیق
تو نے جب توڑ کر مسل ڈالا
مجھے احساس بھی نہ تھا کہ یہی
جاوداں لمحہ، شاخِ دوراں سے
جھڑکے، اک عمر، میری دنیا پر
اپنی کملاہٹیں بکھیرے گا
اسی برگ دریدہ جاں کی طرح
آج بھی اس دہکتی پٹڑی پر
گھومتے گھنگھناتے پہیوں کو
سیٹیوں کی دھواں اُگلتی صدا
جب پیامِ رحیل دیتی ہے

روز سوسنگتیں اُجڑتی ہیں
لاکھ سنجوگ مسکراتے ہیں

آج بھی ریلوے سٹیشن پر
آہنی ' سبز رنگ جنگلے کے پاس
قدِ آدم ' عقیق کے ' پودے
تھام کر سُرخ دھاریوں والے
زرد پھولوں کے موہنے گجرے
بھری دنیا کے جمگھٹوں میں کھڑے
گوشت اور پوست کے وہ پیکر ہیں
اِک زمانے سے جن کی زندگیاں
لَوٹ کر پھر نہ آنے والوں کی
منتظر منتظر چراغ بکف
وقت کے جھکڑوں سے کھیلتی ہیں
اسی برگِ دریدہ جاں کی طرح

(۶-۸-۱۹۵۹)

ماڈرن لڑکیاں

سنہری دوپہروں رُپہلی رتوں
میں، سورج مکھی کے شگوفوں کے پاس،
چناروں سے قد اور ستاروں سے نین،
زرافشاں بدن، زعفرانی لباس،
حسیں گوریاں گنگناتی پھریں،
مٹکتی پھریں، ڈگمگاتی پھریں
کڑی دھوپ میں قاشِ زر سے تراشی ہوئی پنڈلیاں،
لہکتی پھریں، تھرتھراتی پھریں

سجل راستوں سے گزر جائیں یہ
نگینوں بھرے آبشاروں کی طرح
زمانوں کے دل میں اُتر جائیں یہ
لجیلی کٹیلی کٹاروں کی طرح
سنہری دوپہروں کو ٹھنڈک عطا کرنے والے خیالوں کے جادو جگاتی پھریں
مٹکتی پھریں، ڈگمگاتی پھریں،

(۱۲-۸-۱۹۵۹)

Philip Booth کی نظم کا ترجمہ

ہڑپے کا ایک کتبہ

بہتی راوی ترے تٹ پر' — کھیت اور پھول اور پھل
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کی چھل بل!
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی' اِک ہالی' اِک ہل!

سینۂ سنگ میں بسنے والے خداؤں کا فرمان
مٹی کاٹے' مٹی چاٹے' ہل کی اَنی کا مان'
آگ میں جلتا پنجر ہالی کاہے کو انسان'

کون مٹائے اُس کے ماتھے سے یہ دُکھوں کی ریکھ
ہل کو کھینچنے والے جنوروں جیسے اُس کے لیکھ
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں' تین بیل ہیں' دیکھ

(۱۲-۸-۱۹۵۹)

غزل

جب اک چراغ راہگزر کی کرن پڑے
ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے

شاخِ ابد سے جھڑتے زمانوں کا روپ ہیں
یہ لوگ جن کے رُخ پہ گمانِ چمن پڑے

تنہا گلی، ترے مرے قدموں کی چاپ، رات
ہر سُو وہ خامشی کہ نہ تابِ سخن پڑے

یہ کس حسیں دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی
ہر موجۂ خیال پہ صدہا شکن پڑے

جب دل کی سل پہ بج اُٹھے نیندوں کا آبشار
نادیدہ پائلوں کی جھنک جھن جھنن پڑے

یہ چاندنی یہ بھولی ہُوئی چاہتوں کا دیس
گزروں تو رُخ پہ رشحۂ عطرِ سمن پڑے

یہ کون ہے لبوں میں رسیلی رُتیں گھُلیں
پلکوں کی اوٹ نیند میں گلگوں گگن پڑے

اِک پل بھی کوئے دل میں نہ ٹھہرا وہ رہ نورد
اب جس کے نقشِ پا ہیں چمن در چمن پڑے
اِک جست اس طرف بھی غزال زمانہ رقص
رہ تیری دیکھتے ہیں خطا وختن پڑے
جب انجمن تموجِ صد گفتگو میں ہو
میری طرف بھی اک نگہ کم سخن پڑے
صحرائے زندگی میں جدھر بھی قدم اُٹھیں
رستے میں ایک آرزوؤں کا چمن پڑے
اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انھیں دے دوں جو بن پڑے
اے شاطرِ ازل ترے ہاتھوں کو چوم لوں
قرعے میں میرے نام جو دیوانہ پن پڑے
اے صبح دیر خیز انھیں آواز دے جو ہیں
اک شام زود خواب کے سکھ میں مگن پڑے
اک تم کہ مرگ دل کے مسائل میں جی گئے
اک ہم کہ ہیں بہ کشمکش جاں وتن پڑے
امجد طریق مے میں ہے یہ احتیاط شرط
اک داغ بھی کہیں نہ سرِ پیرہن پڑے

(۱۶-۸-۱۹۵۹)

شناور

تیرتا ہے جب تیراک مرگ رقص دھارے پر — موج سے اُبھرتا ہے موج کے سہارے پر
موج پر مسلط بھی، موج کے حوالے بھی — موج اسے اچھالے بھی موج اسے سنبھالے بھی
کینۂ تلاطم بھی ہم عنانِ دریا ہے — سینہ شناور بھی درمیانِ دریا ہے
لاکھ لاکھ طوفاں ہیں ایک ایک قطرے میں — تیرنے کی شکتی ہے ڈوبنے کے خطرے میں

جو بہ جو تھپیڑے ہیں آتشیں خیالوں کے — تیرتے ہیں دل جن میں پیار کرنے والوں کے
پریمیوں کی باہوں میں چاہتوں کا دریا ہے — تیرنے کی قدغن ہے، ڈوبنے کا کھٹکا ہے
لہر لہر کی دھڑکن، درد کا قرینہ بھی — لہر لہر کی کروٹ، زندگی کا زینہ بھی
کتنے دل جو موجوں کی چوٹ چوٹ سہتے ہیں
اس بھنور کے گھیرے میں پھول بن کے بہتے ہیں

(۱۸-۸-۱۹۵۹)

Robert Francis
کی نظم کا ترجمہ

وہ ایک دن بھی عجیب دن تھا

وہ ایک دن بھی عجیب دن تھا
تم آئے، بادل اُمنڈ کے آئے،
ہزار ہا رنگتوں کے سائے
فضائے دوراں پہ تھرتھرائے

تم آئے — اور برگِ صد شجر سے
اُلجھنے والی شعاعِ زر سے
تمھاری زلفوں پہ پھول برسے

عجیب دن تھا، ہر ایک پتی سنور رہی تھی
ہر ایک موجِ ہوا تڑپ کر گزر رہی تھی
جدھر بھی دیکھا، ہر ایک شے رقص کر رہی تھی

پہاڑ صدیوں سے جن کے سنگین پاؤں پاتال میں گڑے تھے
دھڑام سے، دفعتاً، اُبلتے ہوئے سمندر میں گر پڑے تھے
پھر ایک لمحے کے بعد اُٹھ کر اسی طرح چپ اٹل کھڑے تھے

ندی کا پانی جو اک زمانے سے بہ رہا تھا،
اچانک اِک پل کو چلتے چلتے ٹھٹک گیا تھا
بس ایک لمحے کو تھم کے پھر بہنے لگ پڑا تھا

ہمارے قدموں تلے زمین اک عجیب اندازِ مطمئن میں
سرکتی بڑھتی رواں تھی ان بے نشاں دیاروں کی سمت جن میں
ہزار شام وسحر کے کھلیان جل اُٹھے تھے اس ایک دن میں

(۲۸-۸-۱۹۵۹)

Philip Murrey
کی نظم کا ترجمہ

ایک فوٹو

لے کر نیلم جڑے تھال میں، نیل کمل کے پھول
کس شردھا سے کھڑا ہے تیرے چرنوں کے نزدیک
ٹھہری ٹھہری، گہری جھیل کا شیتل شیتل جل

تتلی، پیچاں، بیلڑیوں کے جھرمٹ کے اوجھل،
جھیل کنارے، تو بیٹھی ہے، اپنے آپ میں گم
تیرے پاؤں تلے، پانی پر — نیلوفر کے پھول
جن پہ چھڑکنے آئی ہے البیلی رُتوں کے روپ
تیتریوں کے پروں کی پیلی چادر اوڑھ کے دھوپ

نیلی جھیل، سجیلے پھول، البیلی رُت اور تو،
ایک تری یہ بھیجی ہوئی رنگیں تصویر اور میں
روشن کمرہ، جگمگ یادیں، نیر بہاتی چاہ
باہر کالی رات کی ساکت جھیل، سیاہ، اتھاہ

ایک کنارے جیون کی رفتار رُتوں کے سنگ
تیرا سہانا دیس، برستی برف، کھنکتے ساز
ایک کنارے امرت پیتے، جیتے جگوں کی اوٹ
میری آخری سانس کی دھیمی بے آواز آواز،

(۹-۱۹۵۹)

دُنیا سب کچھ تیرا......

سب کچھ تیرا، اے دنیا
دریا دریا، بجتے ساز،
نگری نگری، موہن مُکھ،
بام بام پر چاند،
کرن کرن، گلنار!
آسمانوں اور زمینوں کے سب روپ
سب کچھ تیرا — اے دنیا!

تیرے طاق پہ میں اک دیپ،
تو صدیوں کے گارے میں اک گندھی ہوئی دیوار
میں — اِک پل کی راکھ،
— اِک دھڑکن کی ہُوک

جل گئی عود کی شمع،
گر گئی بے بس راکھ،
رات کے پربت سے ٹکرا گئی خوشبو کی اک لہر،
پھر وہی رنگ اور پھر وہی رُوپ
نگری نگری، موہن مکھ،
بام بام پر چاند
کرن کرن، گلنار!

(1-11-1959)

نگاہِ بازگشت

آج تھی میرے مقدر میں عجب ساعتِ دید

آج جب میری نگاہوں نے پکارا تجھ کو،
میری ان تشنہ نگاہوں کی صدا
کوئی بھی سن نہ سکا!

صرف اک تیرے ہی دل تک یہ صدا،
جاگتی دنیا کے کہرام سے چپ چاپ گزر کر پہنچی،
صرف اک تو نے پلٹ کر مری جانب دیکھا،
مجھے تو نے، تجھے میں نے دیکھا،

آج تھی میری نگاہوں کے مقدر میں عجب ساعتِ دید!

کیا خبر، پھر تو پلٹ کر مری جانب کبھی دیکھے کہ نہ دیکھے، لیکن
ایک عمر اب میں یونہی اپنی طرف دیکھتے دیکھوں گا تجھے

(۱۹۵۹-

کیلنڈر کی تصویر

اچانک جو ہوٹل کی دیوار کے
اک اُونچے دریچے میں لٹکی ہُوئی
شبیہ حسیں پر نظر جا رکی،
پیالی مرے ہاتھ سے گر پڑی!

کہا دل سے میں نے
کہ "اے خوش خرد!
نگاریں ہے جس سے ترے غم کا ظرف،
وہ خطِ جبیں،
وہ خالِ مبیں،

نہیں — یہ نہیں،
زباں پر نہ لا نامِ شیریں کے حرف
کہاں تیرے شعلے کہاں شہرِ برف"

میں اس سوچ میں تھا کہ دیوارِ دل
پر اک عکس ابھرا مرے رُو بہ رُو
وہی وضعِ رُو،
وہی قطعِ مو،
خراباتِ ایام میں چار سو،
کھنکنے لگے طاقچوں پر سبو،

(۱۹۵۹ء)

زینیا*

انگاروں کا روپ
جیٹھ ہاڑ کی دھوپ
اور اس جلتے سمے
مہکیں تیرے سنگ
رنگ رنگ کے رنگ

پائے موجِ نمو
خوشبو تج کر تو'
اگنی پیتے پھول
تیری جبیں پر لاکھ
بجھے دلوں کی راکھ

روپ ہو کتنا انوپ
باس بناں کیا رُوپ
اس پھلواڑی میں
خوشبو کی اک لہر'
زندگیوں کا شہر

* (Zinnia) زینیا ایک پھول جس کے کئی رنگ ہوتے ہیں' یہ موسم گرما میں کھلتا ہے مگر اس میں خوشبو نہیں ہوتی۔ (مجید امجد)

جینا اُن کا، جو
امر بہاروں کو
سونپ کے دل کی باگ
دکھ کی دھوپ جلیں
رس کی بھینٹ نہ دیں

دیکھ سکے تو دیکھ،
جیون کے یہ لیکھ
لے کر اس جگ میں
سونے کا کشکول،
سب اک پل کے مول
اپنے من کی سگندھ
بیچنے آئے ہیں
کیا تو — اور کیا میں

(۱۹۵۹)

غزل

اپنے دل کی کھوج میں کھو گئے کیا کیا لوگ
آنسو تپتی ریت میں بو گئے کیا کیا لوگ

کرنوں کے طوفان سے بجرے بھر بھر کر
روشنیاں اس گھاٹ پر ڈھو گئے کیا کیا لوگ

سانجھ سمے اس کنج میں زندگیوں کی اوٹ
بج گئی کیا کیا بانسری رو گئے کیا کیا لوگ

میلی چادر تان کر اس چوکھٹ کے دوار
صدیوں کے کہرام میں سو گئے کیا کیا لوگ

گٹھڑی کال رین کی سوئی سے لٹکائے
اپنی دھن میں دھیان نگر کو گئے کیا کیا لوگ

میٹھے میٹھے بول میں دوہے کا ہنڈول
سن سن اس کو باورے ہو گئے کیا کیا لوگ

(۱۹۵۹ء)

سایوں کا سندیس

بھیگی بھیگی، نتھری نتھری روشنیوں کا دن
رستے رستے پر بے برگ درختوں کے سائے
دھوپ کے پیلے آنچل پر مٹیالے گل بوٹے
دنیا ان کو روند گئی یہ خاک کے مٹ نہ سکے !

میٹھی میٹھی ٹھنڈک، نکھرا نکھرا دن، اور میں
بھیگے رستوں سے یہ سائے چننے آیا ہوں
میرے من میں ہیں جو جھمیلے، ان سے کیوں الجھوں
اپنی جھولی آج ان مَسلے پھولوں سے بھرلوں

شیتل شیتل دھوپ میں بہتے سایوں کا یہ کھیل،
اک ڈالی کی ڈولتی چھایا، لاکھ امٹ ارمان
تھرتھرکانپیں سُوکھے پتے، جھم جھم جھمکیں دھیان
یہی بہت ہے پت جھڑ کی اس سہمی رُت کا دان

(۲-۲-۱۹۶۰)

توسیع شہر

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے اُن ساونتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ وبار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اِک میری سوچ، لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اِک، اے آدم کی آل،

(۹-۲-۱۹۶۰)

عید الاضحیٰ

ہزار جشن مسرت ترے گلستاں میں
ہزار رنگِ طرب' تیرے رُوئے خنداں پر
جھکی ہے شوکتِ کونین تیرے قدموں میں
پڑا ہے سایہ ترا اوج سربلنداں پر
تری حیات کا مسلک' ترے عمل کا طریق
اساس اس کی ہے کیشِ وفا پسنداں پر
تجھے عزیز تو ہے سنتِ براہیمی
تری چھری تو ہے حلقومِ گوسفنداں پر
مگر کبھی تجھے اس بات کا خیال آیا ؟
تری نگاہ نہیں دردِ درد منداں پر

(۶-۶-۱۹۶۰)

غزل

گہرے سروں میں عرضِ نوائے حیات کر
سینے پہ ایک درد کی سل رکھ کے بات کر

یہ دوریوں کا سیلِ رواں، برگِ نامہ بھیج
یہ فاصلوں کے بندِ گراں، کوئی بات کر

تیرا دیار، رات، مری بانسری کی لے
اس خوابِ دل نشیں کو مری کائنات کر

میرے غموں کو اپنے خیالوں میں بار دے
ان الجھنوں کو سلسلۂ واقعات کر

آ، ایک دن، مرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر
اس دشت کے سکوتِ سخن جو سے بات کر

امجد، نشاط زیست اسی کشمکش میں ہے
مرنے کا قصد، جینے کا عزم، ایک سات کر!

(۲۱-۷-۱۹۶۰)

سفرِ درد

سطحِ سحر، سفینۂ غم، جوئے لالہ گوں
کنجاہ کی گلی کا سکوتِ اجل سکوں
قاتل کا وار، سینۂ صد لخت، موجِ خوں
اک صاحبِ قلم پہ جو گزری میں کیا کہوں
نوک اُس کے دل کو چیر گئی جس کٹار کی
اس پر گرفت تھی ستمِ روزگار کی

اک ہاتھ بڑھ کے شانۂ دیوار پر رکھا
وہ زد، وہ چند ڈولتے قدموں کا فاصلہ
اک گام اور جادۂ دوراں سمٹ گیا
اک سانس — اور سب سفرِ درد طے ہُوا
اِک آخری تڑپ، جسد لرزہ گیر کی
مٹی پہ ایک قوس لہو کی لکیر کی

اک زندگی کراہتے لمحوں میں ڈھل گئی
اک شمع موجِ اشک پہ بجھ بجھ کے جل گئی
اک بے گنہ پہ ظلم کی شمشیر چل گئی
خونی انی پہ ایک جوانی مچل گئی

ہے بھی یہاں غریب کی ہستی کا کوئی مول
میں پوچھتا ہوں، مدعی عدل، کچھ تو بول

(۱۸-۹-۱۹۶۰)

نظم

دُکھ کا ہر بہروپ انوکھا
ہر اُلجھن کا روپ انوکھا
غم کو جب اس دھرتی پر پرکھا
اک پل دُھوپ اور اِک پل برکھا
دردوں کے بندھن میں تڑپیں
لاکھوں جسم اور لاکھوں روحیں
میں جس آگ سے کلیاں چھانوں
میرا قصہ ہے، میں جانوں

شام ہوئی ہے، سوچ رہا ہوں
تو سورج ہے، میں دُنیا ہوں
لوٹ کے آنا، تیرے بس میں
تجھ کو پانا تیرے بس میں

سایوں کی اِک اِک کروٹ پر
زنجیروں میں ڈوب گیا ہوں،
دل میں چند شرارے لے کر
اپنی راکھ سے کھیل رہا ہوں

(۲۶-۹-۱۹۶۰)

صدا بھی، مرگ صدا

نہ کوئی سقفِ منقش، نہ کوئی چترِ حریر،
نہ کوئی چادرِ گل اور نہ کوئی سایۂ تاک
بس ایک تودۂ خاک

بس ایک ٹھیکریوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان
بس ایک اندھے گڑھے میں ہجومِ کرمکِ کور،
بس ایک قبۂ گور

نہ کوئی لوحِ مسطر، نہ کوئی خشتِ نشاں
یہیں پہ دفن ہے وہ صاحبِ سخن، کہ جسے
نظامِ دُنیا نے
ہزار مرتبہ عرضِ نوا کی دعوت دی،
مگر وہ اپنی فصیلِ خیال میں محصور،
رہ زمانہ سے دُور
خروشِ برقِ سرِنیستاں سے بے پروا
سکوتِ سینۂ یک چوبِ نے میں ڈوب گیا
صدا بھی مرگِ صدا!

یہیں پہ دفن ہے، وہ روح، جس کی دھیمی آگ
کبھی جو ڈھل بھی سکی تو ڈھلی بہ قالبِ حرف
پہن کے جامۂ برف

ضمیرِ ارض پہ کھینچی گئی لہو کی لکیر
اور اس کا ایک بھی چھینٹا نہیں سرِ قرطاس
بہ مصحفِ احساس!

ستم کی تیغ چلی، گردنوں کی فصل کٹی
اور اس تمام فسانے کی اک بھی سطر حزیں
زبورِ غم میں نہیں!
پکارتی رہیں پیہم، کراہتی صدیاں،
اور ایک گونج بھی اُن کی نہیں صدا انداز
بہ گنبدِ الفاظ

پہاڑ لرزے، ستاروں کی بستیاں ڈولیں
اُلٹ سکی نہ مگر رخ سے پردۂ افسوں
روایتِ مضموں!

یہیں پہ دفن ہے وہ جسم، وہ روایت خاک
وہ دل، کہ جس کے دھڑکتے ہوئے بیان الم
کو چھو سکا نہ قلم!

یہیں پہ گلتی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر میں اب
دبے پڑے ہیں وہ لمحے، جو رزق سم نہ بنے
نوائے غم نہ بنے!

یہیں پہ ریزہ سل بن کے جم گئے ہیں وہ ہات
جو اشکبار زمانوں کی موج رقصاں سے
شرار چن نہ سکے!

کرید کر کوئی اس راکھ کو اگر دیکھے،
تو آج ایک رگ سنگ ہے وہ نبض تپاں
وہ جوئے خون رواں،

وہ زندگی کے تلاطم میں ڈوبتی ہوئی آگ
صریر خامہ کی تقدیس بیچتا ہوا فن
تمام گرد کفن!

یہ کرم خوردہ اساطیر کا بلند الوندؔ
یہ سب درست، مگر پھر بھی اک سوال ہے آج
جواب کا محتاج،

کوئی بتائے، کہ اس وقت کیا کرے انساں
جب آسمان کی آنکھوں سے روشنی چھینیں
ستم کی سنگینیں
یہی سوال، اَب اس قبر کے اندھیروں میں
ہزار رینگتے کیڑوں کی سرسراہٹ ہے
اجل کی آہٹ ہے

یہ قبر، طنز ہے ان لازوال ارادوں پر
نگل گئے جنھیں ظلمت کے خشمگیں عفریت،
مقدروں پہ محیط!

مقدروں کے دُھوئیں سے اُبھرتے رہگیرو
نشان اس کا مٹاتے چلو، زدِ پا سے!
جبینِ دُنیا سے!

(۱۹۶۰ء)

سنگت

شیشم کی اِک شاخ پر
کھلتی، بڑھتی، رینگتی
جس کی نازک ڈور سے
لچھے پھولوں کے!

کھیلے سکھ کے کھیل
چمپا کی اِک بیل
جھم جھم جھم لہرائیں
اچھے اچھے پھولوں کے
لچھے پھولوں کے!

اک شاداب درخت پر
جسموں کی سنجوگتا
میرے من میں تیر گئیں
لچھے پھولوں کے!

یہ شاداب کمند!
روحوں کا سمبند
جیون کی پرچھائیں،
اچھے اچھے پھولوں کے
لچھے پھولوں کے

مورکھ کیا ہے زندگی؟
دُکھ کی چڑھتی پینگ میں
گھنی گھنیری ڈال پر
لچھے پھولوں کے!

سنگت کا سنگیت
ہنستے دِلوں کی ریت!
سندر روپ لٹائیں
اچھے اچھے پھولوں کے
لچھے پھولوں کے!

(۱۹۶۰ء)

غزل

اک عمر دِل کی گھات سے تجھ پر نگاہ کی
تجھ پر تری نگاہ سے چھپ کر نگاہ کی

روحوں میں جلتی آگ خیالوں میں کھلتے پھول
ساری صداقتیں کسی کافر نگاہ کی

جب بھی غمِ زمانہ سے آنکھیں ہوئیں دوچار
منہ پھیر کر تبسمِ دِل پر نگاہ کی!

باگیں کھنچیں، مسافتیں کڑکیں، فرس رکے
ماضی کی رتھ سے کس نے پلٹ کر نگاہ کی

دونوں کا ربط ہے تری موجِ خرام سے
لغزش خیال کی ہو کہ ٹھوکر نگاہ کی

(۱۹۶۰)

ہیولیٰ

برگ و بر پر، بام و در پر، برف ...... برف ......،
ایک نگری، برف ...... برف ......،

زرد سورج، سیم گوں میداں، رپہلی سیڑھیاں،
سیڑھیوں کی موج اندر موج ڈھلوانوں پہ چہرے ...... چتر ...... چتر ......
سیڑھیوں پر سو قمر قوس آئینوں کی اوٹ ...... اوٹ ......
منتظر نظروں کی دُنیا عکس ...... عکس ......

کتنے رنگوں سے جو زیب دامن احساس تھے
بھر گئے تھے گل بداماں راستے،
جانے کس کے واسطے ......،

ساز جاگے، پھول برسے، اِک نوا،
اک صدا، جیسے سلگتی چاہتوں کے دیس سے آتی صدا،
اک صدا، جیسے زمانوں کے اندھیروں میں صدا دیتی وفاؤں کی صدا
(اک صدا، جیسے مرے دِل کی صدا!)

لے تھمی اور نغمہ گر کا پیکر بے جاں گرا'
سیڑھیوں سے آسماں کی ٹوٹتی محراب تک'
بکھرے پھولوں کی چٹختی پنکھڑیوں پر تیز قدموں کی دھمک'
آہٹوں کے اس بھنور میں اِک جھجکتی چاپ کی دھیمی جھنک
(میرے دِل کی دھڑکنوں کو روندنے والی کسک)

رات، بجھتی شمع، نیندوں کا غبار'
برف کی زنجیر میں جکڑے ہوئے جھونکوں کی بزم'
میں کہاں تھا کچھ بتا اے دِل کی لو پر ناچتی ناگفتہ نظم!

(۱-۱-۱۹۶۱)

متروکہ مکان

یہ محلے، یہ گھروندے، یہ جھروکے، یہ مکاں
ہم سے پہلے بھی یہاں
بس رہے تھے سکھ بھرے آنگن، سنہری بستیاں

جانے والے گھر کی چاہت سے تہی پہلو نہ تھے
اتنے بے قابو نہ تھے
روکتا کون؟ اس جھکی محراب کے بازو نہ تھے

اَ ٹل ہونی کی زنجیروں میں جکڑے قافلے
ساتھ لے جاتے اسے
بات صرف اتنی کہ اس دیوار کے پاؤں نہ تھے

اب وہ روحیں گونجتے جھکڑ میں گھلتی سسکیاں
اُن کے مسکن یہ مکاں
منہدم ادوار کے ملبے پہ جلتی ارتھیاں

راکھ ہوتی ہڈیوں کے گرم گارے میں گندھی
گرتے اشکوں میں ڈھلی
اب یہیں اینٹیں ہماری عظمت افتادگی

پڑ گئے اینٹوں کے مڑتے زاویوں کے بس میں ہم
بھول کے سب اپنے غم اس دام خشت وخس میں ہم
بھڑ گئے آپس میں ہم

یہ محلے، یہ منڈیریں، یہ محل، یہ منڈلیاں
کون دیکھے اَب یہاں
کھنچ گئی ہیں کتنی دیواریں دِلوں کے درمیاں

بھر لیے ہم نے ان ایوانوں میں تھے جتنے شگاف

کون دیکھے آسماں کی چھت میں ہیں کتنے شگاف

(۸-۱-۱۹۶۱)

بہار

ہر بار، اسی طرح سے دُنیا
سونے کی ڈلی سے ڈھالتی ہے
سرسوں کی کلی کی زرد مورت
تھاما ہے جسے خم ہوا نے

ہر بار، اسی طرح سے، شاخیں
کھلتی ہوئی کونپلیں اٹھائے
رستوں کے سلاخچوں سے لگ کر
کیا سوچتی ہیں...... یہ کون جانے

ہر بار، اسی طرح سے بوندیں،
رنگوں بھری بدلیوں سے چھن کر
آتی ہیں مسافتوں پہ پھیلے
تانبے کے ورق کو ٹھنٹھنانے،

ہر سال، اسی طرح کا موسم
ہر بار، یہی مہکتی دُوری
ہر صبح، یہی کٹھور آنسو
رونے کے کب آئیں گے زمانے

(۲۸-۱-۱۹۶۱)

صبح کے اجالے میں

تو نے، ہم سفر دیکھا،
صبح کے اجالے میں
راہ کا سہانا پن!

دائیں بائیں، دو رویہ
شادماں درختوں کی،
جھومتی قطاریں ہیں
ہر قدم کے وقفے پر
دُھوپ کی خلیجیں ہیں
چھاؤں کے جزیرے ہیں

جس طرف کو سورج ہے،
اس طرف، درختوں کی
شبنمیں جبینوں پر
تیرگی کا پر تو ہے!
تیرگی کے پر تو کا
رخ ہماری جانب ہے

جس طرف کو سورج ہے
اس کی دوسری جانب
سر بلند پیڑوں کی
شبنمیں جبینوں پر
روشنی کا پرتو ہے
روشنی کے پرتو کا
رخ ہماری جانب ہے

تو نے ہم سفر دیکھا
دھوپ ہے کہ سایا ہے
رہرووں کی مایا ہے
دور دور تک...... رستا
دور دور تک ...... دنیا
دور دور تک...... سب کچھ
اک عجب سہانا پن......
صبح کے اجالے میں

۱-۱۹۶۱)

غزل

چہرہ اداس اداس تھا، میلا لباس تھا
کیا دِن تھے، جب خیال تمنا لباس تھا

عریاں، زمانہ گیر، شررگوں جبلتیں،
کچھ تھا تو ایک برگ دِل اُن کا لباس تھا

اس موڑ پر ابھی جسے دیکھا ہے، کون تھا؟
سنبھلی ہوئی نگاہ تھی، سادہ لباس تھا

یادوں کے دھندلے دیس، کھلی چاندنی میں رات
تیرا سکوت کس کی صدا کا لباس تھا

ایسے بھی لوگ ہیں جنھیں پرکھا تو انکی روح
بے پیرہن تھی، جسم سراپا لباس تھا

صدیوں کے گھاٹ پر، بھرے میلوں کی بھیڑ میں
اے دردِ شادماں، ترا کیا کیا لباس تھا

دیکھا تو دِل کے سامنے سایوں کے جشن میں
ہر عکسِ آرزو کا انوکھا لباس تھا

امجد، قبائے شہ تھی کہ چولا فقیر کا
ہر بھیس میں ضمیر کا پردا لباس تھا

(۱۲-۳-۱۹۶۱)

دوام

کڑکتے زلزلے اُمڈے، فلک کی چھت گری، جلتے نگر ڈولے
قیامت آ گئی سورج کی کالی ڈھال سے ٹکرا گئی دُنیا
کہیں بجھتے ستاروں، راکھ ہوتی کائناتوں کے
رکے انبوہ میں کروٹ، دو سایوں کی
کہیں اس کھولتے لاوے میں بل کھاتے جہانوں کے
سیہ پشتے کے اوجھل، ادھ کھلی کھڑکی،
کوئی دم توڑتی صدیوں کے گرتے چوکھٹے سے جھانکتا چہرہ،
زمینوں آسمانوں کی دہکتی گرد میں لتھڑے خنک ہونٹوں سے یوں پیوست ہے اَب بھی

ابھی جسے سحر بستی پہ جیتی دُھوپ کی مایا انڈیلے گی
گلی جاگے گی، آنگن ہمہمائیں گے،
کوئی نیندوں لدی پلکوں کے سنگ اٹھ کر
کہے گا...... ''رات کتنی تیز تھی آندھی!''

(۳-۱۹۶۱)

بول انمول

اب یہ مسافت کیسے طے ہو اے دل، تو ہی بتا
کٹتی عمر اور گھٹتے فاصلے، پھر بھی وہی صحرا

چیت آیا، چیتاوَنی بھیجی، اپنا وچن نبھا،
پت جھڑ آئی، پتر لکھے...... آ ! جیون بیت چلا،

خوشیوں کا مکھ چوم کے دیکھا دُنیا مان بھری
دُکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدا

اپنا پیکر، اپنا سایہ، کالے کوس کٹھن،
دُوری کی جب سنگت ٹوٹی، کوئی قریب نہ تھا

شیشے کی دیوار زمانہ، آمنے سامنے ہم
نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا،

اپنے گرداب اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھلی،
کس کے دوست اور کیسے دشمن! سب کو دیکھ لیا

راہیں دھڑکیں، شاخیں کڑکیں، اِک اِک ٹیس اٹل
کتنی تیز چلی ہے اَب کے دُھول بھری دکھنا

دُکھڑے کہتے لاکھوں مکھڑے، کس کس کی سُنیے
بولی تو اِک اِک کی ویسی، بانی سب کی جدا

(۴-۱۹۶۱)

بھادوں

گدلی گدلی جھیل ہوا کی جس کے خنک پاتال میں ہم
سانس روک کے ڈھونڈھ رہے ہیں جیون کے انمول خزانے: گھائل خوشیاں چنچل غم

سب کچھ ایک اُداس تھکن کے بندھن، کیا ماضی کیا حال
ایک اتھاہ لگن کی کڑیاں، سبز درخت اور کالے کھمبے، ٹھنڈے کنج اور جلتے جال

سامنے دیکھیں تو لوہے کی باڑ کے پار اُفق سے پرے
سوکھے، سرد، سیاہ بنوں کی چھدری چھدری چھاؤں میں جھلکیں دھبے آتی صبحوں کے

بھورے بادل کی سلوٹ میں پیلے پیتل کی ڈوری
دُکھتی جیوٹ رکتی جولاں دِل کی کل میں ایک کمانی وقت کے چلتے پہیے کی

کیا کرے کوئی یہی بہت ہے جاگتی ٹیس اِک درد بھری
مدھم جھونکے کا اِکتارا، کھلتے گھونگھٹ آرزوؤں کے بھیگی پلکیں سوچوں کی

سدا رہے یہ سماں سہانا رت یہ سلگتی سانسوں کی
پھیلتی اگنی میں بل کھاتی گیلی دھرتی، دھندلا امبر، کھلتی کونپل بھادوں کی

(۲۲-۹-۱۹۶۱)

غزل

اب کے تمھارے دیس کا یہ روپ نیارا تھا
بکھرا ہوا ہواؤں میں سایہ تمھارا تھا

گم سم کھڑے ہیں اونچی فصیلوں کے کنگرے
کوئی صدا نہیں، مجھے کس نے پکارا تھا

رات، آسماں پہ چاند کی منڈلی میں کون تھا
تم تھے کہ اک ستار بجاتا ستارا تھا

ان دوریوں میں قرب کا جادو عذاب تھا
ورنہ تمھارے ہجر کا غم بھی گوارا تھا

دل سے جو ٹیس اٹھی، میں یہ سمجھا، پجاریو
پتھر کے دیوتا کا تڑپتا اشارا تھا

تالی بجی تو سامنے ناٹک کی رات تھی
آنکھیں کھلیں تو بجھتے دِلوں کا نظارا تھا

دُنیا کے اس بھنور سے جب اُبھرے دُکھوں کے بھید
اک اِک اتھاہ بھید، خود اپنا کنارا تھا

پھر لوٹ کر نہ آیا زمانے گزر گئے
وہ لمحہ جس میں ایک زمانہ گزارا تھا

(۹-۱۹٦۱)

پامال

سورج نکلا، رنگ رچے،
کرنوں کے قدموں کے تلے
سوکھی گھاس پہ کھلتے ہوئے
پیلے پیلے پھول ہنسے!
کرنوں کے چرنوں پر جب
اس مٹی نے رکھ دیئے لب
مسلی گھاس پہ بجھ گئی، سب
ہنستی زندگیوں کی چھب!
اس مٹی کے ذرے ہم
کیا کہیں اپنا قصہ غم!
کیا کہیں، ہم پر کیا بیتی،
اندھے کھوٹے قدموں کی

ٹھوکر اپنی قسمت تھی
ٹھوکر کھائی، آنکھ کھلی
آنکھ کھلی تو بھید کھلا
وہ سب جن کے قدموں کا
ریلا ہم کو روند گیا
ان میں سورج کوئی نہ تھا!
میری طرح اور تیری طرح
سب مٹی کے ذرّے تھے

(۹-۱۹۶۱)

معاشرہ

ہر طرف، رات کے اندھیروں کے
سرسراتے وجود سایوں کی طرح
دبے پاؤں رواں ہیں، کیا کیجے

جب ذرا بھی سسکتی روحوں کی
کوئی ناداں، نچنت انگڑائی
اپنا بوجھل لباس اتارتی ہے
سائے رکتے ہیں سائے ہنستے ہیں

رات، خاموشیاں، دھڑکتے دل
صحن میں چارپائیوں کے گرد
ہمہ تن گوش، جاگتی دیوار ......
جھانکتا سر ...... منڈیر پر گملا
دیکھتی آنکھ ...... نیم وا روزن

جب ذرا بھی برہنہ سپنوں کی
کوئی رو پیرہن سنبھالتی ہے
ایک دھیمی سی چاپ، نیند کی نند
دو قدم بڑھ کے لوٹ جاتی ہے!

رات کے فرش پر قدم رکھتی
ساعتیں اپنے ساتھ لائی ہیں
کتنے ارمان، کتنی زنجیریں!

جب بھی جھونکوں کی گدگدی سے کسی
آرزو کی قبا مسکتی ہے
جب بھی پگھلے دِلوں کے جوش کا
بند کوئی ذرا چٹختا ہے
سایوں کے دیو اپنے کالے مکٹ
ابروؤں کی شکن پہ سرکا کر،
جاگتی کروٹوں کو گھورتے ہیں

(۱-۱۰-۱۹۶۱)

ایرپورٹ تے

میدان ہوائی جہازاں دے اساں وچ قطاراں' ڈٹھی
سو سو بتی بلدی کائی رتی تے کائی چٹی
اُڈدے آون اُڈدے جاون کونجاں وانگ کھٹولے
جتھاں ڈٹھی ست اسماناں دی ہر گھجل تھاں ان ڈٹھی
لکھاں رنگ برنگے بھیساں وچ پنے پھردے ہسدے ٹولے
جتھاں ہسدیاں ہسدیاں تروڑلئی ساڈے دِل دی کھڑدی سٹی
تیری رہ وچ پندھ پہاڑاں دے' تیرے کھمباں ہیٹھ سمندر
اُڈدیئے کونجے لے چل ساڈی درد فراق دی چٹھی
جا آکھیں دُوردے دیساں دے وسنیکاں نوں جا آکھیں
تسیں بدلاں دے وچ وسدے اسیں مٹی دے وچ مٹی

صاحب کا فروٹ فارم

یہ دُھوپ، جس کا مہین آنچل،
ہوا سے مس ہے......
رتوں کا رس ہے!
تمام چاندی، جو نرم مٹی نے پھوٹتے بور کی چٹکتی چنبیلیوں میں انڈیل دی ہے
تمام سونا، جو پانیوں ٹہنیوں شگوفوں میں بہہ کے ان زرد سنگتروں سے ابل پڑا ہے
تمام دھرتی کا دھن، جو بھیدوں کے بھیس میں دُور دُور تک سرد ڈالیوں پر بکھر گیا ہے
رتوں کا رس ہے،
رتوں کے رس کو گداز کر لو،
سبو میں بھر لو،
یہ پتیوں پر جمے ہوئے زرد زرد شعلے، یہ شاخساروں پہ پیلے پیلے پھلوں کے گچھے
جو سبز صبحوں کی سج میں پل کر، کڑی دوپہروں کی لو میں ڈھل کر
خنک شعاعوں کی اوس پی کر

رتوں کے امرت سے اپنے نازک وجود کے آبگینے بھر کر'
حد نظر تک بساطِ زر پر لہک رہے ہیں
شراب اُن کی کشید کر لو'
سبو میں بھر لو'
سبو میں بھر لو' یہ مدھ' یہ مدرا' کہ اس کی ہر بوند سال بھر سو صراحیوں میں دیے جلائے
یہی قرینہ ہے زندگی کا' اسی طرح سے' لہکتے قرنوں کے اس چمن میں' نجانے' کب سے
ہزار ہا تپتے پیلے سورج' لنڈھا رہے ہیں وہ پگھلا تانبا' وہ دُھوپ' جس کا مہین آنچل'
دِلوں سے مس ہے' وہ زہر' جس میں دُکھوں کا رس ہے'
جو ہو سکے تو اس آگ سے بھر لو من کی چھاگل'
کبھی کبھی ایک بوند اس کی' کسی نوا میں دیا جلائے'
تو وقت کی پینگ جھول جائے

(۸-۳-۱۹۶۲)

غزل

میری مانند، خود نگر، تنہا
یہ صراحی میں پھول نرگس کا

اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی
اپنا سایہ بھی اپنا سایہ نہ تھا

میرے نزدیک تیری دُوری تھی
کوئی منزل تھی کوئی عالم تھا

ہائے وہ زندگی فریب آنکھیں
اس نے کیا سوچا، میں نے کیا سمجھا

صبح کی دُھوپ ہے کہ رستوں پر
منجمد بجلیوں کا اِک دریا

گھنگھروؤں کی جھنک منک میں بسی
تیری آہٹ، میں کس خیال میں تھا

کون یاد آ گیا تھا، یاد نہیں
دل بھی اِک ضرب بھول بھول گیا

سارے بندھن کڑے سہی، لیکن
تجھ سے یہ ربط، دھندلا اور گہرا

پھر کہیں دِل کے برج پر کوئی عکس
فاصلوں کی فصیل سے اُبھرا

پھول مرجھا نہ جائیں بجروں میں
مانجھیو! کوئی گیت ساحل کا

وقت کی سرحدیں سمٹ جاتیں
تیری دُوری سے کچھ بعید نہ تھا

عمر جلتی ہے، بخت جلووں کے
زیست مٹتی ہے، بھاگ مٹی کا

رہیں دردوں کی چوکیاں چوکس، — پھول لوہے کی باڑ پر بھی کھلا
جو خود اُنکے دلوں میں تھا تہ سنگ — وہ خزانہ کسی کسی کو ملا!
لاکھ قدریں تھیں زندگانی کی، — یہ محیط، اِک عجیب زاویہ تھا
سانس کی رو میں، رونما طوفاں، — تیغ کی دھار پر بہے دھارا
ہے جو یہ سر پہ گیان کی گٹھڑی — کھول کر بھی اسے کبھی دیکھا
روز جھکتا ہے کوئے دِل کی طرف — کاخِ صدبام کا کوئی زینہ

امجدؔ ان آنسوؤں کو آگ لگے
کتنا نرم اور گراں ہے یہ دریا

(۷-۵-۱۹۶۳)

دو دِلوں کے درمیاں

شام کی بجھتی ہوئی لَو، ایک ان بوجھی کسک،
پانیوں، پگڈنڈیوں، پیڑوں پہ سونے کی ڈلک،
جامنوں کے بور کی بھینی مہک میں دُور تک
جسم اندر جسم سائے، لب بہ لب پرچھائیاں
انگ انگ انگڑائیاں

ہائے یہ مدھم سے شعلے اُس مقدس آگ کے
جس کی لپٹوں میں سدا سمٹے رہے پھیلے رہے
تیرے ہونٹوں اور مرے ہونٹوں کے جلتے فاصلے
ساتھ چلتی سنگتوں کے سنگ بہتی دُوریاں
دو دِلوں کے درمیاں

(۱۷-۵-۱۹۶۲)

بارکش

چیختے پہیے، پتھ پتھریلا، چلتے بجتے سم
تپتے لہو کی رو سے بندھی ہوئی اِک لوہے کی چٹان
بوجھ کھینچتے، چابک کھاتے جنور! ترا یہ جتن
کالی کھال کے نیچے گرم گٹھیلے ماس کا مان

لیکن تیری اُبلتی آنکھیں، آگ بھری، پرآب،
سارا بوجھ اور سارا کشٹ ان آنکھوں کی تقدیر
لاکھوں گیانی، من میں ڈوب کے ڈھونڈھیں جگ کے بھید
کوئی تری آنکھوں سے بھی دیکھے دُنیا کی تصویر!

(۶-۶-۱۹۶۳)

وقت

وقت ہے اِک حریم بے دیوار
رقص کرتے ہوئے گزرتے ہیں،

جس کے دوار آنگنوں میں، سدا
دائروں میں ہزارہا ادوار

بیتتی بات اور آنے والی آن
سب زمانے، تمام عرصہ دہر،

امرامروز اور فر فردا،
وقت کی ایک تیز لہر کی عمر!

کل وہ سب کچھ تھا، جو کچھ آج بھی ہے
جب وہ سب کچھ کہ جس نے ہونا ہے

آج جو کچھ ہے، اس زمانے میں تھا
ہو چکا تھا، یہ کھیل ہونی کے!

لاکھ قرنوں کے ان قرینوں میں
صرف اِک پل، بسیط، بے مدت

نہ کوئی دِن نہ سن، نہ یوم نہ عصر،
اپنے بھیدوں کی حد میں لامحدود

اس کی یک رنگیوں میں یکساں ہیں
سلسلے بجتی بجتی سیجوں کے بھی،
ہنستے سنجوگ بھی، بجھے دِل بھی،
مسئلے، مسلے مسلے پھولوں کے بھی

وقت بہتا ہوا وہ دھارا ہے،
وقت جیتی حقیقتوں کا جتن
جس کی رو خنجروں کی دھار نہیں
مرنے والے کبھی مرے ہی نہیں

اتنے پہلو ہیں اس پہیلی کے
ہے فقط انگلیوں کا لمس اور بس
اور اِک ہم، کہ جن کے علم کی لِم
ہائے اندھی روایتوں کے طلسم
(۲۹-۶-۱۹۶۲)

Richard Aldington
کی نظم کا ترجمہ

لاہور

کوئی کچھ بھی کہے، کہے مجھے کیا،
بات جو میرے دِل میں ہے، میں اگر
آج اپنی زباں پہ لا نہ سکا،
کل، مرے بعد، تیری منڈلی پہ جب
آگ برسے گی...... کون بولے گا!

بات یہ ہے، عظیم شہر، تجھے......
شاید اس بات کا گماں بھی نہ ہو،
ایک دِن آئے گا...... خدا نہ کرے،
کبھی وہ دِن بھی آئے...... جب ترے برج
قدر انداز دشمنوں سے بھرے

آگ انڈیلیں گے، تیری گلیوں پر
-تیری گلیاں کہ جن میں بستے ہیں آج
لوگ، نیندوں میں تیرتے پیکر،
لوگ ڈھلتی مسرتوں سے نڈھال
زنگ کے پھول، شاخِ آہن پر

کوئی دیکھے اگر تو شہر شہیر،
جن تجیلی سلوں پہ کھینچی تھی،
تو نے گل کار سلسلوں کی لکیر
اُن کی جھڑتی تہوں میں دفن ہیں آج
پھول برساتی بجلیوں کے ضمیر!

دیکھتے دیکھتے بکھر بھی گئی،
مٹتے کھنڈروں کو جیتے آنکنوں سے
جوڑنے والی آنسوؤں کی لڑی
میں نے اکثر سنی ہے تیری کراہ
کھو کھلے قہقہوں کی بھیڑ میں بھی!

یوں گری وقت کی کمان کی زہ
سب کٹیلے طلسم ٹوٹ گئے
رہ گئے ہم، سو اپنا حال ہے یہ،
اتنی نازک ہیں الجھنیں اپنی
جیسے پنکھڑی میں دھاریوں کی گرہ

یاد بھی ہے کہ مٹنے والوں نے
تیری مٹی کو رکھ کے پلکوں پر
یہ قسم کھائی تھی کہ تیرے لیے
اسی دھرتی سے ہم، دھڑکتی ہوئی
زندگی کا خراج مانگیں گے!

اسی دھرتی پہ، آج شہر جمیل!
کتنی اونچی ہے، کتنی کڑیل ہے
تیری بے سنگ سرحدوں کی فصیل
جس کے گھیرے میں گھاٹیوں کی گھٹا
جس کی خندق، سمندروں کی سبیل!

یہی، بل کھاتی، جاگتی دیوار،
جو دِلوں کی سلوں سے ڈھالی گئی
آج، جب اُس کے کنگروں کی قطار،
صف سوزاں، ہم نہیں چونکے،
کل جب اُس کے سلگتے رخنوں کے پار
خون چھلکے گا، ہم نہیں ہوں گے

ہم نہیں ہوں گے، لیکن اے مرے دیس،
ایک دِن آئے گا، خدا نہ کرے
کبھی وہ دِن بھی آئے، جب ترے برج
قدر انداز دشمنوں سے بھرے
تری گلیوں پہ آگ انڈیلیں گے،
تیری گلیاں، کہ جن کے سایوں میں کل
لڑکھڑاتے مقدروں کے پرے
ٹوٹتی سیڑھیوں سے اتریں گے
وقت کی موج سے اُبھرتی ہوئی
قوم کی وردیاں پہن لیں گے!

ہم بھی اے کاش دیکھ سکتے انھیں
کون ہوں گے وہ لوگ، جن کے بدن
خود ہمارے لہو کی دیواریں،
جن کے سینوں میں سنسناتے الاؤ
خود انہی کے شعور کی لپٹیں!

یوں تو کس کو خبر ہے کل کیا ہو
پھر بھی، اے شہرِ خوش قبا، تیرے

دوش پر ہے جس آفتاب کی ڈھال
جب یہ سورج بدست فردا ہو
جب قدم ظلمتوں کا پسپا ہو
یاد رکھنا کہ یہ رتیں، فصلیں،
یہ بہاریں جو آگ کی رو سے
زندگی کے گلاب کا رس لیں،
رو گئی ہیں انھیں، کسے معلوم،
کتنی بے عزم، زرد رو نسلیں

کتنے بے عزم، زرد رو پیکر،
چند خوشیوں کا سوگ، جن کے جتن،
چند خوابوں کی گرد، جن کے نگر،
یہی ہم، جن کی ہر تڑپ سے ہے آج،
سو شکن دشمنوں کے ماتھوں پر،
فتح اس آتشیں شکن کی شکست
جو ترے دشمنوں کے ماتھوں پہ ہے
کتنی ان مٹ ہیں، کون جانتا ہے
یہ جو ریکھائیں ترے ہاتھوں پہ ہیں

(۲۴-۸-۱۹۶۲)

حربے

زندگی کے اسلحہ خانے سے اس روحِ زبوں کو کیا ملا'
صرف دو ترچھے سے ابرو' صرف دو پتلے سے ہونٹ

کتنے مہلک ہیں یہ حربے' کیا کہوں......

جب بھی کوئی شبھ گھڑی
اُس کے دِل پر کھینچ دیتی ہے سنہری زائچے'
جب بھی میٹھے مکر کی جھوٹی ہنسی
اُس کے چہرے پر بچھا دیتی ہے زریں زاویے
اس کی ترچھی کانپتی جھکتی بھنویں
......دو کٹاریں' جن کے اکھڑے اکھڑے قبضے' انکھڑیاں'
اُس کے پتلے مسکراتے ٹیڑھے ہونٹ'
......آریاں' جن کی ذنتیلی دھار' دانت.....'

ٹوٹ پڑتی ہیں دِلوں پر اس طرح'
بے سپر سچائیوں پر اس طرح کرتی ہیں وار'
جیسے باقی جتنی جوہردار قدریں زندگی کے اسلحہ خانے میں ہیں سب ہیچ ہیں'

جانے کتنی ایسی روحیں ان کمیں گاہوں میں ہیں'
کون ہو اُن کا حریف'
کاش خود اُن کا ضمیر بے نیام
اُن کی آہن پوش تقدیروں کو گھائل کر سکے
کاش اس خنداں ہزیمت کا تصور' ایک دن'
ہو سکے خود اُن کے دِل پر حملہ آور' فتح یاب!

(۹-۱۹۶۲)

کارِ خیر

ننگی موت کے بھینٹ ہوا جب بیس روپے کا دان
جڑے تڑے پنجر پر ڈال کے سرد سفید کفن
قبر میں جھونک دیئے لوگوں نے اِک دکھیا کے پران

اچھی تھی وہ اپاہج بڑھیا جس نے جیتے جی!
بچے کھچے ٹکڑوں کے بدلے جنت کی جاگیر
امرت بیتی زندگیوں کے چرنوں پر رکھ دی

کیسے بھاگ اس ابھاگن کے تھے جس نے مر کر بھی
ایک سفید کفن کے بدلے رنگیں چہروں پر
کوثر کی اِک اجلی موج کی چاندی برسا دی

اس کا جینا اس کا مرنا اُس کے سارے روگ
صرف اس کارن تھے کہ کبھی کبھی ان شعلوں کی اوٹ
اپنی خوشیوں کو سنولا لیں کچھ دھن والے لوگ

میری روح کو ڈھانپ گیا اِک زہر بھرا طوفان
ننگی موت کے بھینٹ ہوا جب بیس روپے کا دان

(۱۹۶۲-۱۰)

غزل

بڑھی جو حد سے تو سارے طلسم توڑ گئی
وہ خوش دلی، جو دِلوں کو دِلوں سے جوڑ گئی

ابد کی راہ پہ بے خواب دھڑکنوں کی دھمک
جو سو گئے انھیں بجھتے جگوں میں چھوڑ گئی

یہ زندگی کی لگن ہے کہ رتجگوں کی ترنگ
جو جاگتے تھے انہی کو یہ دھن جھنجوڑ گئی!

وہ ایک ٹیس جسے تیرا نام یاد رہا
کبھی کبھی تو مرے دِل کا ساتھ چھوڑ گئی

رکا رکا ترے لب پر عجب سخن تھا کوئی
تری نگہ بھی جسے ناتمام چھوڑ گئی

فراز دِل سے اترتی ہوئی ندی، امجد
جہاں جہاں تھا حسیں وادیوں کا موڑ، گئی

(۱۹۶۳ء)

غزل

جو دِل نے کہہ دی ہے وہ بات ان کہی بھی نہ تھی
یہ موج تو تہ دریا کبھی رہی بھی نہ تھی
جھکیں جو سوچتی پلکیں تو میری دُنیا کو
ڈبو گئی وہ ندی جو ابھی بہی بھی نہ تھی
سنی جو بات کوئی ان سنی تو یاد آیا
وہ دِل کہ جس کی کہانی کبھی کہی بھی نہ تھی
نگر نگر وہی آنکھیں، پسِ زماں، پسِ در
مری خطا کی سزا عمر گمرہی بھی نہ تھی
کسی کی روح تک اِک فاصلہ خیال کا تھا
کبھی کبھی تو یہ دُوری رہی سہی بھی نہ تھی
نشے کی رو میں یہ جھلکا ہے کیوں نشے کا شعور
اس آگ میں تو کوئی آبِ آگہی بھی نہ تھی
غموں کی راکھ سے 'امجد' وہ غم طلوع ہوئے
جنھیں نصیب اِک آہِ سحر گہی بھی نہ تھی

(۱۹۶۳ء)

مشاہیر

کیا لوگ تھے، جن کی گردن پر
تلوار چلی ...... اِک سرد تڑپ
...... اِک خون میں لتھڑی ہوئی کروٹ
اور وقت کے سیمیں دھارے پر
اک سطر لہو کی چھوڑ گئے!

اچھے تھے وہ جن کو سولی کی
رسی سے لٹک کر نیند آئی
اک تیز کھٹک! اک سرد تڑپ
اور وقت کی دُکھتی چیخوں میں
اک شبد کی شکتی چھوڑ گئے

مٹی بھی اَب ان ساونتوں کی
ان کھوئے ہوئے کھنڈروں میں نہیں
اک سطر لہو کی کانپتی ہے
اک شبد کی شکتی ڈولتی ہے
تاریخ کی گلتی پستک پر
اک نام کا دھبا باقی ہے

کیا کچھ نہ ملا ان جیالوں کو
شعلوں پہ قدم رکھنے میں سکوں
جینے کے لیے، مرنے کی لگن
اے وائے وہ جلتی روحیں جنھیں
ہر درد ملا، منزل نہ ملی!

کل اُن کی زرہ پوش آرزوئیں
جس آگ کی رو میں بہتی ہوئی
نیزوں کی انی پر ناچ گئیں
وہ آگ، تمھاری دُنیا ہے
وہ آگ تمھارے پاؤں تلے،
جتنوں کی لہکتی جنت ہے
اس اگنی سے، اس جیتے جگوں
کی کھلتی ہوئی پھلواڑی سے
دو چار دہکتے پھول چنو
اتنا ہی سہی، اتنا تو کرو
تاریخ کی گلتی پستک پر
اک نام کا دھبا ہو کہ نہ ہو

(۱۹۶۲ء)

غزل

اپنے دِل کی چٹان سے پوچھو، ریزہ اِک پنکھڑی کا کتنا بوجھل ہے
اک آنسو کی بوند میں دیکھو، دُنیا دُنیا، عالم عالم جل تھل ہے

جس کو دیکھو اپنے سفر کی دُنیا بھی ہے، اپنے سفر میں تنہا بھی......،
قدم قدم پر اپنے آپ کے سامنے ہے اور اپنے آپ سے اوجھل ہے

روح سے روح کا نازک بندھن، پھولوں کی زنجیر میں جکڑی زندگیاں
کتنے دیکھے ہیں، کتنا چین ہے، کیسی دُھوپ ہے، کتنا گہرا بادل ہے

آنکھ کی پتلی، سانس کی ڈوری، دِل کی تھاپ، اِک پل کی نرت کا تماشا ہے
گلتی کھوپڑیوں سے چنی دیواروں پر اِک جلتی جوت کی جھل جھل ہے

ایک زمانے سے یہی رستہ زیرِ قدم ہے، اِک اِک جھونکا محرم ہے
آج جو من کی اوٹ سے دیکھا ہر سو اِک ان دیکھی رت کی چھل بل ہے

بہتی روشنیاں، بے کار شعاعیں،...... بکھری ٹھیکریاں، بے حرف سلیں
اک دِن انت یہی ہے مگر وہ ایک کرن جو دِل کے ورق پر جدول ہے

(۱-۱۹۶۳)

دل پتھر کا......؟

اس پتھر پر، اک اک پل کی گھایل آنچ بھی گھاؤ
اس پنکھڑی کو بہانہ سکا طوفانوں کا بھی بہاؤ
دل پتھر کا،
پتھر پنکھڑی پھول کی......

دل کیا جانے کہاں ہے وہ بے انت سمے کا پڑاؤ
جہاں پہ جل کر راکھ ہوئے ہیں زندگیوں کے الاؤ
دل جو سنے تو جکڑے ہوئے سناٹوں کی یہ کراہ
اِک سندیس ہے جینے والو ہم کو یاد نہ آؤ

دل کو یاد کریں وہ سمے، دِل بھول چکا وہ سبھاؤ
رات کی میلی کروٹ، آخری سانسوں کا ٹھہراؤ
کسی امر ارمان کی ہچکی، کسی صدا کے شبد
کہیں سے ڈھونڈھو، ان شبدوں کو

اے بے مہر ہواؤ!
کبھی کھلے پتھر پر پنکھڑی پھول کی

(۱-۱۹۶۳)

ہوٹل میں

بادل گرجا...... گرے سنہری پردے دِلوں، دریچوں پر......

بند ہوئے دو گول پپوٹے، چونچ میں دب گئی گرم زبان
چھری چلی حلقوم پہ، تڑپا تپتے توے پہ تڑختا ماس
سج گئے میز پہ مے کے پیالے، بٹ گیا طشتوں میں پکوان

چھت پر بارش، نیچے اُجلے کالر، گدلی انتڑیاں
ہنستے مکھ، ڈکراتی قدریں، بھوکی مایا کے سب مان

باہر...... ٹھنڈی رات کا گہرا کیچڑ...... درد بھرے آورش
چلو یہاں سے...... ہمیں پکارے ننگی سوچوں کا رتھ بان

(۴-۱۹۶۳)

ایک شام

دیکھ پھر آج بھی اس نگری میں، شام کی کرنیں تیرے ساتھ چلی ہیں، تیرے ساتھ جلی ہیں
دیکھ اَب کہیں کہیں ان لمبی لال لووں کی لڑیاں، بجھ کر، رستوں سے پیوست پڑی ہیں،
کہیں کہیں یہ زرد سلگتے تیکھے بان دِلوں میں چبھ کر ٹوٹ گئے ہیں،

آسمان سے لے کر سطحِ زمیں تک ہر سو پھیل گئی ہیں...... لاکھ خراشیں
دُکھتی خراشیں، گہری، الجھی ہوئی لہریلی
پگھلی ہوئی بے جسم سلاخیں، پتلی پتلی، پیلی پیلی،
دیکھ اَب ان سیال سلاخوں کی چمکیلی باڑ پہ جتنے پھول تھے، اُن کو توڑ کے لے گئے جھونکے
اور اَب باقی صرف اِک سرد سبہ الجھاؤ!

بجھتی ہوئی اِک سانس کے قیدی،
دیکھ اَب تیرے سامنے ہیں وہ سارے سرد سیاہ زمانے
جن کے بھنور میں تیرے دیپ کی لو اس وقت سے لرزاں ہے،
پہلا سورج صدیوں پہلے جب تیرے دِل میں ڈوبا تھا!

(۳-۴-۱۹۶۳)

پہاڑوں کے بیٹے

مرے دیس کی ان زمینوں کے بیٹے' جہاں صرف بے برگ پتھر ہیں' صدیوں سے تنہا
جہاں صرف بے مہر موسم ہیں اور ایک دردوں کا سیلاب ہے عمر پیما!

پہاڑوں کے بیٹے'
چنبیلی کی نکھری ہوئی پنکھڑیاں' سنگ خارا کے ریزے'
سجل' دودھیا' نرم جسم ...... اور کڑے کھردرے سانولے دل
شعاعوں' ہواؤں کے زخمی'
چٹانوں سے گر کر خود اپنے ہی قدموں کی مٹی میں اپنا وطن ڈھونڈھتے ہیں

وطن' ڈھیر اک ان منجھے برتنوں کا'
جسے زندگی کے پسینوں میں ڈوبی ہوئی محنتیں دربدر ڈھونڈھتی ہیں'

وطن، وہ مسافر اندھیرا،
جو اونچے پہاڑوں سے گرتی ہوئی ندیوں کے کناروں پہ شاداب شہروں میں رک کر
کسی آہنی چھت سے اٹھتا دُھواں بن گیا ہے

ندی بھی زرافشاں، دُھواں بھی زرافشاں،
مگر پانیوں اور پسینوں کے انمول دھارے میں جس درد کی موج ہے عمر پیما،
ضمیروں کے قاتل اگر اس کو پرکھیں،
تو سینوں میں کالی چٹانیں پگھل جائیں!

(۴-۴-۱۹۶۳)

غزل

جو ہو سکے تو مرے دِل اَب اِک وہ قصہ بھی
ذرا سنا کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی

کبھی سفر ہی سفر میں جو عمرِ رفتہ کی سمت،
پلٹ کے دیکھا تو اُڑتی تھی گردِ فردا بھی

بڑے سلیقے سے دُنیا نے میرے دِل کو دیئے
وہ گھاؤ، جن میں تھا سچائیوں کا چرکا بھی

کسی کی روح سے تھا ربط اور اپنے حصے میں تھی
وہ بے کلی جو ہے موجِ زماں کا حصہ بھی

یہ آنکھیں، ہنستی وفائیں یہ پلکیں، جھکتے خلوص
کچھ اس سے بڑھ کے کسی نے کسی کو سمجھا بھی

یہ رسم، حاصلِ دُنیا ہے اک یہ رسمِ سلوک
ہزار اس میں سہی نفرتوں کا ایما بھی،

دِلوں کی آنچ سے تھا برف کی سلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہوا پسینہ بھی

مجھے ڈھکی چھپی ان بوجھی الجھنوں سے ملا
جچی تلی ہوئی اک سانس کا بھروسا بھی

کبھی کبھی انہی اُلھڑ ہواؤں میں امجد
سنا ہے دُور کے اک دیس کا سندیسا بھی

(۲۹-۷-۱۹۶۳)

غزل

جاوداں قدروں کی شمعیں بجھ گئیں تو جل اٹھی تقدیرِ دل
اب تو اس مٹی کے ہر ذی روح ذرّے میں بھی ہے تصویرِ دل

اپنے دِل کی راکھ چن کر، کاش ان لمحوں کی بہتی آگ میں
میں بھی اِک سیال شعلے کے ورق پر لکھ سکوں تفسیرِ دل

میں نہ سمجھا، ورنہ ہنگاموں بھری دُنیا میں، اِک آہٹ کے سنگ،
کوئی تو تھا، آج جس کا قہقہہ دِل میں ہے دامن گیرِ دل

رت بدلتے ہی، چمن جو، ہم صفیر، اَب کے بھی، کوسوں دُور سے
آ کے جب اس شاخ پر چہکے، مرے دِل میں بجی زنجیرِ دل،

کیا سفر تھا، بے صدا صدیوں کے پل کے اُس طرف، اُس موڑ تک
پے بہ پے اُبھرا، سنہری گرد سے اِک نالہ دِل گیرِ دل

وارِ دُنیا نے کئے مجھ پر تو امجد میں نے اس گھمسان میں
کس طرح، جی ہار کر، رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

(۳۱-۸-۱۹۶۳)

ایکٹریس کا کنٹریکٹ

مرا وجود مری زندگی کا بھید ہے، دیکھ
یہ ایک ہونٹ کے شعلے پہ برگ گل سے خراش
یہ ایک جسم کے کندن میں گدگدی سے گداز
یہ ایک روح، بھنچے بازوؤں میں کھیلتی لہر

ذرا قریب تو آ، دیکھ تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ، رس بھرے لب، جنکی اِک جھلک کے لیے
کبھی قبیلوں کے دِل جوشنوں میں دھڑکے تھے!
جو تو کہے تو یہی ہونٹ، سرخ رس بھرے ہونٹ
ترے لہو میں شگوفے کھلا بھی سکتے ہیں!

قریب آ، یہ بدن، میری زندگی کا طلسم،
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے
جو تو کہے تو یہی نرم، لہریا آنچل،
یہی نقاب، مری چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی ادا، مری انگڑائیوں سے مسکی ہوئی
یہ آبشار، ڈھلانوں سے گر بھی سکتی ہے!

بس ایک شرط ...... یہ گوہر سطور دستاویز!
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سہی،
اکائیوں کے اُدھر، جتنے دائرے ہوں گے،
ادھر بھی اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے

(۱۹۶۳ء)

سانحات

کوئی بھی واقعہ کبھی تنہا نہیں ہوا‘ ......
ہر سانحہ اک الجھی ہوئی واردات ہے

آندھی چلے تو گرتی ہوئی پتیوں کے ساتھ
لاکھوں صداقتوں کے ہیں ڈانڈے ملے ہوئے
دیکھے کوئی تو دیکھتی آنکھوں کے سامنے
کیا کچھ نہیں کہ دیکھنا جس کا محال ہے

اک جام اٹھا کے میں نے زمیں پر پٹخ دیا‘
سوچو‘ اس ایک لمحے میں کیا کچھ نہیں ہوا
ہر سمت ڈھیر‘ صد صدفِ سانحات کے
قوسِ کنارِ قلزمِ دوراں پہ لگ گئے

پرکھو، تو رنگ رنگ کی ان سیپیوں پہ ہے
لہروں کے تازیانوں کی تحریر، الگ الگ

چاہو، تو واقعات کے ان خرمنوں سے تم
اک ریزہ چن کے فکر کے دریا میں پھینک دو
پانی پہ اک تڑپتی شکن دیکھ کر ہنسو!

چاہو تو واقعات کی ان آندھیوں میں بھی
تم یوں کھڑے رہو کہ تمھیں علم تک نہ ہو
طوفاں میں گھر گئے ہو کہ طوفاں کا جزو ہو

(۱۹۶۳ء)

ریزۂ جان

ہماری زندگیوں کے سمندروں میں چھپے
کہیں دِلوں کی تہوں میں، عجیب اندیشے!
کبھی کبھی، انہی لہروں کی گونج میں، ہم نے
اک آنے والے تموج کی سیٹیاں بھی سنیں،
مگر یہ کس کو خبر، کیا ہے اِک وہ ربطِ عمیق
وہ گھور اندھیروں کا تر کہ ہمارے ذہنوں میں
وہ ایک بس بھری حس...... جو ہوا میں بہتے ہوئے
سیاہ لمحوں کی آہٹ کو بھانپ لیتی ہے!
کسے خبر ہے کہ اس جان وتن کی گتھی میں،
لہو کی پگھلی سلاخوں کے اس جھمیلے میں
کڑی وہ کون سی ہے، الجھے سلسلوں کی کڑی
کہ جسکے دِل میں یہ مدھم سی اِک جھنک، پھر آج
مرے لیے کوئی مبھم سی بات لائی ہے!

میں ڈر گیا ہوں...... پُر اسرار واسطوں کے نظام!
یہ خوف بھی تو ہے اِک وہ حصارِ بے دیوار،
جو میرے دِل کو تری بستیوں نے بخشا ہے،
تری ہی دین، یہ سانحوں کو سونگھتی حس
ترا ہی خوف، اس ان بوجھے رابطے کا ثمر،
میں ایک ریزہ جاں ان عجب قرینوں میں
ترے ہی خوف کی زد میں، تری گرفت میں ہوں
ترے ہی ربط کی حد میں...... تری پناہ میں ہوں

(۱۹۶۳ء)

مرے خدا! مرے دل!

مرے ضمیر کے بھیدوں کو جاننے والے
تجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا، مرے دل
کہ میں ان آندھیوں میں عمر بھر، جدھر بھی بہا
کوئی بھی دھن تھی میں اس لہر کی گرفت میں تھا
جو تیری سوچ کی سچائیوں میں کھولتی ہے
ہے جس کی رو میں تری ضو، مرے خدا، مرے دل

مرے لہو میں تری لو ہے دھڑکنوں کا الاؤ
تجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا، مرے دل
کہ اس طلسم زیاں کے کسی جھمیلے میں،
ذرا کبھی جو قدم میرے ڈگمگا بھی گئے،
تو اِک خیال، ابد موج سلسلوں کا خیال
مرے وجود میں چنگاریاں بکھیر گیا،

سنبھل کے دیکھا تو دُنیا میں اور کچھ بھی نہ تھا
نہ دُکھتی سانس کے ارماں، نہ جیتی مٹی کے لوبھ
نہ کوئی روگ، نہ چنتا، نہ میں، نہ میرے جتن
جو مجھ میں تھا بھی کوئی گن ترے ہی گیان سے تھا
کچھ اور ڈوب کے گہرائیوں میں جب دیکھا
تو ہر سلگتی ہوئی قدر کے مقدر میں
نہاں تھے تیرے تقاضے، مرے خدا، میرے دل

ہیں تیری کرنوں میں کڑیاں چمکتے قرنوں کی
تجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا، مرے دل،
کہ اس کرے پہ ہے جو کچھ بھی اُس کے پہلو میں ہیں
وہ شعلے، جن پہ شکن ہے، تری ہی کروٹ کی

ترے ہی دائرے کا جزو ہیں وہ دُور کہ جب
چٹانیں پگھلیں، ستارے جلے، زمانے ڈھلے
وہ گردشیں جنھیں اپنا کے ان گنت سورج
ترے سفر میں بجھے تو انھی اندھیروں سے
دوامِ درد کی اِک صبح اُبھری، پھول کھلے
مہک اٹھی تری دُنیا، مرے خدا، مرے دل،

کھلا ہوا مری سانسوں میں ہے سفر تیرا
تجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا مرے دل،
کہ گو یہی میرا پیکر ضمیرِ خاک سے ہے،
مگر اسی مرے تپتے بدن کی بھٹی سے
کشید ہوتی ہوئی ایک ایک ساعت زیست،

وہ گھونٹ زہر کا ہے جو مجھی کو پینا پڑا
یہ زہر کون پیے؟ کون اپنے سینے میں
یہ آگ انڈیل کے، ان ساحلوں سے بھید چنے
جہاں پہ بکھرے ہیں صدہا صداقتوں کے صدف!
یہ زہر کون پیے؟ کون بجھتی آنکھوں سے
غروب وقت کی خندق کے پار دیکھ سکے
جہاں ازل کے بیاباں میں عمر پیا ہے
حقیقتوں کا وہ دھارا، کہ جس کی لہروں میں آج
گلوں کا رس بھی ہے فولاد کا پسینہ بھی!

مرا شعور انہی گھاٹیوں میں بھٹکا ہے

قدم قدم پر مری ٹھوکروں کی زد میں رہیں
کرخت ٹھیکریاں ان کٹھور ہاتھوں کی
جو زندگی میں ترے آستاں پہ جھک نہ سکے
قدم قدم پہ یہ فاصلوں کے سنگم پر
بس اِک مجھی کو اس ان مٹ تڑپ سے حصہ ملا
تری جرس کی صدا میں ہیں رَت جگے جس کے
یہی تڑپ تری کایا، یہی تڑپ، مرا انت
جو انت بھی ہو، سو ہو، میں تو مٹتی مٹی ہوں
دھڑکتی ریت کے بے انت جھکڑوں میں سدا
رواں رہیں، ترے محمل! مرے خدا مرے دل،

تری ہی آگ کی میٹھی سی آنچ ہیں مرے دُکھ
یہ راز تو ہی بتا اب، مرے خدا، مرے دل
یہ بات کیا کہ ترے بے خزاں خزانوں سے
جو کچھ ملا بھی ہے مجھ کو تو اِک یہ ریزہ درد،
ہیں جس کی جھولی میں کھلیان تیرے شعلوں کے
اور اَب کہ سامنے، جلتی حدوں کی سرحد ہے
ہر ایک سمت مری گھات میں ہیں وہ روحیں
جو اپنے آپ میں اِک راکھ کا سمندر ہیں

یہ روحیں، بس بھرے، ذی جسم، آہنیں سائے
انھی کے گھیرے میں ہیں اب یہ بستیاں یہ دیار
کہیں یہ سائے، جو پتھرائی آرزوؤں کو
سرابِ زر کی کشش بن کے گدگداتے ہیں
مری لگن کو نہ ڈسنے لگیں، میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ سائے، یہ کیچڑ کی مورتیں، جن کے
بدن کے دھبوں پہ رخت حریر کی ہے پھبن،
مری کرن کی نہ چھب نوچ لیں، میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ آگ نہ بجھ جائے جس کے انگ میں ہیں
ترے دوام کی انگڑائیاں، میں سوچتا ہوں،
نہیں، یہ ہو نہ سکے گا! جو یوں ہوا بھی تو پھر؟
نہیں! ابھی تو یہ اک سانس! ابھی تو ہے کیا کچھ!
ابھی تو جلتی حدوں کی حدیں ہیں لامحدود،
ابھی تو اس مرے سینے کے ایک گوشے میں
کہیں، لہو کے تریڑوں میں، برگ مرگ پہ اِک
کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے جہاں
ہر اِک طلب تری دھڑکن میں ڈوب جاتی ہے
ہر اِک صدا ہے کوئی دُور کی صدا، مرے دل
مرے خدا، مرے دل

(۴-۹-۱۹۶۴)

پچاسویں پت جھڑ

اتنا بھرپور سماں تھا...... مگر اَب کے تو ہر اک گرتے ہوئے پتے کے ساتھ
اور اک مٹی کی تہ میرے لہو میں تیری،
اور اِک ریت کی سلوٹ مرے دِل میں اُبھری،
اور اِک زنگ کی پپڑی مری سانسوں پہ جمی
اتنا بھرپور سماں تھا، مگر اَب کے تو مجھے جس نے بھی دیکھا یہ کہا:
''جانے کیا بات ہوئی، کچھ تو بتا......
تیرے ہونٹوں سے تو اَب ایک وہ مرجھائی ہوئی موج تبسم بھی گئی،''

میں یہ اَب کس کو بتاؤں کہ مرے پیکر میں
اک تپش ایسی بھی ہے، جس کے سبب
روح کی راکھ پہ شعلوں کی شکن پڑتی ہے
سانس کے بل میں پنپنے کی سکت بنتی ہے
ٹوٹتی کڑیوں میں جینے کے جتن جڑتے ہیں،

میں یہ اَب کس کو بتاؤں، کہ مرے جسم کے ریشوں کے اس الجھاؤ میں ہے
ایک وہ گرتی سنبھلتی ہوئی نازک سی دھڑکتی ہوئی لہر،
جو ہر اِک دُکھ کی دوا ڈھالتی ہے،
جو گزرتے ہوئے لمحوں کے قدم روکتی ہے،
مجھ سے کہتی ہے کہ "دیکھ ایک برس اور بجھا،
دیکھ اَب کے تری بتیسی پہ دھبا سا پڑا، دانت گرا،
گھاؤ یہ اَب نہ بھرے گا، یہی بہتر ہے کہ ہونٹوں پہ لگا لے کسی جھوٹی سی کڑی سوچ کی مہر

اب کے تو ایک مجھی کو یہ خبر ہے کہ میں کیوں مہر بلب پھرتا ہوں،
ورنہ سب لوگ یہی کہتے ہیں "اس شخص کو دیکھو، اَب تو
اُس کے ہونٹوں سے وہ مرجھائی ہوئی موج تبسم بھی گئی"

(۲۵-۹-۱۹۶۴)

جلوس جہاں

میں پیدل تھا، میرے قریب آ کے اس نے، بہ پاس ادب، اپنے تانگے کو روکا
اچانک جو بجری پٹڑی پر سم کھڑکھڑائے، سڑک پر سے پہیوں کی آہٹ پھسل کر جو ٹھہری،
تو میں نے سنا ایک خاکستری نرم لہجے میں مجھ سے کوئی کہہ رہا تھا،
''چلیں گے کہیں آپ؟ بازار، منڈی، سٹیشن، کچہری!
پلٹ کر جو دیکھا، تو تانگے میں کوئی سواری نہیں تھی، فقط اک فرشتہ، پھٹے کپڑے پہنے
عنانِ دو عالم کو تھامے ہوئے تھا،

میں پیدل تھا، اتنے میں کڑ کا کوئی تازیانہ، بہا فرشِ آہن پہ ٹاپوں کا سرپٹ تریڑا،
کوئی تند لہجے میں گرجا'' ہٹو سامنے سے ہٹو'' اور پرشور پہیے گھنا گھن مری سمت جھپٹے،
بہ مشکل سنبھل کر جو دیکھا، کھچا کھچ بھرے تیز تانگے کی مسند پہ، اک صورتِ سگ
لجامِ فرس پر جھکی تھی!

یہ لطفِ کریمانہ خوشدلاں بھی، یہ پرغیظ خوئے سگاں بھی،
مرے ساتھ رو میں ہیں لوگوں کے جتنے رویے، یہ سب کچھ یہ سارے قضیے،
غرض مندیاں ہی غرض مندیاں ہیں، یہی کچھ ہے اس رہگزر پر متاعِ سواراں،
میں پیدل ہوں، مجھ کو جلوسِ جہاں سے انہی ٹھوکروں کی روایت ملی ہے،

(۱۹۶۴-۹)

بے نشاں

میں اَب آیا ہوں...... اتنے برسوں کے بعد

آندھیاں آئیں...... بدلیاں برسیں
دب گئیں، خاک کی تہیں تہ خاک،
بہتی مٹی میں بہ گئی...... مٹی!
میرے نادیدہ پیشرو، تری قبر
کس جگہ تھی یہ اَب کسے معلوم
یوں ہی، اپنے قیاس سے میں نے
ریت کی اِک شکن کو پہچانا،
مٹتی سطحوں پہ ایک ڈوبتی سطر
اک خطِ خاک، جس پہ کچھ کنکر
میں نے پہلے تو چن کے رکھ بھی دیئے
پھر خیال آیا...... اَب یہ کون کہے

قبر تیری یہیں کہیں تھی ......مگر
تھی کہاں؟......شاید اس جگہ تو نہ تھی
کچھ جو سوچا ......نہ جانے کیا سوچا'
ذہن میں لاکھ الجھ گئے...... خاکے
میں نے کنکروہ سب بکھیر دیئے!

بے نشاں خاک' میرے سامنے اب
ان جہانوں کا ایک حصہ ہے'
جن کے بھیدوں کی تھاہ میں تو ہے
جن کے سایوں کی قبر میں مَیں ہوں!

(۹-۱۰-۱۹۶۴)

غزل

کبھی تو سوچ! ترے سامنے نہیں گزرے
وہ سب سمے، جو ترے دھیان سے نہیں گزرے

یہ اور بات کہ ہوں اُن کے درمیاں، میں بھی!
یہ واقعے کسی تقریب سے نہیں گزرے،

ان آئینوں میں جلے ہیں ہزار عکس عدم،
دوام درد! ترے رتجگے نہیں گزرے،

سپردگی میں بھی اِک رمز خود نگہ داری،
وہ میرے دِل سے مرے واسطے نہیں گزرے،

بکھرتی لہروں کیساتھ ان دنوں کے تنکے بھی تھے
جو دِل میں بہتے ہوئے رک گئے نہیں گزرے،

انھیں حقیقت دریا کی کیا خبر امجد،
جو اپنی روح کی منجدھار سے نہیں گزرے،

(۱۹۶۴ء)

ایک شبیہ

کچھ دنوں سے قریب دِل ہے وہ دن
جب ' اچانک' اسی جگہ' اِک شکل
میری آنکھوں میں مسکرائی تھی

اک پل کے لیے تو ایک وہ شکل
جانے کیا کچھ تھی' جھوٹ بھی' سچ بھی'
شاید اِک بھول' شاید اِک پہچان

کچھ دنوں سے تو جان بوجھ کے اب
یہ سمجھنے لگا ہوں' میں ہی تو ہوں'
جس کی خاطر یہ عکس اُبھرا تھا'

کچھ دنوں سے تو اَب میں دانستہ
اس گماں کا فریب کھاتا ہوں،
روز، اِک شکل اس دوراہے پر
اب مرا انتظار کرتی ہے،
ایک دیوار سے لگی، ہر صبح
ٹکٹکی باندھے، نیم رخ، یک سو
اب مرا انتظار کرتی ہے
میں گزرتا ہوں، مجھ کو دیکھتی ہے
میں نہیں دیکھتا، وہ دیکھتی ہے

اُس کے چہرے کی ساخت...... ساعت دید
زرد ہونٹوں کی پتریاں ...... پیتل،
سرخ آنکھوں کی ٹکڑیاں...... قرمز
روغنی دُھوپ میں، دھنسے ہوئے پاؤں
منتظر، منتظر، اداس، اداس

کبھی پل بھر کو، ایک یہ چہرہ،
جانے کیا کچھ تھا، لیکن اَب تو مجھے

اپنی یہ بھول بھولتی ہی نہیں
ایک دِن یہ شبیہ دیکھی تھی،
کچھ دنوں سے قریب دِل ہے وہ دن
کچھ دنوں سے تو بیتتے ہوئے دن
اسی اِک دِن میں ڈھلتے جاتے ہیں
دن گزرتے ہیں اَب تو یوں، جیسے
عمر اسی دِن کا ایک حصہ ہے
عمر گزری...... یہ دِن نہیں گزرا

جس طرف جاؤں، جس طرف دیکھوں
مجھ سے اوجھل بھی، میرے سامنے بھی،
شکل اِک ٹین کے ورق پہ وہی،
شکل اِک دِل کے چوکھٹے میں وہی

(۱۰-۴-۱۹۶۵)

ایک فلم دیکھ کر

دھیرے دھیرے ساز بجے'
اُس کے انگ انگ نے اِک انگڑائی لی'
اُبھری رقص کی لے'
لچکی اُس کے بدن کی ڈھال
اک اِک تیز نرت کے ساتھ
ناچتے جسم سے اِک اِک بندھن اترا'اِک اِک تکمہ ٹوٹا'پلو ڈھلک ڈھلک کر کر کے' گرے
اور پھر'......سامنے' اِک
جگ مگ جسم
گرتی مڑتی 'ٹوٹ ٹوٹ کے جڑتی......مرمر کی ڈھلوان'
قاشیں' رگیں' خلیے 'ماس' مسام
سب کچھ' ایک تھرکتے بہتے عکس کا جزو
سب کچھ' جسم کی باغی سلطنتوں کی ایک عجب دُنیا
گول سڈول کرّے' انمول زمینیں' ساحل' جھرنے' دُھوپ'
چاندنی' مخمل' پھول

سب کچھ، رقص کے روپ میں ڈھلتا، ٹک ٹک چلتا، اِک متحرک عکس،
سب کچھ، پاس بلاتے، پیاس بڑھاتے، ارمانوں کے سراب!

آج اِک دوست نے پاس بلا کر چائے پلا کر مجھ سے مری اِک بوسیدہ سی نظم سنی،
اور پھر اُس کے بعد یہ فلم!
باہر نکلا تو سنسنان سڑک تھی، شب خزاں تھی،
ٹھنڈی تیز ہوا میں ننگی شاخیں ناچ رہی تھیں،
میں بھی، میری نظم بھی، دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے، اتنے لبادوں میں،
(۱۵-۴-۱۹۶۵)

درُونِ شہر

مجھ سے پوچھو، یہیں کہیں اس پھلواڑی میں کیسے کیسے پھول کھلے تھے،
آج انہی پھولوں کی مقدس پنکھڑیوں پر ہیں کیچ کے دھبے،
ان روحوں اور ان راہوں سے اُڑتی ہوئی اس کیچ کے دھبے،

مجھ سے پوچھو،
یہیں کہیں ہے، اسی سنہرے شہر کے اندر؛
اینٹوں کی تہذیب کے سینے میں...... اِک دلدل،
گدلے، مگھم ''، میلے کچیلے، دِلوں کی دلدل،
کڑوے زہر میں لت پت رسمیں،
میں نے جن سے وفا کی ریت نبھائی،
میں نے جن کی خاطر

چڑ کے اپنے ضمیر پہ جھینے'
سکے اپنے دِل پر داغے'
پہیوں کے دندانوں میں دِن کاٹے'
سلوں کی دھج کو تج کے' دھجیاں اوڑھ کے
کال کی دُھوپ میں کنکر رولے'

کس سے پوچھوں' میری وفا کا یہی صلہ تھا؟
پیتل کے جبڑوں میں کھنکنے والی' کانچ کی آنکھوں میں مسکانے والی'
یہی کسیلی پیلی نفرت'...... میری وفا کا یہی صلہ تھا؟

(۲۹-۴-۱۹۶۵)

یہ سرسبز پیڑوں کے سائے

سیہ سنگ، تپتی، سڑک پر، یہ سرسبز پیڑوں کے سائے،
ہوا اس جگہ کتنی ٹھنڈی ہے، جھونکوں پہ سایوں کے دھبے بھی ہیں کتنے ٹھنڈے

درختوں کے اس جھنڈ سے جب میں گزرا،
خنک چھاؤں کی ٹکڑیاں سی مرے جسم پر تھرتھرائیں،
مرے جسم سے گر کے ٹوٹیں
عجب اِک اچھوتی سی ٹھنڈک مری روح میں سرسرائی،
سہانے دنوں کی انوکھی سی ٹھنڈک،
وہ دِن کتنے اچھے تھے، جب ایک بھیگی ہوئی سانس کی ریشمیں رو
مرے دِل کی چنگاریوں کے پسینے سے مس تھی،
وہ مبہم سی خوشیاں، جو چھپ چھپ کے ہر موڑ پر، نت نئے بھیس میں،
آ کے، روحوں سے ملتی ہیں، مل کر بچھڑتی ہیں، جیسے

ہواؤں پہ سایوں کے چھدرے سے دھبے'
فضاؤں میں صدہا سفید و سیہ آفتابوں کے بکھرے سے ریزے'
سرِ خاک بے ربط' بے سطر' خاکے'
یہ سب کچھ بس اِک دو قدم تک......
پھر آگے وہی دُھوپ' شاداب دردوں کی جانب ہمکتی ہوئی
سنگریزوں پہ بہتی ہوئی دُھوپ'
حدِ عدم تک!

(۶-۵-۱۹۶۵)

صدائے رفتگاں

یہ واقعے کسی تقویم میں نہ تھے مذکور
یہ لہریں، جو ابھی اِن ساحلوں سے گزری ہیں
یہ سانحے تو ہمارے دِلوں سے اُبھرے تھے
ہماری خاک سے یہ قصہ سن سکو تو سنو!

بروزِ جنگ، صفِ دشمناں میں سب کچھ تھا
ہمارے پاس تو کچھ بھی نہ تھا، نہ مکر، نہ حرص،
بس ایک سادہ سی دلدادگی تھی اپنی متاع
ابد کا چہرہ اسی اِک سپر کی اوٹ میں تھا
تمھارے پاس تو سب کچھ ہے، وہ زمانہ بھی ہے
ہمارے صدق نے اِک عکس جس کا دیکھا تھا

تمھارے حصے میں مٹی کی وہ مرادیں بھی ہیں
ہمارے دِل نے کبھی جن کی آرزو بھی نہ کی
یہ سیلِ خاک، یہ دُنیا، کسے خبر کہ یہاں
ہماری خاک بھی اَب زیرِ خاک ہے کہ نہیں؛
سنو، سنو، یہ صدا کس کی ہے، کبھی تو سنو،
ہمیں تو ہیں جو شبوں کو تمھاری بستی میں
دِلوں کے بند کواڑوں کو کھٹکھٹاتے ہیں
''یقینِ مرگ کی نیندوں سے کھیلتی روحو،
ہماری زیست کا اِک دِن کبھی بسر تو کرو!''

(۱۵-۵-۱۹۶۵)

خطہ پاک

خطۂ پاک ترے نام دِل آرا کی قسم
کتنے سچے ہیں، سجیلے ہیں، جیالے ہیں، وہ دل،
جاگتی، جیتی، زرہ پوش، چٹانوں کے وہ دل،
جن کے مواج لہو کا سیلاب
تیری سرحد کی طرف بڑھتی ہوئی آگ سے ٹکرایا ہے،

دیکھتے دیکھتے بارود کی دیوار گری،
ہٹ گئے دشمن کے قدم
خندقیں اٹ گئیں شعلوں سے...... مگر ہائے وہ دل،
زندہ...... ناقابل تسخیر...... عظیم!
ہائے دِلوں کی وہ فصیل،
جاوداں اور جلیل،
جس کے زینوں پہ ظفر مند ارادوں کی سپاہ،
جس کے برجوں میں ملائک کے جیوش،
جس کا پیکر ہے کہ اِک سطر جلی،
لوحِ ابد پر تاباں
آیۂ عمر شہیداں کی طرح!

(۱۳-۹-۱۹۶۵)

سپاہی

تم اس وقت کیا تھے

تمھارے محلّکوں، تمھارے گھروں میں تو سب کچھ تھا

آسائشیں بھی، وسیلے بھی

اس کبریائی کی ہر تمکنت بھی!

سبھی کچھ تمھارے تصرف میں تھا...... زندگی کا ہر اِک آسرا بھی،

کڑے بام و در بھی،

خزانے بھی زر بھی

چمن بھی، ثمر بھی،

مگر تم خود اس وقت کیا تھے،

تمھاری نگاہوں میں دُنیا دُھوئیں کا بھنور تھی،

جب اُڑتی ہلاکت کے شہپر تمھارے سروں پر سے گزرے،

تمھاری نگاہوں میں دُنیا دُھوئیں کا بھنور تھی

اگر اس مقدس زمیں پر مرا خوں نہ بہتا،

اگر دشمنوں کے گرانڈیل ٹینکوں کے نیچے

مری کڑکڑاتی ہوئی ہڈیاں خندقوں میں نہ ہوتیں،

تو دوزخ کے شعلے تمھارے معطر گھروندوں کی دہلیز پر تھے،

تمھارے ہر اِک بیش قیمت اثاثے کی قیمت

اسی سرخ مٹی سے ہے، جس میں میرا لہو رچ گیا ہے،

(۲۷-۹-۱۹۶۵)

یہ قصہ حاصل جاں ہے

یہ قصہ حاصل جاں ہے اسی میں رنگ بھریں،
لہو کی لہر کے لہجے میں اپنی بات کہیں،

دھوئیں میں آگ کے تیشے ہیں، زخم ہیں، اَب ہم
انہی کڑکتے دھماکوں سے اپنے گیت چنیں،

ہمارے جیتے گھروندے، ہمارے جلتے جتن
یہ مورچے، یہ جیالے سپاہیوں کی صفیں،

جلی زمین، سیہ ڈھول، صدق خوں کی مہک
قدم قدم پہ یہاں مہرومہ کی سجدہ گہیں،

یہ دِن بھی کتنے مقدس ہیں، بے بہا ہیں کہ آج
ہمارا حصہ بھی ہے طالع شہیداں میں

اسی ترختی ہوئی باڑھ میں ہمیں کو ملیں
سنورتی، بجتی، نکھرتی، دِلوں کی اقلیمیں،

یہ جینے والوں نے دیکھا کہ اس گروہ میں تھے
وہ جاں ہار، کہ جو موت کو بھی فتح کریں

میں اُن کو طاق ابد سے اتار لایا ہوں
یہ شمعیں، جن کی لویں میرے آنسوؤں میں جلیں

(۱۵-۱۰-۱۹۶۵)

چہرۂ مسعود

مالک، تیری اس دُنیا میں، آج ہماری زندگیوں کو کیسے کیسے دُکھوں کا مان ملا ہے!
ایسے دُکھ، جو ٹیس بھی ہیں اور دھیر بھی ہیں اور ڈھارس بھی ہیں!

مالک، آج اس دیس میں، اس بستی میں، کوئی اگر دیکھے تو، ...... ہر سو
بھری بہاروں، فصلوں، کھلیانوں پر پھیلی دُھوپ کی تہ کے تلے،
اک خون کے چھینٹوں والی چھینٹ کی میلی اور مٹیالی چادر بچھی ہوئی ہے،
موت کی میلی اور مٹیالی موج میں رنگ لہو کے، نقش لہو کے
ایک ایک چمکتی سطح کے نیچے، راکھ لہو کی، ساکھ لہو کی

کوئی اگر دیکھے تو آج اس دیس میں، بانس کی باڑ میں، دھان کے کھیت میں ٹھنڈی
ریت میں
جگہ جگہ پر...... بکھری ہوئی نورانی قبریں، آنگن آنگن روشن قدریں،
مائیں —— جن کے لال، مقدس مٹی،
بہنیں —— جن کے ویر —— منور یادیں،
بالک —— جن کی مایا —— بے سدھ آنسو،
مرنے والے کیسے لوگ تھے، اُن کا سوگ بھی اِک سنجوگ ہے، اُن کا دُکھ بھی، ایک عبادت
کیسے لوگ تھے، موت کی لہر پہ آگ کی پینگ میں جھولے، تجھ کو نہ بھولے، ہم کو نہ بھولے!

مالک —— اُن کے صدہا چہرے، اِک چہرہ ہیں —— پکی اینٹ کی رنگت والا چہرہ،
روحوں کی دیوار میں ایک ہی چہرہ، قبروں کی الواح میں ایک ہی چہرہ"

مالک، ہمیں بھی اس چہرے کی ساری خوشیاں، سارے کرب عطا کر
مالک، اس چہرے کا سجرا سورج سدا ہماری زندگیوں میں ڈوب کے اُبھرے!
(۱۹۶۵-۱۰)

ہوس

کبھی تو وہ دِن بھی تھے‘...... مگر...... اب
نہ جانے کیوں دِل سیاہ لہروں میں بہہ گیا ہے‘

کبھی تو وہ دِن بھی تھے...... مگر...... اب
زمیں محور میں‘ آسماں چوکھٹے میں‘ ہر چیز اپنی اپنی حدوں میں محدود‘ اپنی اپنی بقا میں باقی‘
شعاعوں میں کروٹیں وہی تابش گہر کی‘
ہواؤں میں دھاریاں وہی موج رنگ زر کی!

کہاں سے ڈھونڈھوں وہ دن‘...... وہ دن‘ جب
بدن پہ بے رنگ چیتھڑے تھے‘
..جہت‘ جہت میں الجھ گئی تھی
زمین...... اِک بے وجود نقطہ‘

جہان ...... اِک رائیگاں صداقت'
حیات ...... اِک بے وفا حقیقت'
عجیب دِن تھے' ہر ایک ذرّے کے دِل میں داغ فنا کا سورج اُبھر رہا تھا'
وہ دن' وہ احساس بے ثباتی'
وہ دولت بے زری' وہ اپنی نمود بے سود میں غم لازوال کو ڈھونڈھنے کی خوشیاں'

کہاں سے ڈھونڈھوں وہ دن' کہ اَب تو
ہوا کے ٹھنڈے غرور میں ہیں ہوس کے تیشے'
ہوا کے تیشے' جو طنز ہیں میری خود فراموشیوں مری بے لباسیوں پر'

مرے بدن کو بھی اَب تو درکار ہیں وہ ساماں'
جو رزق سم ہیں' جو مرگ دِل ہیں

(۵-۱۲-۱۹۶۵)

غزل

عمروں کے اس معمورے میں ہے کوئی ایسا دِن بھی، جو
روح میں اُبھرے، چاند کے سورج کے سیال سمندر کو
اتنے کام ہیں، ان مواج صفوں میں خوش خوش پھرتا ہوں
لیکن آج اگر کچھ اپنے بارے میں سوچا …… تو
ایک سفر ہے صرف مسافت ایک سفر ہے جزوِ سفر
جینے والے یوں بھی جیے ہیں، اِک عمر اور زمانے دو
یہ انجانا شہر، پرائے لوگ، اے دل! تم یہاں کہاں
آج اس بھیڑ میں اتنے دنوں کے بعد ملے ہو، کیسے ہو
دُنیا جبری تڑی سچائی، سب سچے، کوئی تو کبھی ……
اس اندھیر سے نکلے، اپنے جھوٹے روپ کے درشن کو
آخر اپنے ساتھ کبھی تو اِک بے مہر مروت بھی،
اپنے سارے نام بھلا کر، کبھی خود اپنے گن تو گنو،
کچی نیند اور جسم نے دُھوپ چکھی اور دِل میں پھول کھلے
گھاس کی سیج پہ میں ہوں، تمھارے دھیان ہیں آنے والے دنو!

(۱۹۶۵ء)

افریشیا

دریا کے پانیوں سے بھری جھیل کے کنارے
آئے ہیں دُور دُور سے افریشیا کے پنچھی!
اجلے پروں کا بھاگ ہیں یہ رزق جو اڑانیں!
اتنے سفر کے بعد...... یہ تٹ' یہ ذرا سا کھا جا'
جوہڑ میں اِک سڑی ہوئی پتی'...... چھوں کا چوگا'
اک گھونٹ زرد کیچ کا...... مرغابیوں کا راتب
اوراُس کے ساتھ' گھات میں زد کارتوس کی بھی
چنگاریوں کے تیز تڑختے ہوئے تریڑے
اور— پانیوں پہ بہتی ہوئی سنسناہٹوں میں
لہراتے پنکھ' اُبھرتے کماندار' زندہ چوکس
آزاد آبناؤں میں جیتے ہیں جینے والے
ٹھنڈی ہوا کی باس میں' بارود کے دھوئیں میں

(۲-۱-۱۹۶۶)

مسیحا

سدا لکھیں
انگلیاں یہ
لکھتی رہیں
لکھتی رہیں

انگلیاں یہ
کاغذ پر
رُکی ہوئیں
آنکھیں یہ
کاغذ پر
جمی ہوئیں !

گہری سوچ
جذب عمیق
آنکھوں سے
روح تلک
پھیلی اک
دھیان دھنک

آنکھیں سرخ
چپ، خود سوز
ڈورے، سرخ
لرزاں، محو!

سامنے اک
پارۂ جاں
درد ہی درد
ٹیس، کراہ،
بو، تلچھٹ،
جرثومے

کوئی سبیل؟
کچھ بھی نہیں
کوئی افق؟
کچھ بھی نہیں

آنکھیں - فکر،
آنکھیں - صدق
آنکھیں - کشف،

ایک رمق،
ایک رمق،
اِک یہ طریق
اِک وہ اصول
یہ مشروب
وہ محلول
کچھ کیپسول
سطر شفا،
حرفِ بقا،

آنکھیں یہ
سدا جلیں ،
سدا جئیں ،
سکھ بانٹیں

انگلیاں یہ
سدا لکھیں
لکھتی رہیں
سطر شفا
حرفِ بقا
لکھتی رہیں
لکھتی رہیں

(۳-۳-۱۹۶۶)

ننھے بچو!

ننھے بچو، مجھ کو اَب تک یاد ہے جب میں تمھاری عمر میں تھا،
تب، وہ لوگ جو مجھ سے بڑے تھے کتنے اچھے لوگ تھے،
سچے اور بھلے!

ننھے بچو! کل جب تم اس عمر میں ہو گے، میں جس عمر میں ہوں،
تب وہ لوگ جو تم سے بڑے تھے
کبھی کے مٹی اوڑھ کے سارے سو بھی چکے ہوں گے،
جانے تم اس وقت ہمارے بارے میں کیا سوچو گے!
شاید وہ دِن بڑے کٹھن ہوں پھر بھی اتنا کچھ تو یاد رکھو گے، نا!
کیسے لوگ تھے خود تو اپنے لہو میں ڈوب گئے
لیکن اس مٹی پر آنچ نہ آنے دی،
جس پر آج تمھاری آرزوؤں کے باغ مہکتے ہیں...

(۲۰-۴-۱۹۶۶)

جہاں نورد

سفر کی موج میں تھے، وقت کے غبار میں تھے
وہ لوگ، جو ابھی اس قریہ بہار میں تھے

وہ ایک چہرے پہ بکھرے عجب عجب سے خیال
میں سوچتا تو وہ غم میرے اختیار میں تھے

وہ ہونٹ، جن میں تھا میٹھی سی ایک پیاس کا رس
میں جانتا تو وہ دریا مرے کنار میں تھے

مجھے خبر بھی نہ تھی اور اتفاق سے کل
میں اس طرف سے جو گزرا، وہ انتظار میں تھے

میں کچھ سمجھ نہ سکا، مری زندگی کے وہ خواب
ان انکھڑیوں میں جو تیرے تھے کس شمار میں تھے

میں دیکھتا تھا...... وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے
ابھی یہیں تھے...... ابھی گردِ روزگار میں تھے

میں دیکھتا تھا...... اچانک، یہ آسماں، یہ کرے
بس ایک پل کو رکے اور پھر مدار میں تھے

ہزار بھیس میں، سیار موسموں کے سفیر،
تمام عمر مری روح کے دیار میں تھے

(۲۹-۴-۱۹۶۶)

کون دیکھے گا

جو دِن کبھی نہیں بیتا، ...... وہ دِن کب آئے گا
انہی دنوں میں اس اک دِن کو کون دیکھے گا!

اس ایک دِن کو ...... جو سورج کی راکھ میں غلطاں
انہی دنوں کی تہوں میں ہے ...... کون دیکھے گا

اس ایک دِن کو ...... جو ہے عمر کے زوال کا دن
انہی دنوں میں نمویاب کون دیکھے گا

یہ ایک سانس ...... جھمیلوں بھری جگوں میں رچی
اس اپنی سانس میں کون اپنا انت دیکھے گا

اس اپنی مٹی میں، جو کچھ امٹ ہے، مٹی ہے
جو دِن ان آنکھوں نے دیکھا ہے، کون دیکھے گا

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں، کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا، کون دیکھے گا

دو رویہ — ساحلِ دیوار، اور — پسِ دیوار
اک آئنوں کا سمندر ہے، کون دیکھے گا

ہزار چہرے خود آرا ہیں، کون جھانکے گا
مرے نہ ہونے کی ہونی کو کون دیکھے گا

ترخ کے گرد کی تہ سے اگر کہیں کچھ پھول
کھلے بھی، کوئی تو دیکھے گا...... کون دیکھے گا

(۳-۲-۱۹۶۶)

حضرت زینبؓ

وہ قتل گاہ، وہ لاشے، وہ بے کسوں کے خیام
وہ شب، وہ سینۂ کونین میں غموں کے خیام
وہ رات، جب تری آنکھوں کے سامنے لرزے
مرے ہوؤں کی صفوں میں ڈرے ہوؤں کے خیام
یہ کون جان سکے، تیرے دِل پہ کیا گزری
لٹے جب آگ کی آندھی میں غمزدوں کے خیام
ستم کی رات کی کالی قنات کے پیچھے
بڑے ہی خیمۂ دِل میں تھے عشرتوں کے خیام
تری ہی برق صدا کی کڑک سے کانپ گئے
بہ زیرِ چترِ مطلا شہنشہوں کے خیام
جہاں پہ سایہ کناں ہے ترے شرف کی ردا
اکھڑ چکے ہیں ترے خیمہ افگنوں کے خیام

(۱۹۶۶ء)

غزل

روئے عالم تھا جس کی جولاں گہ
اس نے کل مڑ کے مجھ سے دل مانگا
دھیان میں روز چھم چھماتا ہے
قہقہوں سے لدا ہوا تانگا
دو طرف بنگلے ریشمی نیندیں
اور سڑک پر فقیر اک ناگا
اب کے تو بک گیا سر مسجد
ان سیہ آڑھتوں میں اک بانگا
سبز پتوں کی اِک فصیل اُبھری
جب بھی گنجان باڑ کو جھانگا
وقت کے گھاٹ پر کسی کو تو ہو
اپنے دِل میں اترنے کا ہانگا
پھونک کر بانسری میں آگ اک بار
گانے والے سرود باراں گا

(۱۹۶۷ء)

یادوں کا دیس

کیسے جاؤں کیسے پہنچوں یادوں کے اس دیس
جہاں کبھی اِک آنگن کی دیوار پہ چپکے سے
دودھ کا ایک کٹورا رکھ جاتے تھے میرے لیے
غیبی ہاتھ...... جنھیں مٹی کی تہوں نے ڈھانپ لیا
جہاں کبھی اک قبے دار مکان میں شام ڈھلے
نیلے پیلے شیشوں والے صندوقوں کے پاس
میرے لیے آٹے کے کھولنے توے پہ تلتے تھے
اچھے ہاتھ...... جو مٹی کے کنگن میں گئے پتھرا
شاید ان دو قبروں کے اَب مٹ بھی چکے ہوں نشان
لیکن اس بجریلے پتھر پر اَب بھی ہیں میرے ساتھ
وہ دو محافظ روحیں جن کے چار مقدس ہاتھ
ڈھال گئے ہیں انگاروں میں انگ انگ مرا'

(۳-۱۹۶۸)

نوحہ

(والد کی وفات پر)

جو شمع بزمِ جہاں تھے
کہاں گئے وہ لوگ ؟
جو راحت دل و جاں تھے
کہاں گئے وہ لوگ ؟
روحِ عمر رواں تھے
کہاں گئے وہ لوگ ؟
ابھی ابھی تو یہاں تھے
کہاں گئے وہ لوگ ؟

(۱۰-۱۹۶۸)

فردا

مَسلخ

روز، اس مسلخ میں کٹتا ہے ڈھیروں گوشت،
دھرتی کے اس تھال میں، ڈھیروں گوشت،
اور پھر یہ سب ماس،
چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں
بستی بستی گلیوں اور بازاروں میں،
لمبی لمبی قطاروں میں،
جدا جدا تقدیروں میں،
بٹتا جاتا ہے......
ہر ٹکڑے کی اپنی آنکھیں، اپنا جسم اور اپنی روح
کہنے کو تو ہر ٹکڑے کا اپنا اپنا نام بھی ہے اور اپنا اپنا دیس بھی ہے،
اپنی اپنی امنگیں بھی،
......لیکن کچھ بھی ہو
آخر یہ سب کچھ کیا ہے

ڈھیروں گوشت
کھالیں، بھیجے، انتڑیاں،

یہ سب خود آگاہ، جیالے لوگ،
میں نے آج جنھیں اس برسوں پہلے کی تصویر میں دیکھا ہے،
یہ سب جسم،
جیتے ریشوں کے کس بل میں سنبھلے ہوئے یہ دھڑ،
آج کہاں ہیں...... یہ سب لوگ
اب تو اُن کی بو تک بھی،
شہرِ ابد کے تہہ خانوں سے نہیں آتی،
باقی کیا ہے،...... صرف
سورج کی اِک چنگاری......
اور اس چنگاری کے دِل میں دھڑکنے والی کلی،
جس کی ہر پتی کا ماس،
فرد......!
عصر......!
حیات......!

(۲۸-۳-۱۹٦۸)

اس دِن اس بر فیلی تیز ہوا......

اس دِن اس بر فیلی تیز ہوا کے سامنے میں کچھ پہلے سے بھی زیادہ بوڑھا سا لگتا تھا
شاید واقعی اتنے ترس کے قابل ہی تھا
اس دِن تم نے مجھ سے کہا تھا'
اک دِن میرے لیے تم اس دُنیا کو بدل دو گی' یہ تم نے کہا تھا'

اس دِن بھری سڑک پر تم نے پیڈل روک کے......
اپنے بائیسکل کو میرے بائیسکل کے ساتھ ساتھ چلا کر' مجھ سے کہا تھا:
''آپ ایسے لوگوں کو بھی روز یہاں پتھر ڈھونے پڑتے ہیں' روٹی کے ٹکڑے کی خاطر''

تھوڑی دُور تک بھری سڑک پر' دو پہیوں کے ساتھ وہ دو پہیے ڈولے تھے'
دندانوں میں ٹک ٹک کرتے بولے تھے' سب دُنیا نے دیکھا تھا'

اور اس دِن میں نے اپنے دِل میں سوچا تھا'
''کیسا شہر ہے یہ بھی' ایسی ایسی باغی روحیں بھی اس میں بستی ہیں......''

میں تو اسی تمھارے شہر میں اَب بھی روز اِک میز پہ پتھر ڈھونے جاتا ہوں'
کاغذ کے پتھر'
لیکن جانے تم اَب کہاں ہو' اے ری گول مٹول' سیانی گڑیا'
بیٹی! شاید تم تو کہیں کسی دہلیز پہ دو منقوط گلابی گال آنکھوں سے لگا کر
نئی سفید جرابوں والے کسی کے ننھے سے پیروں میں گرگابی کے تسمے کسنے بیٹھ گئیں
اور یہاں' ادھر اب' ساتھ ساتھ جڑے ہوئے میزوں کی اِک لمبی پٹڑی بچھ بھی چکی ہے'
حدِ زمیں تک'
ظلم کے ٹھیلے روز اس پٹڑی پر' بے بس زندگیوں کو دور اُفق کے گڑھے میں ڈھونے
آتے ہیں!

اور میں' اَب بھی تمھارے کہے پر' اس پٹڑی کے اِک تختے پر'
عمروں کی گنتی کے چھٹے دہے پر
اس دُنیا کا رستہ دیکھ رہا ہوں' جس میں تمھارے نازک دِل کی
مقدس سچائی کا حوالہ بھی تھا'

جانے پھر تم کب گزرو گی ادھر سے ...... اس دُنیا کو ساتھ لیے ......

(۲۸-۵-۱۹۶۸)

دُنیا مرے لیے تھی......

دُنیا مرے لیے تھی اِک بے مصرف مصروفیت
جیسے تھا ہی نہیں میں اس دُنیا میں
جیسے موت مرے جی میں جینے آئی ہو
پھر جب اُن کے کرم سے اُن کا نام مرے ہونٹوں پر آیا
سارا زمانہ، سب تقدیریں، دُنیائیں اور چاند ستارے
سب کچھ تھا بس ایک تموج
لہریں میں جن میں بہتا تھا،
لہریں جو میرے جی میں بہتی تھیں،
میں تو اس قابل بھی نہیں تھا......
یہ سب اُن کا کرم تھا
وہ مجھ کو یاد آئے تھے
میں نے اُن کو یاد کیا تھا

(۲۰-۶-۱۹۶۸)

اپنی آنکھ پہ......

اپنی آنکھ پہ پٹی باندھ کے دیکھو،
اپنی اوٹ سے اپنے آپ کو دیکھو،
اندھیارے میں سوچو،
کس کے ٹھنڈے، مشفق، حکمت والے ہاتھ تھے، جن میں
ٹھنڈی، تیز، کٹیلی، دھار تھی دُکھ کی،
چرتی جلد سے گرتی، انگاراسی بوندیں،
یہ اِک، سانس تو شاید......
اس اِک رکتی رستی سانس کے بعد تو شاید
میلی گیلی کافوری مٹی کا بچھونا......
اسی بچھونے سے میں اٹھا،
سدا جئیں وہ ٹھنڈے ہاتھ، جنھوں نے پٹی باندھی،
اب آنکھوں پر پٹی باندھ کے دیکھا، یہ دُنیا کتنی اچھی ہے!
تنہا بیٹھ کے سوچا،
اس اِک اتنی اچھی دُنیا میں بھی
کون ادھر کو میری جانب دیکھے گا
جب تک میری آنکھوں پر پٹی ہے!

(۱۱-۷-۱۹۶۸)

ایکسیڈنٹ

مجھ سے روز یہی کہتا ہے، پکی سڑک پر وہ کالا سا داغ، جو کچھ دِن پہلے
سرخ لہو کا تھا اِک چھینٹا، چکنا، گیلا، چمکیلا چمکیلا،
مٹی اس پہ گری اور میلی سی اِک پپڑی اس پر سے اتری اور پھر بیندھوری سا اِک خاکہ اُبھرا
جو اَب پکی سڑک پر کالا سا دھبا ہے، پسی ہوئی بجری میں جذب اور جامد...... ان مٹ!
مجھ سے روز یہی کہتا ہے، پکی سڑک پر مسلا ہوا وہ داغ لہو کا:

''میں نے تو پہلی بار اس دن
اپنی رنگ برنگی قاشوں والی گیند کے پیچھے
یونہی ذرا اِک جست بھری تھی
ابھی تو میرا روغن بھی کچا تھا
اس مٹی پر مجھ کو انڈیل دیا یوں کس نے
اوں اوں...... میں نہیں مٹتا، میں تو ہوں، اَب بھی ہوں''

میں یہ سن کر ڈر جاتا ہوں
کالی بجری کے روغن میں جینے والے اس معصوم لہو کی کون سنے گا؟
ممتا یک بھی چکی ہے چند ٹکوں میں
قانون آنکھیں میچے ہوئے ہے،
قاتل پہیے بے پہرا ہیں،

(۲۱-۷-۱۹۶۸)

کوہ بلند

تو ہے لاکھوں کنکریوں کے بہم پیوست دِلوں کا طلسم'
تیرے لیے ہیں ٹھنڈی ہوائیں' ان بے داغ دیاروں کی'
جن پر پیلے' سرخ' سنہرے دنوں کی حکومت ہے'
ایک یہی رفعت'
ترے وجود کی قدر بھی ہے اور قوت بھی'
تیرا وجود جو اس پاتال سے لے کر اوپر کی ان نیلی حدوں تک ہے'
تو اس اونچی مسند پر سے جھک کر دیکھ نہیں سکتا'

لیکن اس پاتال کے پاس جہاں میں ہوں
بڑا ہی گدلا اور کٹیلا...... کالی مٹی والا پانی ہے'
زہر کدوں سے آنے والی ندیوں کا پانی
جس کی دھار تری پتھریلی دیواروں سے جب ٹکراتی ہے'
تو میرے سینے میں دِل کی ٹوٹی کنکری ڈوبنے لگتی ہے'

اے رے اونچی مسند والے پہاڑ!
کبھی تو اپنی خاطر میری سمت بھی جھک کر دیکھ'

(۸-۸-۱۹۶۸)

ڈر کاہے کا

ڈر کاہے کا؟
جتنا زور تمھارے خیال کی رو سے تمھارے بدن میں ہے وہ سارا زور لگا کر
(اور تمھاری صحت بھی تو خیر سے اُنڈی پڑتی ہے نا)
اپنے سارے بدن کا زور لگا کر
چھینو......
اس سے، حصہ اُس کے روز ینے کا،
اس سے، ہر عکس اُس کے آئینے کا،
سب سے، حق جینے کا،
ڈر کاہے کا،
گرجو! اور کالے رسوں کی گرہیں کھل جائیں گی
بپھرو! اور جابر ہاتھوں کی ریکھائیں گھل گھل جائیں گی

جھپٹو! اور سب قدریں اِک میزان میں تل جائیں گی،

یوں بھی نہ مقصد حاصل ہو تو پھر کیا'

دیکھو، تمھارے گٹھیلے جثّے میں ہے ذہن کی جتنی طاقت' اس کو کام میں لاؤ'

اس اِک حرف کو دیکھو، شکل ہے جس کی اِک زنجیر کی صورت

بھرے کٹہرے میں تم میز پہ مکہ مار کے کہہ دو

''یہ اِک حرف تو اس پستک میں نہیں کہیں بھی......

پستک جس کے سب حرف اور سب سطریں سیدھی سیدھی ہیں''

تم دیکھو گے' ترازو کا وہ پلڑا جس میں تم ہو تمھاری جانب جھک جائے گا'

رہ گئی اِک یہ مقدس مٹی...... ہمیں تو ہیں اس کے ریزہ چیں'

ہم اس کی خاطر جی لیں گے' ہم اس کی خاطر مر لیں گے

(۱۵-۸-۱۹۶۸)

کمائی

بندے، جب مٹی کے اندر بھر جاتا ہے
لہو کا دھارا......
پھر جب آنکھیں روح کی ٹھنڈی سطح کو چھو کر دیکھتی ہیں دُنیا کو،
پھر جب یوں لگتا ہے، جیسے
اس پنڈے میں کھلی ہے سارے دیس کی سرسوں،
پھر جب باہیں ٹیڑھی ہو کر جھولتی ہیں چلنے میں،
پھر جب نفرت ایک ادھورے پیار سے دیکھ کے، ہنستی ہے ان پر، وہ جن
کی کچی سوچیں چلہ کش رہتی ہیں،
پھر جب دِل کہتا ہے: ''اے رے کرجوے! آج ہمارے لیے تم
کتنے کرمنڈل بھیجو گے امرت جل کے؟''
تب ایسے میں، کون یہ جانے، بندے
کون اس بھید کو پائے بندے!
کون یہ دیکھے لہو کی لہر کا سب روغن تو
اس بھوجن کا رس ہے،
وہ بھوجن جو کوڑا کرکٹ ہے اور جس کو کتے بھی نہیں کھاتے

(۱۱-۸-۱۹۶۸)

نیلے تالاب

سب اس گھاٹ پہ اک جیسے ہیں
جب سے نیل گگن کی ٹینکی سے پانی برسا ہے
جب سے سات سمندر، سات بھرے ہوئے ٹب، پانی کے
اس آنگن میں رکھے ہیں،
پہلے بھی سب لوگ اس گھاٹ پہ اِک جیسے تھے،
اور ...... اَب بھی، اس کالے نل میں، جب سے
کھٹ سے، کھنچ کر آنے والا پانی
چھک سے گرنے لگا ہے،
چکنی اینٹوں والے گھاٹ پہ، سارے خدا اور سارے فرشتے اور سب روحیں
اپنے غرور کی اس پھسلن میں اِک جیسی ہیں،

اے رے شہرابد کے واٹر ورکس کے رکھیا،
دِلوں کی صدرخ نلکی میں اپنی سطحیں ہموار نہ رکھ سکنے والے سب پانی،
سارے مقدس پانی
کس طرح تیرے نیلے تالابوں میں آ کر یک سو ہو جاتے ہیں،

(۲۴-۸-۱۹۶۸)

تب میرا دِل....

تب میرا دِل بجھ جاتا ہے،
میں ہوں جگ جیون کے جوہر ڈھونڈھنے والے جوہریوں کا جویا،
میرا دِل بجھ بجھ جاتا ہے،
اس پتلے گیلے گیلے آبی کاغذ پر،
جو یوں دُور تک اس پانی پر چسپیدہ ہے

جس دِن باری کا پانی لگتا ہے،
اور سڑک کے ساتھ اِک گھنے ذخیرے والی کیاری
تھمے ہوئے اور جمے ہوئے پارے سے بھر جاتی ہے،
جب ان سطحوں پر کرنوں کی دُھول بکھر جاتی ہے،
اور ہوا کا ہلکے سے ہلکا جھونکا بھی اُن کو چھونے سے ڈرتا ہے،
تب تو ادھر ادھر ہی میرا دِل کھنچتا ہے

مجھ کو بھا جاتی ہے
اچھے اچھے خیالوں کی چتریلی چادر اوڑھ کے ان چھتناروں میں یہ
بھٹکنے والی ٹھنڈک

سب کچھ تج کے، میں جب اس ٹھہرے پانی پر،
سایوں اور شعاعوں کی جھلمل میں کھو جاتا ہوں،
سارا آسمان اسی اجلے پانی پہ اتر کر مجھ کو دیکھ رہا ہوتا ہے،
میں ہوں جگ جیون کے جوہر ڈھونڈھنے والے جوہریوں کا جویا،
(۳۰-۸-۱۹۶۸)

یہ سب دن......

یہ سب دن
تنہا، نا یکسو
یہ سب الجھاوے
کالی خوشیاں، کالے غم
اے رے دل
رہا ہے تو، اَب تک
کن بھگتانوں میں
اور اَب بھی تو آگے ہے
ایک وہی گذران دنوں کی، جس کی رو
جذبوں اور خیالوں میں چکراتی ہے

ہم جیتے ہیں، ان روحوں کو بھلانے میں
سدا جو ہم کو یاد کریں
سدا جو ہم کو اپنے مشبک غرفوں سے دیکھیں
جیسے، پورب کی دیوار پہ، انگوروں کی بیلوں میں

بڑھتے، رکتے، ننھے ننھے، چمکیلے نقطے،
کرنوں کے ریزے
جو ہر صبح،
ہر جھونکے کے ساتھ
ان پتوں کی درزوں میں
اے رے دل،
تیری خاطر جلتے بجھتے ہیں
کس کی خاطر، یہ اِک صبح؟
کس کی خاطر آج کا یہ اِک دن؟
کیسا دن؟
یہاں تو ہے بس ایک وہی اندھیر دنوں کا جس کی رو
روحوں میں اور جسموں میں چکراتی ہے!

(۳۱-۸-۱۹۶۸)

اک دِن ماں نے کہا

اب وہ لوگ جنھوں نے میرے بیٹوں کا...... خون پیا......
(میرے بیٹے تو سب اُن کے بھائی تھے)......
اپنے وہ لوگ جنھوں نے میرے حصے کے روزینے کو...... اپنے جبڑوں میں...... بانٹ لیا......
(میرا حصہ تو تھا صرف اِک شیریں نام کا ذکر)......
اب وہ اپنے دِل میں سمجھتے ہیں...... دُنیا اُن کی ہے......
لیکن کبھی اگر وہ دیکھیں تو...... میری باہیں نہیں تھکیں......
کبھی اگر وہ دیکھیں تو...... اُن کے انہی قدموں کے تلے......
میرے الگ الگ دو ہاتھوں کی اِک جڑی ہوئی مضبوط ہتھیلی ہے......
اسی ہتھیلی پر ہے اُن کا سب تن و توش......
وہ اپنے قدموں کی طرف اِک مرتبہ دیکھیں تو...... انھیں وہ سنگھٹ بھی نظر آئے جو......
ان ہاتھوں کے قطع کے درپے ہے......
لیکن وہ
دیکھتے ہیں بس اوپر اوپر اس آکاش کی سمت......
وہ آکاش جو اُن کی کھوپڑیوں کے نیچے، اُن کے بھیجوں پر
نیلے رنگ کی چربی ہے......
کس سے کہوں میں
میرے یہ بیٹے بھی کیسے ہیں؟

(۸-۱۹۶۸)

آواز کا امرت

اک اِک روح کے آگے اِک دیوار ہے اونچی گلے گلے تک
اک دیوار ہے رمزِ دروں کی
اس دیوار کے اندر کی جانب جتنا کچھ بھی ہوتا ہے
جس کے پاس خزانہ' اک دردانہ' یا اِک تال مکھانہ
نقد باطن یا کم از کم...... آب ودانہ'
جتنا کچھ بھی پاس ہو اتنی ہی دیوار یہ موٹی ہوتی ہے اور اس دُوری کے باعث
اتنی ہی اس روح کی بات ذرا گھمبیر اور گہری ہو جاتی ہے
اپنے بوجھ سے بوجھل ہو جاتی ہے
دیر سے سننے میں آتی ہے

اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے' روح نہ اس کا کوئی دھندا'
اپنے پاس تو صرف اِک یہ آواز ہے جس کے آگے کوئی بھی دیوار نہیں ہے
سن سے تمھارے پاس پہنچ جاتی ہے
اس آواز میں رمزِ دروں کے سارے غیر مقطر زہر ہیں' اس کا برا نہ مانو'
کبھی کبھی جی میں آئے تو' سن لو
چن لو
رکھ لو
چکھ لو

(۴-۹-۱۹۶۸)

''تینوں رب دیاں رکھاں''

تاروں بھرے دریاؤں جیسی ...... لمبی تانوں والا یہ نغمہ......
دُور پہاڑوں میں چکراتی ہواؤں جیسی ...... پیچاں سی یہ لے......
اب بھی جس کی گونج میں ایک مقدس دُکھ کا بلاوا ہے......

میں جب بھی یہ گانا سنتا ہوں
مجھ کو یاد آ جاتے ہیں وہ لوگ
جن کے لیے اس دن، اس آگ کی آندھی میں، یہ بول ہماری یادیں لے کر آئے تھے
مجھ کو یاد آ جاتے ہیں وہ لوگ، جنھوں نے اس دن، اتنے دھماکوں میں
ان شبدوں کو سنا
اور ہمارے بارے میں سوچا،
جو کچھ سوچا...... کر گزرے،
اُن کی انھی سوچوں کی دین ہیں یہ سب دن، ہم جن میں جیتے ہیں
جن میں جئیں گے آنے والے جینے والے بھی،

انھی دنوں کا سرگم میرے دِل کی سپتک پر چھڑ جاتا ہے،
جب بھی میں یہ گانا سنتا ہوں......

(۶-۹-۱۹۶۸)

پھر جب دوستیوں......

......پھر جب دوستیوں کے سمندر میں دم سادھ کے اترے
اور اک لمبے، گہرے، بے سدھ، غوطے کے بعد اُبھرے
اپنے دِل کا خزف بھی اپنے پاس نہ تھا
باہر دیکھا...... باہر کوئی اور ہی دیس تھا
باہر...... کیسا بازو دراز لہکتا جنگل تھا،
جنگل دوستیوں کا......
مشفق اجنبیوں کی طرح ہماری جانب دیکھنے والے چہرے دوستیوں کے
جی نے چاہا، اَب تو باقی عمر اسی جنگل میں پھول چنیں گے
جانے کتنے دِن یوں جاگ سکیں گے اس سے پہلے کہ اپنا دِل کا سوکھا
پتہ ٹوٹ گرے

(۷-۹-۱۹۶۸)

فرد

اتنے بڑے نظام میں صرف اِک میری ہی نیکی سے کیا ہوتا ہے
میں تو اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا ہوں
میز پر اپنی ساری دُنیا
کاغذ اور قلم اور ٹوٹی پھوٹی نظمیں،
ساری چیزیں بڑے قرینے سے رکھ دی ہیں
دل میں بھری ہوئی ہیں اتنی اچھی باتیں
ان باتوں کا دھیان آتا ہے تو یہ سانس بڑی ہی بیش بہا لگتی ہے
مجھ کو بھی تو کیسی کیسی باتوں سے راحت ملتی ہے
مجھ کو اس راحت میں صادق پا کر
سارے جھوٹ مری تصدیق کو آ جاتے ہیں
ایک اگر میں سچا ہوتا
میری اس دُنیا میں جتنے قرینے سجے ہوئے ہیں
اُن کی جگہ بے ترتیبی سے پڑے ہوئے کچھ ٹکڑے ہوتے
میرے جسم کے ٹکڑے...... کالے جھوٹ کے اس چلتے آرے کے نیچے!

اتنے بڑے نظام سے میری اِک نیکی ٹکرا سکتی تھی
اگر اِک میں ہی سچا ہوتا

(۸-۹-۱۹۶۸)

کبھی کبھی وہ لوگ......

کبھی کبھی وہ لوگ بھی جن کا ناؤں لکھا ہے
کتنے موضعوں کے پٹواریوں کی کھیوٹ میں
میرے دِل کے اندر بیٹھ کے میری باتوں کو سنتے ہیں۔
پیار سے مجھ کو دیکھتے ہیں یوں جیسے اس گودام میں کاغذ چاٹنے والا اِک کیڑا ہوں'
مجھے خبر ہے' دشمن اکثر غرانے سے پہلے ممیاتا ہے
لیکن میرا جی نہیں ڈرتا'
مجھ پہ جھپٹ کر مجھ سے آخر وہ چھینیں گے بھی کیا'
اپنے پاس کوئی رجواڑا لالچ کا نہیں ہے
اک دو حرف ہیں جن کی گرمی میرے لہو میں لہراتی ہے
اُن لوگوں کی ریڑھ کی نلکی میں ہے گودا بھی سونے کا
کوئی کیسا ریلا آئے'
اُن کا پشتیبان وہ پشتہ بہہ نہیں سکتا' جس کے ذرّے آب زر سے جڑے ہیں
اے وہ' اپنے دوام کو جس نے' حرف کے پیرائے میں دیکھا
تیرے سپرد ہیں میرے ٹوٹے پھوٹے مٹی کے یہ شبد کہ جن میں میری مٹی کی روزی ہے

(۱۱-۹-۱۹۶۸)

موانست

رات اچانک پھاٹک کا اِک پہیہ رینگا
پگڈنڈی پر اِک آہٹ نے ٹھوکر کھائی

کالے کالے پروں کو اوڑھ کے سونے والی وحشت
پاس کے پیڑ پہ کندے جھٹک کے، چونکی، چیخی،
جیسے کوئی اس کی طرف جھپٹا ہو،
ڈرتے ڈرتے اس نے نیچے اندھیارے میں جھانکا:
''اوہو یہ تو ایک وہی سایہ تھا
وہ جو روشنیوں کے پہلے پھیرے سے بھی پہلے
روز ادھر سے گزرتا ہے، اور پہلی کرن کی پینگ کے پڑنے سے بھی پہلے
چلتا چلتا اس باڑی میں کھو جاتا ہے
آج تو جانے کس لرزاں دھبے سے ٹکرایا، وہ پگلا''

کویل نے یہ سوچا، پھر بے کھٹکے
پتوں کی اس سیج پہ تھوڑی دیر کو اونگھ گئی وہ،
بوئے سحر کے مست بلاوے پر بے ساختہ کوک اٹھنے سے پہلے!

(۱۴-۹-۱۹۶۸)

گوشت کی چادر

گوشت کی چادر بچھی، اس پر اِک دو تر چھے شکن پڑے
اور بیل اَب نالے سے باہر تھا

اُس کے لوہے کے بازو اور شانے
اور صاف، سفید سی، کھال،
اور وہ خم کھائے ہوئے سینگ،
اور وہ جثہ جیسے گوشت کی چادر
اور وہ اس کا وجود......

بے پندار
بے پروا
ہل کا اہل
جیوٹ اور مگن

جانے کب سے، جب سے کالی دھرتی پر
جیتے گوشت کی یہ اِک چادر بچھی ہے
انسانوں نے سکھ کی فصلیں کاٹی ہیں

(۱۷-۹-۱۹۶۸)

بے ربط

اسی کرے کے جوف سے تم نے کشید کیا
انگاروں سے بھرا ہوا سیال غرور
لیکن کس کی تھی یہ مٹی؟ ہم سب کی
اس مٹی کی وریدوں سے یہ کھچا ہوا سیال غرور
سب میں بٹ جاتا
تو یہ دیس دِلوں کے سجدوں سے بس بس جاتا
تم نے بجھتے بھڑکتے ان انگاروں کو
اپنی روحوں میں بویا
اور نفرت کاٹی!
ان انگاروں پہ تم نے اپنے چہرے ڈھالے ٹکسالوں میں
مقصد لوہے اور فولاد کا یہ جنگل تو نہیں تھا' ہونے کو تو' جس کی
اِک اِک دھڑکن میں تہذیبیں ہیں
کیسی تہذیبیں؟
جب اِک لرزش گہری ہو کر اترے گی سنگین چٹانوں میں
اور دُھوئیں میں تیریں گی بے جان مقرض قاشیں دُنیا کی
تب بھی' صرف اِک شے باقی رہ جائے گی
تم محسوس کرو تو آج بھی اس کا بوجھ تمھارے دِل پر ہے

(۱۷-۹-۱۹۶۸)

بھائی کو سیجن اتنی جلدی کیا تھی

(پس منظر: ستمبر ۶۸ء کا سورج گرہن، جب روس کے سپٹنک نے چاند کے مدار پر گردش کی)

بھائی، اتنی جلدی کیا تھی......

دن ڈھلتے ہی ہم تو دُورنگر چشمے اپنی آنکھوں سے لگا کر، بیٹھ گئے تھے، دیکھیں،
کب سورج کے تھال پہ آ کر، ٹھہرے، تھوڑی دیر کو، کالے چاند کا لرزاں دھبا

ہم یہ آس لگائے بیٹھے تھے، دیکھیں کب چاند کے گرد
اچانک چک چک چکراتا گزرے وہ چھوٹا سا اِک رکشا
سورج کے چمکیلے گول کنارے کی پٹڑی پر چلتا، گھن سے اوجھل ہوتا، چکر کاٹ کے
سامنے آتا، دُور سے دکھتا، رکشا،

دل ہی دِل میں ہم کہتے تھے، دیکھیں کیسا ہو یہ تماشا،
وہ سورج کی آنکھ، اور اس میں چاند اِک کالی پتلی، اور پھر اس پتلی کے گرد لڑھکتا،
اک وہ سایہ
پھر یہ سب کچھ عکس بہ عکس ہماری آنکھ کی پتلی میں بھی،

اک پل کے محور پر گھومنے والے تین کرے......
او ہو اَب تو آنکھیں بھی دُکھتی ہیں
اے لو سورج پر سے ڈھل بھی گیا وہ سایہ...... لیکن تم نہیں آئے

سنا ہے، تم تو اِک دِن پہلے کسی سدیمی دُوری کے نزدیک خلاء میں، وہیں کہیں تھے
اپنے چکراتے رکشا پر
جانے اِک دِن پہلے ہی تم کیوں لوٹ آئے، بھائی اتنی جلدی کیا تھی......

دیکھیں، گردشِ دوراں کے دوران، تمھاری سواری پھر کب گزرے، ان راہوں سے
ایسے میں، جب ہوں اک سیدھ میں تین کرّے اور تین زمانے......

اس دِن ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گے اور اس دِن ہم تو لوگوں کا کہا مانیں گے
(۲۴-۹-۱۹۶۸)

مریض کی دعا

کل تک تو یہ دُنیا
میرے لیے اِک آئینہ تھی
جس میں میری نخوت
آنے والے کل کا یقینی چہرہ دیکھ کے اتراتی تھی

تو تو سب کچھ جاننے والا ہے: میں کتنا خویش غرض تھا
اب تک جب بھی تجھ کو یاد کیا ہے
اپنی نخوت کی اس بھول میں تجھ کو یاد کیا ہے

لیکن آج مجھے اس بات کا ڈر ہے:
کل، جب آنے والا کل آئے گا،
میرے بے حس سرد مساموں کو وہ کھرچنے والی روشنیاں،
اِک ڈھیلے ٹاٹ کے جھول میں، میرے جسم پہ، شاید
جیتے دنوں کی آخری کرنیں ہوں گی،

آج یہ میرا عہد ہے تجھ سے:
کل کو، آنے والے کل کے بعد، اگر کچھ دِن بھی میرے لیے ہیں
تو مرا اِک اِک دن، اس دِن کی اطاعت میں گزرے گا
تیرے خزانوں میں جو، میرے سمیت، سبھی کے لیے ہے
اور کسی کے لیے بھی نہیں ہے
تیرے غیب میں تو سب کچھ حاضر ہے
کل کے بعد بھی میرے ارادوں کو توفیق کے دِن دے
اے وہ جس کے آج میں فرداؤں کے ابد ہیں

(۳۰-۹-۱۹۶۸)

وہ بھی اِک کیا نام ہے......

وہ بھی اک کیا نام ہے جو ہر دم ہے
ہم ہیں اور نہیں ہیں
ہم اور باقی، جو کچھ بھی ہے
اس کا ہونا، اُس کے نہ ہونے کی خاطر ہے،
پھر اس اک اِک ہونی کا ہے جدا جدا اک نام بھی اپنا
اپنے اپنے نام ہیں چیزوں کے اور آدمیوں کے
اک اِک نام کے جسم ہیں، یہ سب چیزیں!
نام ان جسموں میں جیتے ہیں
نام ان جسموں میں بے جسم ہیں اور جیتے ہیں
آج تو میں نے دیکھا، میرے جسم میں میرا نام نہیں تھا
جیسے اِک احساس کی زد سے
مجھ میں میرا باطن ڈوب چلا ہو،

ایسے میں، اس میرے نام سے خالی ہونے والی خلا میں
جب اِک نام نے جھانکا، جانے کس کے نام نے جھانکا
پھر سے، میرے قدموں کے نیچے، میرے باطن کی مٹی تھی
میرے باطن کی مٹی
میرے نام کی جس سے نمو ہے
کیسا نام ہے یہ بھی جو ہر دم ہے
ہم ہی نہیں، اس نام سے نامی!

(۷-۱۰-۱۹۶۸)

دن تو جیسے بھی ہوں......

دن تو جیسے بھی ہوں...... آخر اِک دن'
دنوں کی اِک اِک سچائی کو جھوٹ کے تیشے مقرض کر دیتے ہیں

دیکھو...... سوچو......
دل کی اس پیچاک میں ہیں جو شکنجے' وہ تو ویسے ہی تھے'
اس پیچاک سے نچڑا ہوا وہ گیہوں' جو' زیتون کا رس تو ویسا ہی تھا'
جسموں کی سب کار گہیں تو ویسی ہی تھیں'
جب یہ سر فرعونوں کے آگے جھکتے تھے' تب بھی'
جب اِک گورا پلٹن اس سنگھاسن پر پہرا دیتی تھی' تب بھی
اور اَب بھی جب ہم نے مستقبل کا سارا بوجھا اپنے شانوں پر بانٹ لیا ہے

گورا پلٹن کی سنگینوں کے سائے میں بھی بھوجن ملتا تھا
فرعونوں کی خدائی میں بھی بندے پتل بھات سے بھر لیتے تھے
اور اَب اپنے گھروں میں ہم ہر ایک مثلج آسائش رکھتے ہیں
تو کیا صرف ہمیں سچے ہیں؟
کیا وہ سب جھوٹے تھے؟

یوں تو آج ہم ان پہ ترس کھاتے ہیں

جن کی پتھر ڈھوتی عاجزیاں فرعونوں کے چابک کھاتی تھیں،
لیکن کیا اس بات کی اُن کو خبر تھی......
کیا اس بات کی ہم کو خبر ہے......
اس دُنیا میں جو کچھ بھی ہے' اس کا حاصل تو وہ سچائی ہے' جس کو
آخر جھوٹ کے تیشے مقرض کر دیتے ہیں'

پھر کیوں یہ سب دریا' چہروں کھوپڑیوں کے دریا' ان گلیوں میں بہتے ہیں
شہر ازل کے اونچے پل کی کھڑی ڈھلان سے لے کر'
ان گلیوں ان دہلیزوں تک بہتے' آتے' دریا'
دریا' جن پہ شکن ہے...... چھاپ لہو کی'
لہریں' جن پہ بھنور ہیں...... لہو کی مہریں
آخر اس ریلے میں کون اچھا تھا......
آخر سچ کے تٹ پر کون اترا ہے......؟
اپنی آنکھوں میں یوں کانٹے بھر کر میری جانب مت دیکھو......
میں سچ کہتا ہوں' سوچو!
آخر سچ کے تٹ پر کون اترا ہے!

(۱۲-۱۰-۱۹۶۸)

پھولوں کی پلٹن

آج تم ان گلیوں کے اکھڑے اکھڑے فرشوں پر چلتے ہو،
بچو! آؤ تمھیں سنائیں گزرے ہوئے برسوں کی سہانی جنوریوں کی
کہانی،
تب یہ فرش نئے تھے......
صبح کو لمبے لمبے اوورکوٹ پہن کر لوگ گلی میں ٹہلنے آتے،
اُن کے پراٹھوں جیسے چہرے ہماری جانب جھکتے،
لیکن، ہم تو باتیں کرتے رہتے اور چلتے رہتے،
پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے ہمارے پاس آ جاتے،
بڑے تصنع سے ہنستے اور کہتے،
''ننھو! سردی تمھیں نہیں لگتی کیا؟''

ہم سب بھرے بھرے جزدان سنبھالے،
لوچیں ہاتھوں میں لٹکائے،
بنا بٹن کے گریبانوں کے پلو ادھڑے کاجوں میں اٹکائے
تیز ہواؤں کی ٹھنڈک اپنی آنکھوں میں بھر کر

چلتے چلتے، تن کے کہتے:
''نہیں تو، کیسی سردی۔
ہم کو تو نہیں لگتی......!''

بچو! ہم ان اینٹوں کے ہم عمر ہیں، جن پر تم چلتے ہو،
صبح کی ٹھنڈی دُھوپ میں بہتی، آج تمھاری اِک اِک صف کی وردی،
ایک نئی تقدیر کا پہناوا ہے
اجلے اجلے پھولوں کی پلٹن میں چلنے والو
تمھیں خبر ہے، اس فٹ پاتھ سے تم کو دیکھنے والے
اَب وہ لوگ ہیں
جن کا بچپن ان خوابوں میں گزرا تھا جو آج تمھاری زندگیاں ہیں

(۱۹-۱۰-۱۹۶۸)

ایک نظمینہ

ٹیڑھے منہ اور کالی باتیں!
کانٹے بھرے ہوئے آنکھوں میں!
یہ دُنیا' یہ دُنیا والے!
تو مت جا اُس اور ــــــ باگیں موڑ بھی لے'

دِلوں کی اس دلدل کے کنارے
روپ گھمنڈ کے پتلے سارے
اک پر' دوسرا' کیچ اچھالے'
اس تٹ پر مت ڈول ــــــ باگیں موڑ بھی لے

آگے بس کی لہر ہے جل تھل
کسی کی بابت' ماتھے پر بل
اے رے دُکھے ہوئے دِل والے
یوں مت' یوں مت سوچ ــــــ باگیں موڑ بھی لے

(۲۵-۱۰-۱۹۶۸)

لوگ یہ......

لوگ یہ گہری نپی تلی تدبیروں والے
جانے اُن لوگوں کو کیا ہے......
کبھی کبھی یوں دیکھتے ہیں وہ مجھ کو، جیسے وہ کہتے ہوں:
''آ اور پڑھ لے انہی ہماری آنکھوں میں تقدیریں اپنی''
اور پھر کبھی کبھی تو اُن کی نظریں یوں کہتی ہیں:
''تو کیا چھپے گا ہم سے؟ ہم نے تو پڑھ لیں تیری آنکھوں میں سب تقدیریں تیری''

جانے اُن لوگوں کو کیا ہے؟
جانے اُن لوگوں کے لہو میں چکنی سی یہ سیاہی کہاں سے آئی ہے، جو مجھ کو دیکھ کے اُن کے چہروں کو فولادی رنگ کا کر دیتی ہے،

میری قسمت کے یہ دام چکانے والے
میں تو اُن کے دِلوں کو پڑھ لیتا ہوں
میں تو اُن کی روحوں پر چیچک کے داغوں کو بھی گن لیتا ہوں، جب وہ تازہ لہو سے بھر جاتے ہیں
میرے سامنے تو ہے اُن کا وجود بس ایک تماشا......
تیرے ارادوں کی نگری میں اُن لوگوں کا تماشا،
لوگ جو اپنی تدبیروں پر بھولے ہوئے ہیں،

(۳۰-۱۰-۱۹۶۸)

یہ بھی کوئی بات ہے......

یہ بھی کوئی بات ہے کہنے کی
لیکن لو ہم کہے ہی دیتے ہیں

دوہا، بول، کبت، کیا رکھا ہے ان میں......
زخم بھلا کب سلے ہیں شبدوں سے......

جلتی سطروں سے کب ڈھلی ہیں تقدیریں
بس، یہی، لے دے کے، کچھ عرصے کو،
دھیمی دھیمی سی وہ جلن دب جاتی ہے
جو اس وقت اُبھرتی ہے،
جب دِل میں گھن لگتا ہے،

آخر ذرا سی اس تسکین کی خاطر، کون
سارے جگ کا بیر سہے

کون کہے؟ کیا حاصل ہے اس بات کے کہنے سے؟
بات بھی یہ کہ زمانے میں:
زینہ بہ زینہ بندے پر تو بندے کی تلوار معلق ہے'

چھوڑیں بھی اس بات کو...... چلو یہی سوچیں'
شاید اِک دِن کوئی سچ اس سچ کو جھٹلا دے'
(اپنا دِل تو اگرچہ مشکل سے یہ مانے گا......!)

(۷-۱۱-۱۹۶۸)

بانگِ بقا

ساری نسل پہ گزرا ہے یہ قیامت کا اِک دن
ایک ہی دِن میں کٹ گئے، کیسے کیسے رعنا مست جوان،
اب تو سب پر لازم ہے
حفظ وجود،
سعی بقا
جیسے بھی ہو، آج سے اِک اِک فرد کرے
زائد کام،
بڑھ کر، چڑھ کر، گھٹ کر، گھس کر، پہلے سے بھی زیادہ کام،
اب تو جٹ جائیں، اس کام میں سب کامی،
رچ مچ کے اور مل جل کے
اک یہی کام
پس پس کے اور ہل ہل کے
دَم دَم، دُم دُم یہی جتن،

کندے تول کے، پنجے جوڑ کے، پیہم اِک یہی کام،
ہم اس نسل کی رعنائی کے محافظ ہیں
نسل بیضا، فخر جن وانس و وحش وطیور
اب تو پیہم یہی جتن
جانے پھر کب چوبی تختے بچھ جائیں
اور ہمارے ویروں کے سر کٹنے لگیں،
بڑی بڑی توندوں والے عفریتوں کی خاطر
جن کے پاک معطر جسم ہماری ہی روحوں کے فضلے ہیں!

(۹-۱۱-۱۹۶۸)

ایک صبح...... سٹیڈیم ہوٹل میں

یوں تو اس چوکور تپائی کی اس سادہ سی بیٹھک میں کیا رکھا ہے'
لکڑی کی اک عام سی شے ہے' پڑی ہے
یوں تو اس پر رکھے ہوئے گل دان میں کیا رکھا ہے'
پیلے پیلے سے کچھ تازہ پھول ضرور ہیں اس میں
پھول تو گلدانوں میں ہوتے ہی ہیں
اور پھر اس چوکور تپائی پہ گرنے والا' ہوا کا ترچھا جھرنا
جس میں دُھوپ کی نازک سی جھلکی سونے کا رنگ بکھیر گئی ہے
خیر' یہ دُھوپ کی رنگت بھی تو جگہ جگہ ہے

لیکن یہ سب چیزیں' اور یہ چاروں خالی کرسیاں' اور یہ سب کچھ' مل کر
ایک عجیب آسودہ سی ترتیب ہے' ساکت ساکت'
میرا ذہن کچھ اتنا الجھا ہوا ہے' مجھ کو چیزوں کی ترتیب اچھی لگتی ہے
جانے کون یہاں آ کر بیٹھے گا......'
سب کچھ اِک آنے والے اچھے سمے کا ان ہونا پن ہے!

(۱۱-۱۱-۱۹۶۸)

دُور اُدھر......

دُور، اُدھر، اس سامنے والے رستے سے، جب
آپس میں ٹکراتی، آوازوں کی لہر اچھل کر میری جانب والے رستے تک آئی،
بیچ میں نیچے پانی تھا......
بیچ میں نیچے، اِک میدان اور اس میں گھاس اور پودے اور سب کچھ پانی میں تھا
ٹھنڈی رات کے سائے تھے،
سامنے والے اس رستے سے آوازوں کی گونج جب اچھلی، نیچے پانی تھا
رات کے سایوں میں اس پانی پر اِک چوٹ سی پڑتی تھی
تیزی سے اِک آہٹ ڈبکی بھرتی تیر کے بڑھتی تھی
گیلے گیلے پہناووں کو جھٹکتی کیچڑ میں تھپ تھپ چلتی تھی

(۱۶-۱۱-۱۹۶۸)

جدھر جدھر بھی......

جدھر جدھر بھی دیکھوں......
ہر سو پھول ہیں کانٹے ہیں کرنیں ہیں اندھیارا ہے
پھر یہ سب کچھ...... اِک اِک راحت اِک اِک جھنجھٹ...... آپس میں گڈمڈ ہے،
اور یہ سب کچھ مجھ کو گھیرے ہوئے ہے،
ہر دم ایک عجیب پریشانی ہے، جس کے باعث
اپنے جی میں لہو کے پسینوں کی ٹھنڈک ہے

کتنے اچھے ہیں یہ سب الجھیڑے،
سمے کی رو میں ڈھب ڈھب چلتے دھندے
کتنی بھلی ہے اِک یہ بے مصرف سی مصروفیت
ذہن پہ اِک یہ پردہ، جس کے اوجھل ہیں وہ باتیں
جن کا دھیان بھی مجھ کو سب خوشیوں سے ناخوش کر سکتا ہے،
دھیان اُن کا، جن کے قدموں کے نیچے میرے باطن کی مٹی ہے!

اک دِن یہ مٹی اُن کے قدموں کے نیچے سے سرک گئی...... تو......!

(۷-۱۲-۱۹۶۸)

چھٹی کے دن

چھٹی کے دِن گھر سے تو وہ اس کارن نکلا تھا
ذرا گلی کے ہٹی والے سے کچھ سودا سلف خریدے
اور پھر آ کر تر شے ہوئے کرداروں کے میلے میں گھومے......

اس میلے میں وہ سب کچھ تھا
اس میلے کے باہر تو وہ اپنے آپ سے بھی چھپتا تھا
میں بھی اس میلے کے باہر اس سے پہلی بار ملا تھا
اُس کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی، یوں میں اِک دن، اتنے قریب سے
اس کی زمینی آنکھیں، اُس کے نیلے چپٹے ہونٹ اور اُس کے رخساروں کے
میلے ڈھیلے گول مسام بھی دیکھ سکوں گا
لیکن وہ نہیں جھجکا
میں ہی اُس کے اصلی روپ کو دیکھ کے سہم گیا تھا
اُس کے گرد تو اِک وہ مکر کا ہالا ہی اچھا تھا
یہ سوچا اور اس سے رخصت چاہی،

اس دِن شام کو پھر میلے میں اس سے ملا میں......
میں نے اس کو پایا سارے حربوں سے مسلح
چہرے پر اِکسائے ہوئے کچھ ایسے تیور،
جیسے وہ بس کاٹھ کی روٹی اور پُرنور خیالوں پر زندہ ہو

(۹-۱۲-۱۹۶۸)

اُن لوگوں کے اندر......

اُن لوگوں کے اندر، جن کے اندر میں بھی ہوں،
میرے برعکس، ایسے بھی
ہیں کچھ لوگ،
جن کی باتوں کے کچھ سچے روپ، اُن کے حربے ہیں،
لیکن یہ سچ اُن کا نہیں ہوتا،
یہ سچ اوروں سے چھینا ہوا ہوتا ہے
اپنے جھوٹ اور اپنی بدی کو چھپانے کی خاطر
وہ اوروں کی اِک اِک اچھائی کو ہتھیا لیتے ہیں
اور پھر اس ہتھیار کو لے کر جب وہ چلتے ہیں
ساری دُنیا اُن سے ڈرتی ہے،
یہ بھی کیسا زمانہ ہے
جب اچھوں کی سب اچھائیاں، بروں کے ہاتھوں میں حربے ہیں،
سچے لوگ اگر جیوٹ ہوں کون اُن کے منہ آئے گا
جھوٹ کے اس تالاب کے سب پھوے
اپنے اپنے خول میں، اپنے اپنے کالے ضمیروں میں،
چھپ جائیں گے

(۱۶-۱۲-۱۹۶۸)

اے ری چڑیا

جانے اس روزن میں بیٹھے بیٹھے
تو کس دھیان میں تیری' چڑیا' اے ری چڑیا!
بیٹھے بیٹھے تو نے کتنی لاج سے دیکھا
پیتل کے اس اِک تل کو جو تیری ناک میں ہے
اپنی پت پر یوں مت رتجھ' خبر ہے' باہر
اک اِک ڈاین آنکھ کی پتلی تیری تاک میں ہے
تجھ کو یوں چمکارنے والوں میں ہے اک جگ تیرا بیری'
چڑیا' اے ری چڑیا
بھولی' تو یوں اڑتی' پنکھ جھپکتی'
یہاں کہاں آ ٹھہری' چڑیا' اے ری چڑیا
یہ تو میرے دِل کا پنجرا ہے' تو اس میں
اپنی ٹوٹی پھوٹی خوشیاں ڈھونڈنے آئی ہے؟
پگلی' یہاں تو ہے ہیرے کی کنی کا چوگا
اور اِک زخمی سانس اس پنجرے کی انگنائی ہے!
اڑ اور مہکی ہوئی بن بیلڑیوں میں
جا چن اپنی لے' ری چڑیا' اے ری چڑیا!

(۱۲-۱-۱۹۶۹)

بہار کی چڑیا

اس کا سرما سارا گزرا، دُور کہیں اک دُھوپ کے گھر میں......
سرما، جو اس کا بچپن تھا......
اب جب دِن بدلے ہیں اور ہوا کی ردا سے برف کے ٹانکے ادھڑنے لگے ہیں
نئی رتوں کی یہ بنجارن بھی دیواروں سے ٹکراتی
آ نکلی ہے، اپنے منگیتر کے ساتھ، اس کمرے میں
اڑتی چہکتی گاتی
چوں چوں، چچ چچ
آہا، یہ بھی کیسا اِک بسرام ہے، روزن جن میں خوشیاں پنکھ سمیٹ کے چہکیں،
آنگن، جن میں پھول اور ریزہ زر کا ارزن،
پل بھر تو اس طاق پہ بیٹھیں، چوں چوں، چچ چچ
لیکن اے ہے، کون ہے یہ اس شیش محلکے میں اس جیسی
کون ہے پہلے سے یہ بیرن،
جھپٹ جھپٹ کر، اس نے اس چہرے پر کالک مل دی
اور اَب وہ اور اس کا منگیتر دونوں، گلے پھلا کر،
کتنے تاؤ میں اس بے عکس آئینے کے آگے بیٹھے ہیں
باغی، جو ہر دور میں اپنے سائے سے لڑنے آتے ہیں

(۲۰-۱-۱۹۶۹)

گہرے بھیدوں والے

گہرے بھیدوں والے' تیرا سحر ہی مجھ کو بھائے یہ اِک بات......
......بات بھی ایک یہ بات کہ اپنے پاس ہے جو کچھ سب ہے تیری دین
اور پھر...... اِک یہ برتا بھی تو تیری دین ہے' جس پر' ہم
اپنے آپ میں تل کر جیتے ہیں'
کبھی کبھی تو اپنے آپ میں بھر جاتے ہیں ایک ہی ٹھنڈی سانس کے ساتھ'
میلے من کی بھروائی'
تو نے اِک یہ ہم کو سونپا بھی تو کیسا کام'

بیٹھے ہیں
آنکھیں روح کے بوجھ سے ابلی پڑتی ہیں
کہیں پپوٹوں میں ہے اپنے وجود کے ریزے کا اٹکاؤ سا'

اب کیا ہو سکتا ہے، اپنے جواز کے آگے اپنی سب تردیدیں بے بس ہیں
اندر ہی اندر کوئی شے تالو سے ٹکرائی ہے
ہم کہتے ہیں "اب تک...... ٹھیک ہے!...... آگے...... دیکھیں گے!

جانے یوں کن کن بھیدوں کی کٹھالی میں تو ہمیں پرکھتا ہے،
جانے یہ بھی اِک کیا بھید ہے، یہ جو میری بابت گمان کا ایک دکھاوا سا
میرے ذہن سے گزرا ہے!

(۷-۲-۱۹۶۹)

مرے ہوئے اس اِک ڈھانچے......

مرے ہوئے اس اِک ڈھانچے کے حق میں......یہی تو ہے بس سارا غم
اور سب اندوہ
یہی تو ہے اِک دُکھ کی صورت، ظاہر میں......اور......سارے مظاہر میں

سامنے والے دانتوں کے اندر کی طرف،
جیبھ کی نوک مسوڑھوں کی سوجن کو اِک دو بار چھوئے
بڑا کرم ہو اگر آنکھوں پر پلکیں بھی کچھ جھک آئیں،
اشکوں کو تو دُور سے آنا ہوتا ہے
اور اُن کے آنے سے پہلے آپ کو جانے کی بھی جلدی ہے
تو بس اتنا کچھ ہی کافی ہے،
اتنا کچھ ہی تو ہوتے ہیں سارے غم اور سارے سوگ
چہرے پر اِک لمبی پیلاہٹ

اور ایسے میں جیبھ کی نوک مسوڑھوں سے یوں چپک چپک کے گرے
جیسے اِک بے حرف آواز کہے
''کتنا اچھا آدمی تھا......''

ذرا سے اپنے اس اِک استحقاق کی خاطر آج تو میں نے مرکر بھی دیکھا
ایسا وقت جب آئے تو آپ اتنا کچھ تو کیجیے گا'
اپنی اس
کم فرصت رنجوری کے باوصف

(۲۷-۲-۱۹۶۹)

اے رے من......

اے رے من'
تیرے بھی تو ہیں کیسے کیسے دکھاوے
آج تو میں نے بالکل واضح دیکھا'......اس کا چہرہ
جیسے وہ زندہ ہو......

دھوپ میں......چلتے چلتے......میں نے دیکھا اس کا چہرہ......
چہرہ......جیسے ہوا کی تہوں کا چھلکا......
میں جس دھوپ میں تھا وہ دھوپ تھی اُس کے گرد اِک چھتری
جس کی چمک میں

چینہ چینہ چیچک سے وہ چہرہ ویسا ہی چترک تھا
جیسا دُنیا میں تھا......
اور وہ دانے اَب بھی چمکتے چمکتے بھلے لگتے تھے
جانے اَب وہ کس دُنیا میں...... کچی اینٹوں کی چھتری والے کون سے گھر میں
کن اندھیاروں میں ہو......
وہ...... جس کی بابت سوچوں تو سینے میں اِک جھلی تپ جاتی ہے

وہ، جو مٹی میں اَب مٹی کا چھلکا ہے......
...... مٹی، جس پر بارش کے دانوں کے دھبے ہیں......

شاید تیرا ہی یہ پاگل پن تھا'...... کون اَب اس کو دیکھ سکے گا
اے رے مَن
تیرے بھی تو ہیں کیسے کیسے دکھاوے
تجھ پر ہنسنے کو جی چاہا
ورنہ یوں کوئی یاد آئے تو آنسو کس سے رک سکتے ہیں

(۱۰-۳-۱۹۶۹)

میٹنگ

اُن کے جسموں کے پیچاک تو دیکھو'
اُن کے جسموں پر یہ زرہیں بھی تو دیکھو'
سمٹے سمٹے لپیٹوں والی زرہیں
جن سے اپنے گمان میں وہ اپنی روحوں کی رکھوالی کرتے ہیں
سمٹے سمٹے لپیٹوں والی زرہیں
اُن کی زرہیں' تو اُن کی سوچوں کے سمتاوے ہیں
جن کے ذریعے......
ہم پہ جھپٹنے سے پہلے' وہ
اپنے آپ کو' اپنی روح کے اِک کونے میں سمیٹ لیا کرتے ہیں
اور پھر اُن کے سب اعضا' سب عضلے' کسے کسے سے نظر آتے ہیں
جیسے رسے'
جیسے ابھی ابھی جب بٹے بٹے سے رسوں کے یہ مٹھے'
کھل کر بکھریں گے تو اژدر بن جائیں گے
اس دِن میں نے دیکھا' جیسے
اک اِک کرسی پر اِک رسوں کا مٹھا بیٹھا ہو'

(۳۱-۳-۱۹۶۹)

حضرت سید منظور حسین شاہؒ

(مکان شریفی)

میں نے اُس کے ارادوں کا یہ سفر دیکھا ہے
ابھی ابھی وہ اس پرنور حویلی میں تھا
جس کے گرد سنہرے گلابوں کے تختے تھے
اور اَب وہ اس مٹی کے تابوت میں جا لیٹا ہے

میں نے دیکھا
اس نے اپنی اس اک عمر میں جتنی زندگیاں پائی تھیں
آج اس کی میت کے ساتھ نہیں تھیں
وہ تو اَب بھی سب کی سب اس دُنیا میں ہیں
جو بھی چاہے اُن کو چن لے اور آنکھوں سے لگا لے

(۳۰-۳-۱۹۶۹)

زائر

اُن کی جیبوں میں ہیں ارض و بقا کی کلیدیں
لیکن ان گچھوں کی ایک بھی چابی اُن کے دِل کے کالے تالے کو نہیں لگتی
اور وہ ننگے پیروں چل کر تیری چوکھٹ پر آتے ہیں
تیرے جلالت والے چتر کے آگے جھک جاتے ہیں
اُن کی روح کے ایک پرانے گڑھے سے خلوص کا لاوا ابل پڑتا ہے
وہ روتے ہیں
تجھ سے مانگتے ہیں وہ سب کچھ، جس کو تو نے تیاگ دیا تھا
اور ادھر اِک میں ہوں
کیسے مانگوں تجھ سے وہ دُنیا، جس کا سورج اِک دِن تیرے دِل سے اُبھرا تھا
اپنے پاس تو اس دُنیا کے ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں ہوتے
جس دِن ہوں بھی اس دِن اپنا ارادہ بھی نہیں ہوتا
تیری نورانی مٹی سے باہر جو مٹی ہے
جانے اس مٹی میں کیسے کیسے کافر تیری محبت میں جیتے ہیں
تو نے دیکھا......؟

(۱۴-۴-۱۹۶۹)

میری عمر اور میرے گھر......

میری عمر اور میرے گھر سے باہر'......اس دائم آباد محلے......

اس اینٹوں کے ابد میں

وہ جو کچھ عمریں ہیں نیچی نیچی چھتوں کے نیچے......'

اُن کی نمود اور اُن کی نمو سے میری پلکوں میں ٹھنڈی سوجن ہے

اُن کو دیکھ کے میں دُنیا کو بوجھل بوجھل نظروں سے تکنے لگتا ہوں

کتنے اچھے تھے وہ میرے گزرے دن' جو اَب ان عمروں میں ہیں

جب یہ عمریں میرے گزرے دنوں سے گزر کر' اِک دِن میرے نہ ہونے میں ہونگی

تو جانے میری بابت کیا سوچیں گی......

اک یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے گھر کی طرف دیکھا ہے

تو ان اینٹوں کی عمروں پر رشک آیا ہے

جیسے آج نقابوں میں یہ نظریں، بجلی کے ریشوں سے بنی ہوئی یہ
خانے دار کمندیں
میری روح کو چھو کے پلٹ جاتی ہیں
ویسے ہی، کل بھی شاید یہ نظریں، اک بار اُٹھیں ان اینٹوں کی جانب
اینٹوں کی یہ چادر، جس کا اِک پلو ہی باہر تیرے گا جب میرا پیکر
گارے کے گرداب میں ہوگا

پھر بھی آج تو سوکھے سوکھے حلق اور سوجی سوجی پلکوں سے
اس دُنیا کو دیکھنے میں جو دُکھ ہیں، جو ارمان ہیں، یہی تو عمروں کا
حاصل ہیں
(۱۳-۵-۱۹۶۹)

بندے

بندے،
جب پلکوں کے جڑے جڑے گچھوں کے نیچے، تیری آنکھوں میں اِک لمبے گھیرے والے
عندیے کا ہلکا سا پھیرا پڑتا ہے......
جب ایسے میں تیرے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر ایک ارادے کا بوجھ آ پڑتا ہے
اور وہ ہونٹ آپس میں اور بھی دب جاتے ہیں
اور ٹھوڑی کے نیچے اطمینان کا اِک لٹکا وا اُبھر آتا ہے
تب تو تیرے گمان میں دُنیا کے ہر ذرّے پر تیرے چہرے کا سکہ ڈھل جاتا ہے
تب تو ڈرنے والے ڈر جاتے ہیں
اپنے غرور میں جینے والی مٹی کی اس اِک مورت کو دیکھ کے
ڈرنے والے ڈر جاتے ہیں

اور میں، اس تیری مورت کی بے علمی سے ڈر جاتا ہوں
جس کو علم نہیں وہ کرنوں کی بوچھاڑ میں ہے اور ان جھالوں میں جھڑ جائے گی

اور یہ میرا ڈر ہی میری سب سے بڑی ڈھارس ہے، میری اس بے اطمینانی میں،
تو میری اس ڈھارس سے ڈر، اپنے کالے ارادوں میں جینے والی مٹی کی مورت
(۲۱-۵-۱۹۶۹)

اپنے یہ ارمان......

اپنے یہ ارمان تو سب غرضیں ہیں، کھری بھی اور کھوٹی بھی
ان سب غرضوں کی دھن اس کی دھن ہے
اور ہمارے خیالوں کے اندر تو بھونروں کی روحوں کے بھنور ہیں
اُڈاُڈ کر اپنی غرض کی سیدھ میں ہم آتے ہیں
جو بھی رستہ کاٹے اس کو ہم ڈستے ہیں
پھر جب من کی باتیں پوری ہوتی نظر نہیں آتیں
ذہن ہمارا دُنیا والوں کے بھیدوں کو پرکھنے لگ جاتا ہے
اک یہ پرکھ ہی تو ہے جو یوں نفرت سکھلاتی ہے
اپنی محرومی لاکھوں شاخوں والی اک قدر ہے جس کی
سب سے مقدس ٹہنی پر نفرت کا پھل لگتا ہے
میرا جی تو بھر بھی چکا اس پھل سے
کب تک دیکھوں میں ٹیڑھی پلکوں سے، اُن لوگوں کو،
میری دید سے جو غافل ہیں
کیوں نہ بہادوں، اک تنکے کی طرح اِس دُنیا کو، اس ندی میں، جو
تیری روح کے باغوں میں بہتی ہے
منوا، آج تو تو نے یہ کیا سوچا
سدا پھلیں یہ تیری میٹھی سوچیں، مورکھ منوا!

(۱۳-۶-۱۹۶۹)

وہ تلوار ابھی......

وہ تلوار ابھی تو اِک فولادی خواب ہے تیرے ذہن کی ان تھک کارگہوں میں

اک دِن جب یہ اصیل اور جوہر دار عمل پارے آپس میں جڑ کر،
تیرے دِل کی نیام میں ڈھل جائیں گے،
پھر جب اِک دِن یہ تلوار چلے گی......،

لیکن اس دِن کے آنے تک......ابھی تو کچھ دن......
لاکھوں روگوں والی نگری میں، مٹی کی اس پٹڑی پر،
اپنے دامن میں کیچڑ کے ان پھولوں کو لے کر چلنا ہوگا،
ابھی تو اور بہت کچھ ہوگا،
نیلی، ٹین کی یہ چھت کڑ کے گی اور سہما سہما وجود پچک جائے گا،
باہر جانے کتنی آنکھیں ہنسیں گی اور جبڑے کھنکیں گے،

ایسے میں تو گہری بنیادوں والے اِک سانس کے بل پر ہی، تو
ان سب کالی دُنیاؤں کے بوجھ کو اپنے سر سے جھٹک سکے گا......

لیکن ابھی تو سب کچھ اِک فولادی خواب ہے تیرے ذہن کی ان تھک کارگہوں میں،
ابھی تو ہر ہونی ان ہونی نظر آتی ہے،
ابھی تو سب کچھ ہو سکتا ہے......
شاید تو تھک بھی جائے،
شاید اپنے جی کے اسی جیالے پن میں تو جی بھی لے

(۲۴-۶-۱۹۶۹)

یہ دو پہیے ......

یہ دو پہیے ارض و سما ہیں
اور اس اپنی عمر کی سب تسکینیں، بچھی پڑی ہیں اُن سڑکوں پر
دو پہیوں کے ارض و سما کا جستی دستہ تھام کے، میں نے
چلتے چلتے اِکثر سوچا ہے، یہ سڑکیں بھی کتنی اچھی ہیں
ان کے باعث، میرے دھیان میں آ جاتے ہیں، وہ سب اچھے اچھے کام
اور اچھی اچھی باتیں
جن کی خاطر، میں نے،
ارض و سما کے پہیوں کو اس نیلی پٹڑی پر گرداں رکھا ہے،
اور، اِک عمر کے بعد، اَب یہ سمجھا ہوں: دُھوپ کی لو میں تپتی ہوئی یہ بجری لی
سطحیں اچھی ہیں، اُن لوگوں سے
جو ان پر چلتے ہیں...... جن کے غرور کی جھوٹی ٹھنڈک کبھی بھی اُن کے دلوں میں
نہیں پگھلتی ......
چلتے چلتے اِکثر میں نے سوچا ہے، میں کن لوگوں کی دُنیا میں ہوں،
یہ سب کیسے لوگ ہیں، جن کی آنکھوں میں پتھرائے ہوئے پچھتاوے کبھی بھی کروٹ
نہیں بدلتے

لوگ جو اپنے سوا' ہر اِک شے کی جانب بے رخ ہیں
کس نے دیکھا' میرا دِل تو بچھا ہوا ہے' ان سڑکوں پر' ان بے رخ قدموں کے نیچے
کس نے دیکھے' پہیے ارض وسما کے' چلتے ہوئے ان بجریلی سطحوں پر
کس نے پہچانے وہ ہاتھ' کہ جن کے بس میں' ان پہیوں کی گردش کا ہر رخ ہے'
اپنی دھن میں چلتے رہیو'
چلتے پہیوں میں چکراتی ہیں جھنکاریں' چلتے کُروں کی
پیڈل روک کے دیکھو زنجیروں کے دندانوں میں کتے بول اٹھے ہیں
(۲۷-۷-۱۹۶۹)

رکھیا اکھیاں

جھکی جھکی گھنگھور گھٹائیں
ساون، پھوار، ہوا، ہریاول،
رس کی نیند میں جاگتی دُنیا،

کچھ تو بولو...... تم کیوں ہنس دیں،
پتھر کے چہرے پہ جڑی اکھیو......

دل کہتا ہے، اَب کیا ہوگا:
ندی ٹیلوں تک لپکے گی
بہنے والے، بہتے بہتے
اپنی ہونی میں ڈوبیں گے

کچھ تو بولو...... تم کیوں ہنس دیں،
مجھ پہ ترس کھانے والی اکھیو......

تم جانو...... یہ جھونکے کس کے
عندیے ہیں...... اور یہ کن کن
تقدیروں کی برکھا، میرے
ڈرے ہوئے جی میں اتری ہے،

کچھ تو بولو...... تم کیوں ہنس دیں
اپنے بھرم پہ لجائی ہوئی اکھیو......

(۳۰-۷-۱۹۶۹)

ورنہ تیرا وجود.......

ورنہ تیرا وجود تو سچ کے سمندر میں ہے، مٹی کا وہ پشتہ
جس کے باطن کی جھوٹی خود بستگیاں ہی اس کو سنبھالے ہوئے ہیں
پھر وہ کون ہے، جو خود اپنے فوق سے تجھ کو یہ توفیق عطا کرتا ہے
تیرا ہونا ڈوبنے والوں کی آنکھوں میں ڈھارس بھر دیتا ہے
ورنہ تو تو خود اس ریلے میں ہے اِک پشتہ، بہ جانے والا،
پھر وہ کون ہے، جو یوں تیری سمت اشارا کر کے
طوفانوں میں گھری ہوئی روحوں کی بے پتوار نگاہوں سے کہتا ہے:
اس تنکے کا بازو تھام لو، شاید تم بچ جاؤ، ڈوبنے سے بچ جاؤ،
بندے، جانے کتنے لوگ ہیں جن کو تیری آس پہ جینا آساں ہے،
اور تو خود وہ پشتہ، جس کی جڑوں کو بھنور کی درانتی پیہم کاٹ رہی ہے
تو کیا کر سکتا ہے بندے
تو خود اپنے باطن کی جھوٹی خود بستگیوں کے سہارے پر باقی ہے
باقی تو ہے اِک یہ سچ کا سمندر، جس کی لہریں ہیں تقدیریں
اور ان تقدیروں کے اچھے اچھے دکھاوے
جانے کتنی آنکھوں میں بس جاتے ہیں، تیری نسبت سے!
کتنی آنکھوں میں ہے اِک یہ اداس توقع،
کتنی آنکھیں جن میں ایک ہی دیکھنے والا تیری جانب دیکھ رہا ہے کب تو
اس کی جانب دیکھے،

(۴-۹-۱۹۶۹)

غزل

ان گنت امروں میں ــــ اور کیا ہے ترے دِل کے لیے
اک جیون ہار ڈر سا ہے ترے دِل کے لیے

رک کے اس دھارے میں کچھ سوچ ــــ اِک یہ اچھا سا خیال
جو ترے حق میں ہے ــــ کیسا ہے تیرے دِل کے لیے

اپنے جی میں جی ــــ مگر اس یاد سے غافل نہ جی
جو کسی کے دِل میں زندہ ہے، ترے دِل کے لیے

سب ضمیروں کے ثمر ہیں، ــــ پستیاں ــــ سچائیاں
جانے تیرے ذہن میں کیا ہے ــــ تیرے دِل کے لیے

والہانہ رابطوں میں، جبر کے پہلو بھی دیکھ ــــ !
جو بھی دِل ہے ایک پنجرا ہے ترے دِل کے لیے

تو کہ اپنے ساتھ ہے، اپنے بدن کے واسطے
کوئی تیرے ساتھ تنہا ہے، ترے دِل کے لیے

تیری پلکیں جھک گئیں امجدؔ دیے جب یوں جلے
جانے کس کا ذکر چمکا ہے، ترے دِل کے لیے

(۱۴-۹-۱۹۶۹)

گھور گھٹاؤں

گھور گھٹاؤں کے نیچے......
پیڑوں کی لچکیلی باہیں......
کونپلوں کے کنگن پہنے......
جھک جھک کر......
جھیل کے پانی پر سے چننے آئی ہیں......
پیلے پیلے پتے اور بھورے بھورے بادل،......

جھیل کی جانب جھکی جھکی......
رستے ہی میں جم گئیں شاخوں کی باہیں......
جھیل سے کون اٹھا کر دے اُن کو......
پیلے پیلے پتے اور بھورے بھورے بادل،

چاروں اور سے اُمڈی اُمڈی گہری چھاؤں سہانی ہریاول،
تھم گئی آ کر زنگ آلود سلاخوں والی اس کھڑکی کے پاس
جانے جھریوں والا کالا چمڑا میرے دِل کا کب اس ٹھنڈک کو محسوس کرے

(۱۹-۹-۱۹۶۹)

اپنی خوب سی اِک خوبی......

اپنی خوب سی اِک خوبی میں اُس کے لیے اِک مستی تھی،
اور اپنی اس خوبی کے لچھن دیکھے اس نے، سب دُنیا سے چھپ کر،

اب وہ خوبی بھولا ہوا اِک خواب خوباں ہے
لوگوں کے ذہنوں میں، اس خوبی کی بابت، اَب اِک میٹھی میٹھی نفرت ہے
پھر بھی کون اَب ایسی باتوں کے بارے میں بات کرے
سب کی زبانیں چپ ہیں، سب کے دِل اس علم پہ نادم ہیں
ساری معرفتیں اَب بے بس ہیں

وہ مچھلی بس اِک بار اس گندے پانی میں نہائی تھی
اور اَب زریں طاق پہ اِک شیشے کی صراحی میں لہراتی ہے

اب رنگیں صدفوں میں دھنسی ہوئی وہ سرخ مساموں والے گوشت کی گٹھلی

بڑے بڑے لوگوں کی باتوں کے مفہوموں میں
تقدیروں کی کھسر پھسر سے بھرے ڈرائنگ روموں میں
تیرتی ہے اتراتی ہے
مرغولوں کی باچھوں میں مسکاتی ہے
کیسی خوب سی وہ خوبی اس کوراس آئی ہے

تو کس دُنیا سے ٹکرانے آیا ہے
تو کس جگ کی کایا بدلنے آیا ہے
کوڑھی اوگن ہاردلا!

(۲۱-۹-۱۹۶۹)

دیوں کے جلنے سے......

دیوں کے جلنے سے پہلے،
شام کی دھندلی ٹھنڈک میں
گھنے درختوں کے پیچھے
کل، جب تیرے نام کی زرد سیاہی طلوع ہوئی
اور پھر، اُس کے بعد
رفتہ رفتہ، جب ہر جانب سے
تیرے ذکر کی اِک رمزیلی تاریکی اُبھری
تاریکی جو تیرے نور کا اِک رخ ہے
تو اس دم اِک جابر دانائی،
روحوں کی ظلمات سے یوں گزری
جیسے اچانک رستہ روک کے کوئی کسی سے کہے:
''ادھر، ہماری جانب بھی تو دیکھ!
ان مردہ قلبوں کے اندر بجھتے ہوئے بلبوں کی نگری میں پھرنے والے
ہم تو اندھیروں میں بھی تیرے ساتھ ہیں......
ہم جو اندھیروں کے اس بھیس میں...... اپنی روشنیوں میں اجاگر ہوتے ہیں

(۱۱-۱۰-۱۹۶۹)

ہم تارے، چاند ستارے ہیں

(بچوں کے لیے)

ہم تارے ہیں،
ہم تارے، راج دلارے ہیں
ہم تارے، چاند ستارے ہیں

خوش خصلت ہیں، خوش طینت ہیں
ہم اس پرچم کی زینت ہیں
ہم جگ مگ کرتے تارے ہیں
ہم تارے، چاند ستارے ہیں

ان پیلے سبز دیاروں میں
اس دُنیا کے اندھیاروں میں
ہم روشنیوں کے سہارے ہیں
ہم تارے، چاند ستارے ہیں

ہم پھول اور باس اور ہریالی
ہم علم اور امن اور خوش حالی
ہم پاک وطن کے دلارے ہیں
ہم تارے، چاند ستارے ہیں

اس جیتے دیس میں جینا ہے
خوشیوں کا امرت پینا ہے
یہ باغ یہ پھول ہمارے ہیں
ہم تارے، چاند ستارے ہیں

(۱۲-۱۰-۱۹۶۹)

غزل

اک اچھائی میں سب کایا دُنیا کی
اس برتاؤ میں ہے سب برتا دُنیا کی

پھول تو سب اِک جیسے ہیں سب مٹی کے
رت کوئی بھی ہو دِل کی یا دُنیا کی

اس اِک باڑ کے اندر سب کچھ اپنا ہے
باہر ...... دُنیا، کس کو پروا دُنیا کی!

ان چمکیلے زینوں میں یہ خوش لوگ
چہروں پر تسکینیں دُنیا دُنیا کی

اجلی کینچلیوں میں صاف تھرکتی ہے
ساری کوڑھ کلنکی مایا دُنیا کی

پھر جب وقت بجھا تو ان پلکوں کے تلے
بہتے بہتے تھم گئی ندیا، دُنیا کی!

جم گئے خود ہی اس دلدل میں، اور خود ہی
کریں شکایت، اہل دُنیا، دُنیا کی

دُنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا کام
پہروں بیٹھے باتیں کرنا، دُنیا کی

دِلوں پہ ظالم یکساں سچ کا پہرا ہے
کوئی تو جھوٹی ریت نبھا جا دُنیا کی

(۲۰-۱۰-۱۹۶۹)

ننھی بھولی......

ننھی، بھولی، میلے میلے گالوں والی، بے سدھ سی اِک بچی
تیری جانب دیکھ رہی ہے، دیکھ اس کی آنکھیں تیری توجہ کی پیاسی ہیں

اس کی نازک، بے حس ٹھوڑی کو اپنی انگلی کی سنہری پور سے مس تو کر، اور
اس سے اتنا تو پوچھ ''اچھی بلو! تو کیوں چپ ہے؟''
اور جب وہ منہ پھیر کے اپنی آنکھیں اپنے ہی چہرے پہ جھکا لے
تو ہی بڑھ کر اُس کے ماتھے کو اپنے ہونٹوں سے لگا لے، ہاں ایسے ہی

یوں، اس جھنجھلو نے تجھ سے کہا کیا؟
یہ کیا؟ تیری آنکھیں بھیگ گئیں......؟ کیوں؟
اس نے تجھ سے کہا کیا؟
ساتوں آسمانوں کے مالک،
اتنے پتلے دِل والے مالک! ہم بھی روز اس چہرے کی کتھا سنتے ہیں،
ہم تو کڑا کر لیتے ہیں جی، ایسے موقعوں پر!

(۶-۱۱-۱۹۶۹)

گستاپو

باتوں باتوں میں وہ لوگوں کے ذہنوں سے کوڑا کرکٹ چن لیتا ہے
لوگوں کے ذہنوں سے، اوروں کے بارے میں، ایسی ایسی باتیں چن لیتا ہے
جو دُنیا والوں کی کھلی باچھوں میں سفر کرتی ہیں
یہ باتیں اس کی دانست کا سرمایہ ہیں
یہ سرمایہ ایک گھمنڈ ہے کڑواہٹ کا
اُس کے رخ پر بکھرا ہوا ہے وہ سب لوہا، جو اُس کے دِل کا لہجہ ہے
اُس کے باہم بھنچے ہوئے ہونٹوں کا دباؤ جب اس کی آنکھوں کو چمکا دیتا ہے
عرشوں کے محلوں میں فرشتے اپنی شمعیں بجھا دیتے ہیں

میری طرف آج اس نے یوں دیکھا ہے
جیسے میں بھی اُس کے غرور کا اِک لقمہ ہوں، اس کی دانستوں میں
آخر اُس کے پاس اِک علم ہے میری بابت
آخر کل ہی تو وہ آسمانوں پر جا کر،
اپنے ذہن کی چوپتری پر
آنے والے برے دنوں کا ٹیوا اتار کے لے آیا ہے

(۱۶-۱۱-۱۹۶۹)

تم کیا جانو......

تم کیا جانو، مجھ سے پوچھو، میں اس مٹی کی سوکھی پتلی تہ پر کھیلا ہوں
اس مٹی کی تہ کے نیچے گدلا گاڑھا گہرا پانی ہے سیلانی سیلابوں کا
پھر وہ دِن بھی تھے کچھ بڑے البیلے اور تب علم بھی مجھ کو نہ تھا ان دنوں کا جب

ہر ذرّہ سورج بن جاتا ہے
ہر سو مٹی کی اس سوکھی پتلی تہ پر لوگ نرالے دنوں کی خوشی میں چوکڑیاں بھرتے پھرتے تھے
میری طرح سب کالے ذرّے چمکیلے خوابوں میں گم تھے
اور کچھ میں بھی تھا اِک ایسی دُنیا میں، جس میں سارے لوگ اِک جیسے تھے
تم کیا جانو، کن جتنوں سے اَب میں ان وقتوں کے سارے کھتان اور ساری دلدلیں
پھاند کے اس دُنیا تک پہنچا ہوں، جس میں اَب میرے سوا سب کچھ ہے!
تم کیا جانو، تم تو آج اِک مجھ سے نفرت کرنے والی شفقت اپنی آنکھوں میں بھر کر آئے ہو
یہ نفرت، تو اِک مزمن بے علمی ہے
اور یہ شفقت بھی تو خود افروز دِلوں کی اِک متعدی بیماری ہے
میری ساری دعائیں تم پہ تصدق، کیا تم یوں میری بے مائیگیوں کا مول چکا سکتے ہو
دیکھو، تم تو خود مٹی کی اس سوکھی پتلی سی تہہ پر اور کروڑوں آدمیوں کے ساتھ کھڑے ہو
جس کے نیچے سیلانی سیلابوں کا پانی ہے!

(۲۹-۱۱-۱۹۶۹)

اور اَب یہ اِک سنبھلا سنبھلا ......

اور اب، یہ اِک سنبھلا سنبھلا، تھکا تھکا سا شخص
اب بھی جس کے جھریوں والے چہرے پر اِک پیلی سوچ کا بچپن ہے

ساری عمر اس کی،
اپنی اس اِک دھن کو بڑھاوا دینے میں گزری:
"مگن مگن بیٹھیں،......
چاندی کی چھت کے نیچے
اس قرنوں کے بچھونے پر
مگن مگن بیٹھیں!
چنیں خود اپنے خیالوں کے کنکر،
یہ کنکر مل کر بن جائیں گے لوحیں،
لوحیں جن کو دُنیا اِک دِن پوجے گی......

اور اَب یہ اِک شخص......

اک جانب کو اُس کے قد کا جھکاؤ......

اور اسی جانب کے بوٹ کی ایڑی گھسی ہوئی،

اور اسی جانب کا کوٹ کا پلو مڑا ہوا، اِک جامد بازو کے نیچے

اور وہ خود ساکت،

اُس کے گرد ہزاروں تیز ہراساں قدموں کا اِک لہراتا جنگل،

اور وہ ان قدموں کے سفر میں تنہا

جاتے جاتے کسی نے پوچھا: بھائی کیسے ہو،

اس کی آنکھوں میں بچپن لوٹ آیا،

ہنس کے وہ کہنے لگا:

''تم تو مجھے پہچانتے ہو، تم جانتے ہو جو زینہ تمھارے دِل سے میرے دِل تک ہے

تم میرے دِل تک آ سکتے ہو،

آؤ گے؟

آؤ، بیٹھ کے اپنے خیالوں کے کنکر رولیں،

یہ کنکر مل کر بن جائیں گے لوحیں،

لو جیں جن کو دُنیا اِک دِن پوجے گی'
اور پھر اِک دِن اُمڈ پڑے گا زمانہ ہماری طرف''

اور وہ اِک لمبے رستے کی شطرنجی پہ اکیلا کھڑا تھا'
اور جو قدم اس نے ابھی آگے کو بڑھانا تھا اس ایک قدم کا کرب
اُس کے بھر بھرے سے چہرے کے میلے مساموں تک رس آیا تھا
اور اس کا ماتھا چاندی کا تھا

(۱۴-۱۲-۱۹۶۹)

مینا

جب تو اُن کے گھر کے صحن میں اِک مینا تھی، چاندی کے پنجرے میں
تجھ کو وہ دِن اچھے لگتے تھے، نا
تب تو تجھ کو اس کی خبر بھی نہیں تھی، تیرے آب و دانے میں کیا ہے
تجھ کو خبر بھی نہیں تھی......
تب تیرا چوگا تو انگوروں کے رس میں گندھا ہوا نمکیلا بھیجا تھا،
ان جلتی آنکھوں والی بے تن کھوپڑیوں کا
جن کے مہین خلیوں میں اِک وہ چنگاری چٹکی تھی جو سربقا ہے!
تجھ کو وہ دِن اچھے لگتے تھے نا،
اور اَب بھی تجھ کو وہ دِن یاد آتے ہیں نا، ......اَب بھی
اب جب تلواروں کی نوکیں تیرے گلے پر رکھ کر تجھ کو پیار بھری نفرت
سے یوں چمکارنے والے
اپنے جسموں کی مٹی میں خواب فنا ہیں

میری باتیں سن کر، مجھ کو ٹک ٹک دیکھنے والی، چوکور آنکھوں والی، مینا
ہاں وہ قاتل اچھے تھے نا،
اب تجھ کو وہ دِن یاد آتے ہیں نا،
اب اس وادی کی بھرپور گھنی سبز لتا میں اڑنا اور یوں راتب چننا کتنا
مشکل ہے!
اب یوں اڑنے میں تیرے پر دُکھتے ہیں نا، مینا!

(۱۴-۱۲-۱۹۶۹)

سب کو برابر کا حصہ......

سب کو برابر کا حصہ ملتا ہے' اس میعاد سے' جس کو
دن کہتے ہیں'
سب کے سروں پر'
سورج کی تقدیرِ سفر' یکساں لمبی پڑی ہے'
کسی کے آگے دِن کا قد نہیں گھٹتا'
کسی کی خاطر دِن کی حد نہیں بڑھتی
سب دِن اور سب کے دِن کٹ جاتے ہیں
سب گزرے دن' سب کے گزرے دِن سب اِک جیسے ہیں
کھوئی ہوئی اس اِک پونجی میں سب ساجھی ہیں
تیرے دن' جو تیری آنکھوں کی ٹھنڈک میں گزرے'
میرے دن' جو میرے دِل سے نہ گزرے
آج وہ کیا ہیں' کسی خلا کے خانے' خالی خالی خانے'
دیکھیں تو سہی' کھولیں تو سہی' ان خانوں کو'

(۳۱-۱۲-۱۹۶۹)

کہاں سفینے......

کہاں سفینے اس خودموج سمندر میں ان روحوں جیسے'
روحیں' جن کے خیال سے میں جیتا ہوں......

جب دریا چڑھتا ہے' اور جب اس کی کوئی سیہ سی لہر' اچانک
میرے دِل کے ٹھنڈے پانیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے
تو میں' سب پتواریں چھوڑ کے' بے بس ہو کے' اتر جاتا ہوں
ان ہوتے امروں کی منشاؤں میں
اور اس اِک وقفے میں' ڈرتے ڈرتے'
جلدی سے بھر لیتا ہوں' اپنی آنکھوں کی کشتیوں میں' ان سب لوگوں کو
جن کے خیال سے میں جیتا ہوں
تب میری پلکوں کے سایوں میں یہ روحیں' سب اِک ساتھ' اکٹھی
کشاں کشاں' اس کوشش کے محور میں آ جانے کا جتن کرتی ہیں
جس کی کشش سے سب دریا چڑھتے ہیں'
کہاں سفینے' اس خودموج سمندر میں' ان روحوں جیسے
روحیں' جو میرے جی میں جیتی ہیں......

(۱۰-۱۰-۱۹۷۰)

سبھوں نے مل مل لیں......

سبھوں نے مل مل لیں اپنے چہروں پر،
مٹیاں اپنی عمروں کی،......اور یوں جو شکلیں نتھری ہیں
ان سے ہی اب اُن کی پہچانیں ہیں
عمروں کی اس مٹی میں کرموں کے خمیر کی اُبھرن ہیں یہ شکلیں،
اپنی اپنی گزرانوں میں مسخ شدہ یہ چہرے فساد ہیں ان احوالوں کا
جن سے ہم سب گزرے ہیں
اک اِک شخص کی شکل اس کی اپنی مشکل ہے
کاش اپنی اپنی مشکل کو سمجھ سکتے یہ لوگ کہ جن کی شکلیں
جن کے کرموں کے پھل
اُن کی نظروں سے اوجھل ہیں
جن کی اصل مخفی شکلیں تو خود اُن کی روحوں کے آئینوں میں بھی اُن کے آگے
نہیں اترتیں
جن کی اصلی شکلیں تو حصہ ہیں اس اِک بُری بھری تصویر کا، جس کو
ساری دُنیا اس نفرت سے دیکھ رہی ہے!

(۲۰-۱۰-۱۹۷۰)

کل بچھڑے......

کل بچھڑے آپس میں باتیں کرتے جاتے تھے
ہم تو سب کچھ جانیں
سب کچھ، جس کو دُنیا جانے، لیکن منہ سے نہ مانے
ری، ری، ری، ہم سب کچھ جانیں، کیا ہیں خوشیوں کے یہ سارے دکھاوے
یہ سب گھاتیں،
میلی میلی گلیوں میں یہ لگتی اکھڑتی قناتیں
چہل پہل کے اِک دو دِن اور اِک دو راتیں
گھی اور گڑ کے قوام سے بوجھل باتیں
سارے لوگ، اِک جیسی ذاتیں
باہر، باہر بیش بہا سوغاتیں
باہر، باہر، بڑے گھمنڈ اور بڑی تمکینیں

باہر، باہر، خوشیوں کے سات آسمان اور سات زمینیں،
اندر، اندر، اتی سی جاگیروں کی تسکینیں،
اور وہ سب کچھ بھی...... ری ری ری! اچھا، اچھا ہم نہیں کہتے!
اپنے چہرے ڈھانپ کے چلنے والی یہ سب قدریں اور اُن کی تقدیسیں،
یونہی ہم پر دانت نہ پیسیں،
اچھا، اچھا، لو ہم منہ سے کچھ نہیں کہتے
گو ہم سب کچھ جانیں، سب کچھ جانیں

(۲۰-۱۰-۱۹۷۰)

کوہستانی جانوروں......

کوہستانی جانوروں برفانوروں کی سمور
اس سرما میں تو......
اس کم سن فسطائیت کے گورے جسم پہ اَب بھی ویسی ہی ہے
جیسی تھی، منقوش عباؤں والے گزرے دنوں میں
تب بھی، اس مٹی کے دِل میں اپنے ہونے کا ڈر ویسا ہی تھا، جیسا اَب ہے!
ظلم کی اس بازی میں میرا خوف، اس لمبے عرصے کی شطرنجی پر
جانے کن تقدیروں کا پانسہ ہے
جانے اس اِک ڈر کی بھی کتنی کڑیاں ہیں، جو سب کی سب میرے لیے ہیں
اور جن کی نسبت سے میری سچی باتیں بھی بے مصرف ہو جاتی ہیں
ورنہ میں تو سچے دِل سے چاہوں، کاش اس کھٹ کھٹ چلتی، فربہ فربہ
گوشت کی گٹھلی کے ساتھ اِک ایسی کم وزنی بھی پروان چڑھے، جو

اس مٹی کے ذرّوں کی طینت میں بٹی ہوئی ہے
لیکن زرد سمور میں لپٹا ہوا یہ مٹاپا
اس نے تو اَب کس بھی لیے اپنے دِل پر قبضے' چاندی کے!
اُس نے تو اَب چھت بھی لیں سب اپنی سوچیں'
اب تو اُس کے ایک قدم کی پہنچ ہیں' مجھ جیسوں کی صد ہا عمریں
شاید میری مٹی اسی طرح سے اور ہزار برس اُن کالی سرد ہواؤں میں تھر تھر
کانپے گی
روندے جانے کا ڈر اس کو روندے گا......

(۲۶-۱-۱۹۷۰)

اپنے لیکھ یہی تھے......

اپنے لیکھ یہی تھے، منوا،
ورنہ میرا سچ تو سب کا علم ہے اور سب پر ظاہر ہے
میرا سچ تو ہے اس پنجر میں جینے والی اک بے بس آگاہی، جس کو سب
نے پرکھا ہے
میری سچائی کو سمجھنے والے، میرے سچ کے حق میں سچ ہوتے
تو یوں اُن کے دِلوں میں، اِک اِک قبر نہ ہوتی، میرے آنے والے دنوں کی
جیسا کچھ بھی اُن کا گمان ان آنے والے دنوں کے بارے میں ہے

پھر میرا دِل کیوں نہ دُکھے جب میں یہ دیکھوں،
میری سچائی کو سمجھنے والے
میری بابت اپنے علم کو جھٹلانے کی کوشش میں، ہر گری ہوئی رفعت کو اپنا تے ہیں

پہلے میرے ہونے کو اپنے دِل میں دفنا دیتے ہیں
اور پھر میرے سامنے آ کر میرے سچ پہ ترس کھاتے ہیں
اور یوں مجھ کو جتاتے ہیں کہ اُنھیں سب علم ہے، میرا سچ دم توڑ چکا ہے
میری سچائی کو سمجھنے والے بھی جب یوں کہتے ہوں
کون اس وار کو سہہ سکتا ہے
میرے دِل میں میرے سچ کے قدم اکھڑنے لگے ہیں
اب کوئی تو اِک اور جھوٹی سچی ڈھارس 'منوا'
آخر جینا تو ہے
اور جینے کے جتنوں میں زخمی چیونٹی کی بے بس آگاہی بھی عقلِ کل ہے!

(۳-۲-۱۹۷۰)

اپنے دِل میں ڈر......

اپنے دِل میں ڈر ہو تو یہ بادل کس کو لبھا سکتے ہیں
اپنے دِل میں ڈر ہو تو سب رُتیں ڈراؤنی لگتی ہیں اور اپنی طرف ہی گردن
جھک جاتی ہے

یہ تو اپنا حوصلہ تھا'
اتنے اندیشوں میں بھی'
نظریں اپنی جانب نہیں اٹھیں اور اس گھنگھور گھنے کہرے میں جا ڈوبی ہیں
اور اَب میری ساری دُنیا اس کہرے میں نہائی ہوئی ہریاول کا حصہ ہے
میری خوشیاں بھی اور ڈر بھی

اور...... اسی رستے پر' میں نے...... لوہے کے حلقوں میں......
اک قیدی کو دیکھا
آہن چہرہ سپاہی کی جرسی کا رنگ اس قیدی کے رخ پر تھا'
ہر اندیشہ تو اِک کنڈی ہے جو دِل کو اپنی جانب کھینچ کے رکھتی ہے اور وہ

قیدی بھی

کھچا ہوا تھا اپنے دِل کے خوف کی جانب، جس کی کوئی رت نہیں ہوتی
میں بھی اپنے اندیشوں کا قیدی ہوں، لیکن اس قیدی کے اندیشے تو،
اک میرے سوا، سب کے ہیں،
اک وہی اپنے اپنے دُکھ کی کنڈی،
جس کے کھچاؤ سے اِک اِک گردن اپنی جانب جھکی ہوئی ہے
ایسے میں اَب کون گھٹاؤں بھری اس صبح بہاراں کو دیکھے گا
جوان بور لدے اندیشوں پر یوں جھکی ہوئی ہے، آموں کے باغوں میں،
مری روح کے سامنے

(۹-۳-۱۹۷۰)

دنوں کے اس آشوب......

دنوں کے اس آشوب کے ساتھ اِک تیرے ذکر کا امن بھی جس کو مل جائے
اس کی خاطر ساری مٹھاسیں تیرے نام میں ہیں
تو ہی جس کی خاطر چاہے اپنے نام میں اپنی کشش رکھ دے
تیرے امر، تری منشائیں جس کے بھی حصے میں آ جائیں،
نہیں تو باقی کیا ہے، مٹی میں مل جانے والی عمریں، مجھ جیسی
میں، جس کے......دل کی موت میں اِک یہ ڈھارس جیتی ہے
شاید یوں ہو، سب کچھ تیرے کرم کی رمزیں ہوں،
میرا ایسے ایسے گمانوں میں گم رہنا بھی، شاید تیرے کرم کی رمزیں ہوں،
ایسے ایسے گمان
شاید تو،
خود ہی اپنے آپ کو میرے دِل سے بھلوا دیتا ہے

اور پھر خود ہی میری بھول پہ مجھ سے خفا ہو جاتا ہے
یوں دھتکارا ہوا میں جا گرتا ہوں' لوہے کی گردن والی ان کاٹھ کی روحوں میں
جن کے آسیبوں سے بچنے کی کوشش پھر مجھ کو تیرے امروں میں لے آتی ہے
اور میری سانسوں میں پھر سے وہ تسبیحیں گرداں ہو جاتی ہیں' جن میں تیرے
نام کے دانے ہیں
اے وہ جس کے نام کے میٹھے ورد میں ازلوں سے وارد ہیں'
سارے زمانے' سارے ابد
(۱۷-۳-۱۹۷۰)

فصلِ گل!

تم نے میٹھے مٹروں کی ڈالی سے، ڈرتے ڈرتے
تتلی جیسی ایک کلی کو توڑ کے سونگھا ...... سوچا،
اور پھر آنکھیں میچ کے، اپنے آپ میں، خود ہی خود کھلا گئے تم
اپنے پاگل پن میں، اپنے آپ سے روٹھی ہوئی یہ خوشیاں تو سب مندے
کی باتیں ہیں

آخر ہم بھی تو ہیں
کتنا مال ہے، اس دُنیا کا، جس کا بوجھ ہماری پلکوں پر ہے
اور یہ پلکیں ہیں جو پھر بھی تنی ہوئی ہیں
تم اِک بار ہماری آنکھوں سے بھی تو دیکھو
اس پرگنے کی اِک اِک کیاری میں ہر پنکھڑی سونے کی ٹکلی ہے
اب کے ہم نے پہلے تو یہ پگھلی ہوئی سب اشرفیاں اپنی آڑھت میں سمیٹیں،

اور پھر، اُن کی اصلی اوسوں کے ساتھ، اُن کے ٹرک بھر بھر کے بھیجے،
میلے میں، جو اَب کے پھولوں کی رت میں آیا ہے
سچ پوچھو تو بڑا لگا اَب کے اپنا سیزن پھولوں کا،
جانے تم کیوں سب چیزوں کو اپنی روح کے تہہ خانوں میں بھر لیتے ہو،
ذرا اس اپنے دِل کی کلی کو توڑ کے اپنی نوٹوں والی جیب میں رکھ لو،
اور پھر مزے مزے سے پھر و اس پھلواڑی میں،
ورنہ ان زرخیز بہاروں میں کمھلا جاؤ گے،

(۲۴-۳-۱۹۷۰)

بندے تو یہ کب مانے گا......

بندے تو یہ کب مانے گا، پھر بھی تیرے چہرے کی بھسماہٹ میں جو کچھ
میں نے دیکھا ہے، تجھ سے کہہ دوں
یہ تیرا چہرہ! بس بھرا بھرا سا، اور اس پر گزرے دنوں کے چکٹ سے
جیسے راکھ، اور اُس کے مسام، اور کالا زرد لہو، اور سب کچھ
میلا میلا سا دُکھ
تو جس کو پہلے سے جانتا ہے، وہ رمز اک تجھ سے کہہ دوں،
میرا اندازہ ہے، عمر کی اس منزل پہ اگر تو اپنی ان بے چارگیوں پر
جبر کرے...... تو
یوں تیری آنکھوں میں لپک لپک کے نہ آئے
وہ شعلہ، جو تیری روح میں بجھنے کو ہے!
تو سمجھے گا، یہ سب شاید تیرے دِل کی گلی سڑی سازش ہے،

میں یہ تو جانوں، اس سازش کا سب ساز و ساماں باہر سے آتا ہے
بندے، یہ تو دُنیا ہے جو لوگوں سے کہتی ہے "میری طرف آنکھیں
چمکا چمکا کر دیکھو"
مرنے والا جاتے جاتے اس دھوکے میں آ جاتا ہے!
اس دھوکے میں آنے والے کو اِک یہ راحت ہے، اپنے آپ کو دھوکا
دے سکتا ہے
اپنی جانب آنے والی موت سے آنکھیں پھیر کے پل بھر اپنی بھول میں جی سکتا ہے
اور وہ...... تیری طرح...... آنکھیں چمکا چمکا کر سدا چمکنے والے چہروں کو
یوں حسرت سے تکتا ہے!
بندے، اپنی آنکھوں میں اِک یہ گدرائی ہوئی للچاہٹ لے کر مت پھر
اس دُنیا میں،
تیرے دِل کے گڑھے میں تیری لحد کچھ اور بھی گہری ہو جائے گی

(۱-۴-۱۹۷۰)

شاید تیرے کرم......

شاید تیرے کرم کا اور ہی کچھ منشا ہو'
یا اَب جو میری حالت ہے' شاید اس میں
امر اک تیری قدرت کا ہو میرے حق میں
لیکن جس تکلیف میں میں ہوں' اُس کے ہوتے ہوئے میرا دِل تو باور نہیں کرتا
میرا دِل تو بس اتنا کچھ مانے' بس اتنا کچھ جانے
تو چاہے تو ہر پانسے کو پلٹ سکتا ہے
عین کرم میں
عین غضب میں
میں تو اپنے خطروں اپنی آرزوؤں میں بٹا ہوا اِک وہ ذرّہ ہوں
جس کے ذرا سے دِل کو
ذرا سا ارماں ہے' ان امنوں کا جو تیرے چمنوں میں ہیں

(۱۳-۴-۱۹۷۰)

کون ایسا ہوگا......

کون ایسا ہوگا جو سب کے دِلوں کی ٹھنڈک کا رسیا ہو'
ایسے شخص کے من میں آئی ہوئی اِک بات تو وہ جھونکا ہے'
جو اِک ساتھ زمانے بھر میں پھول کھلا دیتا ہے
اور...... یہ بات کہیں باہر سے تو نہیں آتی'
یہ تو دِل پر ایک گرہ ہے' جس کا کساؤ کبھی بھی کم نہیں ہوتا'
جو بھی اسے محسوس کرے' یہ چوٹ سدا اُس کے دِل پر ہے
جب بھی کوئی اسے اپنی سانسوں میں ڈھونڈھے'
اس کی آنکھوں میں بھر جائیں وہ سیال شبیہیں'
جن کے دُکھ اور جن کے جتن ان بستیوں کے گہنے ہیں
جن کی خوشیوں کے لیے جینا' ان بھیدوں میں جینا ہے' جو
ازلوں سے ان ذرّوں کی جنبش ہیں'

کون ایسا ہوگا جو اپنے دِل کی کسک تک پہنچے‘
اور پھر ایک قدم خود پیچھے ہٹ کر‘
اپنی پہنچ کو اوروں کے لیے برتے‘ سب کے دِلوں کی ٹھنڈک کے لیے برتے‘
کون ایسا ہے اس دُنیا میں؟
کتنے خطرے دِلوں کو دِلوں سے ہیں..... سوچوں تو میرا دِل دُکھتا ہے!
گنگ زبانوں بولتی آنکھوں والے چہرے قدم قدم پر مجھ سے جب یہ پوچھتے ہیں‘
کون ایسا ہے ’’ہم کس سے پوچھیں؟‘‘
تو میرا دِل دُکھتا ہے..... اور میرے سینے میں بھیدوں کا سب دھن
خاکستر ہو جاتا ہے!
(۲۱-۴-۱۹۷۰)

آج تو جاتے جاتے......

آج تو جاتے جاتے اس نے مجھے اِک ہامی بھرنے والے پیار سے دیکھا'
بڑے اقرار سے دیکھا
اس اِک آن میں...... میری سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی: یہ سب کچھ تھا
امکان میں
لیکن اس نے تو میری سانسوں کا ادھورا پن پہچان کے سب کچھ جان کے بھی'
یوں مجھے دیئے للچاوے اپنی اِک مسکان کے: جس میں
ہارے ہوئے خود اُس کے من کا سنبھالا بھی تھا'
اور مجھ جیسے ترسے ہوئے پہ ترس کھانے کی کسک بھی'
جاتے جاتے اُس کے دِل میں جانے کیا بات آئی ہوگی'
......اور اِک میں تھا'
......اور اس دِن اِک میں تھا جس کے لیے ان کبھی نہ ملنے والی
سب اچھی اچھی خوشیوں میں کبھی نہ ملنے والے سب اچھے اچھے دُکھ تھے

(۲۷-۴-۱۹۷۰)

پہلی سے پہلے

دن تو ایک سے ہوتے ہیں سب،
لہو رگوں میں جب بہتا ہو،

لیکن جانے اَب کے میرے ذہن میں یہ چنگاری سی کیسی چٹکی ہے

اب کے مہینے کے آخر میں یہ جو دِن آئے ہیں
کچھ یوں لگے ہیں، جیسے
انہی دنوں میں، میرے وجود کے ذرّے کے لیے، سب سورج چمکے ہوں،
سب سورج،
سب گردشیں،
سب تاریخیں،
سارے زوال، جو تہذیبوں کے سایوں میں، انسانوں کو روٹی کے ٹکڑے کے لیے ترساتے آئے ہیں
سارے خیال، جو آنے والوں اچھے دنوں کا دھن ہیں
اور جو موت کی وادی سے ہو کر ذہنوں میں آتے ہیں

(۳۰-۵-۱۹۷۰ء)

مورتی

کہاں ہے اب، وہ جو برسوں پہلے اس مٹی پر دُنیا کے نرغے میں اِک مورت تھی،
اک مورت، خوابوں کے بچپن جس کی پرستش کرتے تھے،
کہاں ہے اب وہ بے کل پلکوں والی پگلی سی اِک سچائی،
جو اس جھوٹی دُنیا کو جھٹلانے آئی تھی
اس مٹی کے نیچے، اَب بھی اٹل حصاروں سے حجت کرنے والے اس جھونکے کے
پیوند ہماری ان سانسوں میں ہیں
لیکن جانے کہاں ہے اَب وہ پگلی سی اِک سچائی

یونہی کھنکتے کھنکتے قہقہوں والی ناداں عمریں کالی نیندوں میں کھو جاتی ہیں
کیسی ہیں یہ نیندیں، جن کے سمندر دِلوں کے جزیروں کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں
کیسے ہیں یہ ان نیندوں میں تیرنے والے، پلٹ پلٹ کر آنے والے خواب
......خواب،
جن کا بچپن کبھی نہیں ڈھلتا!

(۹-۶-۱۹۷۰)

اے وہ جس کے لبوں......

اے وہ جس کے لبوں کی دعائیں' میری زباں تک بھی پہنچی ہیں'
اک پستک کے حوالے سے' جو
دین تھی ایسے ہاتھوں کی' میں جن کو تھام کے اک دن خواب میں'
علم کے سینہ یاب سمندر سے گزرا تھا'

آج اس زہریلے پانی کے بھنور میں اپنے پاس یہی اکھڑے اکھڑے بوسیدہ سے
ورق ہیں
اور یہ مٹے مٹے سے لفظ' کہ جن پر تیرے ہونٹوں کی مہریں ہیں

تیرے ہونٹوں کے دہرائے ہوئے یہ لفظ مرے ہونٹوں پر جب آتے ہیں'
تو اس بھنور میں میرا دل بس سوچتا ہے اک تیری بابت
تیری بابت' تیرے زمانے' تیرے دنوں کی بابت
تو اور بٹے ہوئے رسوں جیسے وہ بازو'
ٹکڑے ٹکڑے' اکڑے اکڑے سے وہ تیرے ہات کڑکتی پتواروں پر
— اور وہ تیرے تھکے تھکے سے چہرے پر ان تھک تسکینیں
جیسے دریا سب تیرے ہیں
جیسے لہروں سے لڑنے والے بازو سب تیرے ہیں

(۱۷-۶-۱۹۷۰)

گدلے پانی......

جو بھی بہتے دریا سے اپنا چلو بھر لے' یہ دریا اس کا ہے
اپنی سب پاکیزگیوں کے ساتھ اس کا ہے
چاہے اس پانی میں جیسے بھی جوہر ہوں'
اچھے برے جوہر' جو دریا کی سیال حقیقت میں' اِک ساتھ پنپ کر'
بجھ کر' تپ کر' یوں ظاہر ہیں' سب طاہر ہیں'
جس کی پیاس کو اس پانی پر حق ہو'
اسے بھلا کیوں شک ہو کہ ان قطروں میں مقید ہیں وہ جوہر جو جید ہیں
دل میں پانی کی ٹھنڈک یہ کہتی ہے کہ طلب کا جو حاصل بھی ہے طیب ہے'
ٹھنڈک پانے والا اسی یقین کے بل پر
اپنے گمان میں' خوشیوں کی اس موج سے اپنی روح کے جوہڑ بھر لیتا ہے'
جس کی چھلک اس کی آنکھوں کے ڈوروں تک آتی ہے
کتنے چہروں پر ہے اپنے آپ میں کافی ہونے کی اِک یہ کیفیت
ان قدروں کی اچھی سی اِک دین کہ جن کے مقدس دریا
سب گدلے ہیں!

(۲۹-۶-۱۹۷۰)

ہر سال ان صبحوں......

ہر سال، ان صبحوں کے سفر میں...... اک دِن ایسا بھی آتا ہے،
جب، پل بھر کو، ذرا سرک جاتے ہیں، میری کھڑکی کے آگے سے، گھومتے گھومتے
سات کروڑ کرّے اور سورج کی پیلے پھولوں والی پھلواڑی سے اِک پتی اڑ کر
میرے میز پر آ گرتی ہے!

ان جنباں جہتوں میں ساکن!

تب اتنے میں، سات کروڑ کرے، پھر پاتالوں سے اُبھر کر، اور کھڑکی کے سامنے آ کر،
دُھوپ کی اس چوکورسی ٹکڑی کو گہنا دیتے ہیں،
آنے والے برس تک،
اس کمرے تک واپس آنے میں، مجھ کو اِک دن، اس کو ایک برس لگتا ہے

آج بھی اِک ایسا ہی دِن ہے،
ابھی ابھی اِک آڑی ترچھی روشن سیڑھی صد ہا زاویوں کی، پل بھر کو جھک آئی تھی،
اس کھڑکی تک
ایک لرزتی ہوئی موجودگی اس سیڑھی سے، ابھی ابھی اس کمرے میں اتری تھی
برس برس ہونے کے پرتو کی یہ ایک پرت اس میز پر دم بھر یوں ڈھلتی ہے!
جانے باہر اس ہونی کے ہست میں کیا کیا کچھ ہے
آج یہ اپنے پاؤں تو پاتالوں میں گڑے ہوئے ہیں

(۲۵-۷-۱۹۷۰)

دامن دل......

سدا رہے یہ دُھلا دُھلا اور ستھرا ستھرا،
زندہ،
اپنے وجود کی اصلیت سے منوّر؛
اس پر میل نہ رہنے پائے،
اس کو گھس دے
اس کو سل پہ پٹخ دے
اس کو توڑ مروڑ نچوڑ دے، کس دے
اس کو جھٹک دے،
اس کی گیلی شکنیں چن لے
اس کو سچے سکھ میں سکھا!

(۲۶-۷-۱۹۷۰)

جلسہ

آج سحر دم میں نے بھی رک کر وہ جلسہ دیکھا

پکی سڑک کے ساتھ' ذخیرے میں' ٹوٹی سوکھی شاخوں کے
چھدرے چھدرے سائبانوں کے نیچے'
شیشم کے گنجان درختوں کے آپس میں جڑے تنے' سب
اس جلسے میں کھڑے تھے!
ایک گزرتے جھونکے کی جھنکار ذخیرے میں لرزاں تھی'
''آس پاس کی کالی رسموں کے سب کھیت ہرے ہیں'
اور یہ پانی تمھاری باری کا تھا'
اب کے بادل دریاؤں پر جا کر برسے'
ان سے تمہارا ابھی تو عہد نامہ تھا

اب کیا ہوگا؟.........

چلتے آروں کے آگے چرتے گرتے جسموپاتاوں میں گر جاؤ

ورنہ''

اس تیکھی حجت میں اتنی سچائی تھی

جیسے ان پیڑوں کے سب اک ساتھ ہلے غصے میں......

اور میری آنکھوں میں پھر گئے دُکھ اک ایسے خیال کے' جس کی ثقافت

جانے کب سے اپنا مسکن ڈھونڈ رہی ہے!

(۲۷-۷-۱۹۷۰)

دل کا چھالا

پہلے آنکھ میں کڑوی سی اِک لہر

اور پھر اِک جرم

اور پھر یہ سب دُکھ

سب دُکھ اس اِک پاپ کی جنتا'

سارے عذاب ضمیروں کو کجلانے والے

گہری کلنک بھری دُکھتی ریکھائیں جن کے الجھاوؤں میں عمریں بٹ جاتی ہیں

اک ہونی کے کتنے جنموں میں اس پاپ کا لمبا پھیرا پڑتا ہے' دُنیا کو

دُکھ سے بھر دیتا ہے

اچھا تھا جب دِل کا چھالا پھوٹا تھا' ہم اپنے قدموں میں رک جاتے

(۱۸-۸-۱۹۷۰)

عذاب

اپنے ثواب میں نیکی اپنے عذاب سے غافل رہ جائے، تو
چھن جاتی ہیں جینے کی سب خوشیاں
ٹوٹ کے رہ جاتا ہے بھروسا اپنا، اس نیکی پر،
گھل جاتی ہے، اپنے آپ سے نفرت میں، اپنی ہر اچھائی،

اپنے قلب کو اَب کوئی چاہے جس قالب میں بھی ڈھالے
اب سب پچھتاوے ٹیسیں ہیں
اب دُنیا کی آخری حد تک پھیلے ہوئے ان بادِلوں کے نیچے یوں
پلکیں جھکا کر اپنے غموں کی پرستش بے مصرف ہے
باہر اَب صرف آنکھیں دیکھتی ہیں......اور
باقی سارے بدن تیزابوں کے تالابوں میں تحلیل ہیں
آنکھیں دیکھتی ہیں......اور اس سے زیادہ کیا دیکھیں گی،
سارے خداؤں نے منہ پھیر لیے ہیں

(۳۰-۸-۱۹۷۰)

موٹر ڈیلرز

اُن کی کنپٹیوں کے نیچے
کالی لمبی قلمیں،
اُن کے رخساروں کے بھرے بھرے بھرپور غدودوں تک تھیں

تھوڑے تھوڑے وقفوں سے وہ زرد گلاسوں کو ہونٹوں سے الگ کرتے......اور
پھر دھیمی دھیمی باتیں کرتے اپنی نئی نئی ان داشتاؤں کی
جن کے نام اور جن کے نرخ اس دِن ہی اخباروں میں چھپے تھے،
(۷-۹-۱۹۷۰)

اپنے بس میں......

اپنے بس میں تو بس اتنا کچھ تھا'......اور وہ بھی' سب تیری خاطر'

اس دِل نے اپنائی' عمر بسر کرنے کی اِک یہ نہج بھی' تیری خاطر'
اپنی انا کی بھینٹ بتری خاطر تھی'
نطق پہ مہریں تھیں سب' تیری خاطر'
تیرہ ضمیروں سے گزراہوں' گلیوں کی دیوار سے لگ کر' تیری خاطر'
نخوت کے بازار میں' میرے جسم پہ ٹھنڈی ہوا کی ردا بھی' تیری خاطر'

شام کو جب ان دو شہروں کو ملانے والی' لمبی' سیدھی' دہری سڑک پر'
اتنے دیوں کی دوگانہ صفیں اک ساتھ جلی ہیں'
اُن کی نیلی نیلی پیلی پیلی لوؤں کو اپنے جی میں اتار کے'

آنکھیں میچ کے، تجھ کو یاد کیا ہے، تیری خاطر،

..

اے وہ، میرا سر جس کے نادیدہ پنجے میں ہے،
جس کی انگلیاں مری کنپٹیوں میں گڑی ہوئی ہیں، جانے مری ہی کس
کیفیت میں، مجھے پٹخ دینے کو،
اب میں کیسے پلٹ کر تیری جانب دیکھوں، اَب میں کیسے تجھے بتاؤں
اب بھی گرم ہے راکھ...... میرے قدموں کے نیچے،...... میرے
دِل کے بجھے ہوئے سورج کی!

(۱۲-۹-۱۹۷۰)

نئے لوگو!

کچھ ایسی ہی آ گیں میرے آ گے بھی تھیں،
مرے گرد بھی آپس میں جکڑی ہوئی جلتی لپٹوں کے کچھ ایسے ہی جنگلے تھے،
جن سے باہر دُور ادھر وہ پھول نظر آتے تھے جن پر میرے چہرے کی
زردی تھی

میں بھی کہتا تھا،...... اور میں اَب بھی کہتا ہوں......
اک دِن شعلوں کی یہ باڑ بجھے گی،
اک دِن اس پھلواڑی تک ہم بھی پہنچیں گے جس کی بہاریں ہماری روحوں
کے اندر ڈھلتی ہیں

اور میں تو اَب بھی آپس میں الجھی ہوئی لپٹوں کے اس جنگلے میں ہوں
جس میں تم ہو،

فرق اتنا ہے، تم نے ابھی یہ آ گیس ہی دیکھی ہیں
تم نے ابھی ان جلتی جالیوں سے باہر نہیں جھانکا،
ابھی تو ان شعلوں کی نوکیں تمھارے سینے میں پیوست ہوئی ہیں
اور تمھارے ذہن میں تازہ لہو نے غصہ بھری اِک چٹکی لی ہے،

لیکن میں کہتا ہوں، اِک یہ ترنگ ہی تو سب کچھ ہے
جو باقی رہتی ہے...... اور جو تمھارے پاس ہے!

ورنہ تو میں اور تم اور سب آدمی باری باری انہی چتاؤں میں جل جل جائیں گے
جن کی لپٹیں ہمارے گرد اِک جنگلا ہیں......

(۲۱-۹-۱۹۷۰)

دروازے کے پھول

صبح کی دُھوپ ان پھولوں کا دفتر تھی، جس میں
روز اُن کی اِک مسکراہٹ کی حاضری لگتی،
شام کے سائے اُن کی نیندوں کا آنگن تھے!

صبح کو ہم اپنے اپنے کاموں پر جاتے، تو اس سبز سڑک کے موڑ پہ
تازہ دم پھولوں کے رنگ برنگے تختے ہم سے کہتے،
''کرنوں کا یہ دھن سب کا ہے، سب کا، اس میں
جیو، جیو، سب مل کر! سنگت سے ہے رنگت''
پھر جب دِن کی روشنیاں تھکتیں،
تو اس موڑ پہ نیندیں اوڑھ کے سہمے ہوئے وہ پھول یہ ہم سے کہتے:

''سب کا بیری ہے یہ اندھیرا'
جلدا پنے اپنے اینٹوں سے چنے ہوئے سپنوں میں پہنچو
اچھا' کل کو ملیں گے' کل کو کھلیں گے!''
لیکن اَب وہ تختے اجڑ گئے اور اَب اس کوٹھی کے دروازے پر چکنی بجری ہے'
اور تھرکتے چمکیلے پہیے ہیں'

صاحب' تم نے تو اتنا بھی نہ دیکھا'
یہ سب پھول تو خوشیاں تھیں' محنت کش خوشیاں'
اور یہ لاکھوں کا حصہ تھیں'
تم نے تو اتنا بھی نہ سوچا'
اے رے ہم لوگوں کی راحت حق کی خاطر لڑنے والے وکیل جلیل!

(۳۰-۹-۱۹۷۰)

گداگر

چلتے چلتے رک کر، جھک کر، ادھر ادھر بے بس بے بس نظروں سے
دیکھنے والے
کبڑی پیٹھ اور پتھرائی ہوئی آنکھوں والے،
بوڑھے بھک منگے، اس اپنی حیرانی کے فریضے میں تو واقعی تُو کتنا
حیران نظر آتا ہے
جانے کس کے ارادے کی رمزیں اس تیری بے بسی کی قوت ہیں
پتھریلی روحوں کے صنم کدے میں جانے کون یہ کاسہ بدست کھڑا ہے!

تجھ کو دیکھ کے میرا جی اس سے ڈرتا ہے،
تیرے ڈرے ہوئے پیکر میں جس کی بےخوفی جیتی ہے
کس دھیرج سے دھڑکتا ہوگا اس کا قلب کہ تو جس کا قالب ہے،
اتنے سکون میں اُس کے جتنے قصد ہیں، میں اُن سے
ڈرتا ہوں

تیرے وجود کو یہ بے کل پن دے کر، کس بے دردی سے، وہ
دِلوں میں سچی ہمدردی کے درد جگاتا ہے......اور
ہم کو ترساں دیکھ کے شاید خوش ہوتا ہے!

ابھی ابھی تو، یہیں کہیں تو میری غفلت میں تھا،
اب کہتا ہوں، مجھ کو میری آگاہی میں کب یہ بھیک ملے گی،
(۳-۱۰-۱۹۷۰)

اچھے آدمی......!

اتنی اچھی صفتیں بھی تو نے اپنالیں، اچھے آدمی،
اور ان صفتوں کی سب تقدیسیں بھی سچی،
اور ایمان کی اِک وہ زرہ بھی اچھی،
جس کو پہن کر تیرا دِل اتنا مضبوط اور اتنا طاقتور ہے
اس دُنیا اور اس دُنیا کی سیاہ ہوائیں سب اس سے ٹکرا کے پلٹ
جاتی ہیں
اس ٹکراؤ میں تیرا سینہ خم نہیں کھاتا،
اور اس فتح پر شرمائی ہوئی اِک عظمت تیری آنکھوں میں بھر جاتی ہے
اور سانسوں کی کچی لگاموں کے اندر اِک رکا رکا مواج سمندر
تیرے دِل میں اُمڈ آتا ہے

اس سے زیادہ اور تجھے کیا چاہیے، بندے
چاہے تو ہر اس سچائی کو اپنی نظروں سے گرا دے،
جو تیرے پندار میں کم رفعت ہے!

اس سے زیادہ تو اَب حجم نہیں بڑھ سکتا' اس شفاف چٹان کا' جو

اس تیرے سینے میں ہے

اپنی جگہ تو ایک الوہی سی یہ شکم سیری اچھی ہے'......لیکن' اچھے آدمی'

آخر کوئی خلا تو روح کی خالی بھی رکھ' ہم جیسوں کی افتادوں کے حق میں

(۹-۱۰-۱۹۷۰)

حرص

اوروں کی کیا کہیے، خود میرا دِل بھی انگاروں کا مطبخ ہے،
سدا مری آنکھوں میں اِک وہ کشش دہکتی ہے، جو
سب کو اپنی جانب کھینچ کے میرے وار کی زد میں لے آتی ہے،

سب کچھ میری طلب کی تشنگیوں کے دہانے پر ہے،
انگاروں کے اس مطبخ میں گرنے کو ہے

گاڑھا، لجز، لہو، اِک وہ کیلوس جو انگاروں کا استحالہ ہے
اس میرے دِل کی کالی قوت ہے، میں، جس کے بس میں ہوں

یہ قوت مجھ سے کہتی ہے
دیکھ، مرے انگارے میری تڑپ کا انگ ہیں، اَب یہ کچھ تو اُن کی خاطر بھی،

اور انگارے اگلتی سانسوں کے ساتھ اَب میں
اس دُنیا کے اندر، اپنے شکار کی تلاش میں
اک اِک روح کی گھات میں،
اک اِک روح کے سامنے، سوالی بن کے کھڑا ہوں
میرے دِل میں انگاروں کے دندانے پیہم جڑتے اور کھلتے ہیں
باہر کسی کرم کی بناوٹ میں ہونٹ ایک انوکھا ٹھہرا ٹھہرا ٹیڑھا زاویہ سا ہیں،
کون مجھے اَب پہچانے گا،
کس طرح ہنس ہنس کر مجھ سے
ملتی ہے دُنیا، بد بخت!

(۱۰-۱۰-۱۹۷۰)

دُکھ کی جھپٹ میں......

دُکھ کی جھپٹ میں آئے ہوئے دل،
اب کہتے ہو،
اس دِن دُکھ کی جھپٹ میں آئے ہوئے کچھ لوگوں کی فریادوں کو
قرب اس اک موجودگی کا حاصل تھا
جس کے ہونے کو اس دِن تم نے ہی دیکھا اور نہ اُن لوگوں نے!

اے دل، اَب اُن لوگوں کی منزل میں آ کر تم سمجھے ہو،
ورنہ تم کہتے تھے اُن کی کون سنے گا،
اور خود اُن کو بھی یہ خبر نہیں تھی اس دِن کس کے قرب میں تھے وہ!

اب کہتے ہو...... اب، جب
تم یہ دیکھتے ہو کہ تمھاری ان فریادوں سے باہر ہے وہ موجودگی!
اب تو اُن کو تلاش کرو جو اک دِن اُس کے قرب میں تھے، اور
جن کو اُس کے قرب کا علم نہیں تھا!

(۲۳-۱۰-۱۹۷۰)

کب کے مٹی......

کب کے مٹی کی نیندوں میں سو بھی چکے وہ،
میری نیندوں میں اَب جاگنے والے،

ابھی ابھی تو، میری دُنیا، سوئی ہوئی تھی،
اُن کی جاگتی آنکھوں کے پہرے میں،
ابھی ابھی وہ یہیں کہیں تھے، میرے خوابوں کی عمروں میں،
ابھی ابھی اُن کے مُنیا لے ابد کی ایک ذرا سی ڈلی گھلی تھی
ان میری آنکھوں میں،
اور دکھائی دیے تھے، میری خود بیں بینائی میں،
وہ سب ٹھنڈے ٹھنڈے سکھ، جو
اُن کے دِلوں کا اُنس اور پیار تھے، میرے حق میں،
ابھی ابھی تو اس میری بے فہمی کی فہمید میں تھا یہ سب کچھ،

اور اَب میرے جاگنے میں سب کھو گئے وہ میری نیندوں میں جاگنے والے!
(۲۸-۱۰-۱۹۷۰)

جاگا ہوں تو......

جاگا ہوں تو جاگتی آنکھیں کہنے لگی ہیں: ''یہ سب سپنے اپنے ہیں''
جیسے میں ہی تو ہوں اپنے ہر سپنے میں'
میں ہی تو ہوں اپنی جاگرتی میں'
نیندوں کے اندر بھی' نیندوں کے باہر بھی' جو جو سمے گزرتے ہیں وہ میرے
ذہن میں سب ڈھلتے ہیں
دُنیا کا ہر اِک دِن میرے ذہن میں ڈھل کر اِک اور دِن ہے
جیسا آج کا دِن تھا'
رات کو نیندوں میں کچھ اچھے اچھے لوگ ملے تھے' انہی چھتوں کے نیچے
جن کی دیواریں اب' کب کی' گر بھی چکی ہیں
دن کو میرے جاگنے میں کچھ اور ہی میلی میلی روحیں میرے ساتھ رہی ہیں
روحیں' جن کی اونچی چھتوں کے نیچے میرے وجود کی دیواریں ہیں

کیسے کیسے نگر ہیں یہ جو تیرے روز و شب کے پھیرے میں پڑتے ہیں
کیسی کیسی اقلیمیں ہیں میرے دِل کے کوٹھے کے اندر، جو ڈھے بھی چکا ہے

آج تو جب سے جاگا ہوں، اپنی بابت اتنا کچھ سمجھ سکا ہوں،
کالی گلیوں کی دُھوپ اپنے چہرے پر مل کر یہ دُنیا والوں سے ملنے والا
مر بھی چکا اب، اپنی نیندوں میں جینے کی خاطر،

(۱۳-۱۲-۱۹۷۰)

جانے اصلی صورت......

جانے اصلی صورت کیا ہو' ذہن کی اس اِک رو کی'
جس کے ساتھ بہا کی میری سوچ اور میری عمر اور میری دُنیا'
بہتے بہتے یوں تو جب بھی دیکھا' میرا دِل اِک وہ قوت تھی'
جس کے آگے پہاڑ بھی تنکا تھے' یہ سب کچھ تو تھا'
لیکن سدا یہی میں سمجھا'
اک یہ دراڑ جو میرے پیہ دماغ میں ہے کون اس کو پھلانگ سکے گا'
اک یہ دراڑ' کہ جس کے ادھر ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں سارے خیال اور سارے ارادے
جس کے ادھر میری ذلت ہے'
جس کے ادھر میں اِک بے بس قوت ہوں
اک یہ دراڑ کہ جس کے ورے وہ مقدس آگ ہے جس کی لو میں کلیوں کی برکھا ہے
اک یہ دراڑ جو میرے پیہ دِماغ میں ہے کب اس کو پاٹ سکوں گا'
اپنی حدوں کی حد سے آگے کب یہ قدم اٹھے گا'
آگے' جہاں وہ سرشاری ہے جس کی کشید بھی اس میرے ہی ذہن میں
ہوتی ہے!

(۱۵-۱۲-۱۹۷۰)

ان سب لاکھوں کروں……

ان سب لاکھوں کروں، زمینوں، کے اوپر، لمبی سی قوس میں، یہ بلوریں جھرنا،
جس کا ایک کنارا، دور ان چھتناروں کے پیچھے، روشنیوں کی
ہمیشگیوں میں ڈوب رہا ہے!

جس کا دھارا میرے سر پر چھت ہے،
اور میں اس پھیلاؤ کے نیچے،
کبھی نہ گرنے والی، گرتی گرتی، چھت کے نیچے،
ریزہ ریزہ کرنوں کے انبار کے نیچے،
اپنے آپ میں سوچوں،
ایسی شامیں تو جگ جگ ہیں،
آگے تو جانے کیا کچھ ہے
لیکن ان سب ہوتے امروں کے ریلے میں،
کہیں کسی امکان…… ذرا سے اک امکان…… کی اوٹ ایسی بھی تو ہو،
جس میں سمٹ سکے، یہ میلی میلی سی چھت،
اور یہ اترے پلستر والی بوسیدہ دیواریں،
جن کی کھڑکیاں میرے دِل کی طرف کھلتی ہیں،

(۳۱-۱۲-۱۹۷۰)

کندن

اپنے اندر جو کندن ہے اس کا لشکارا تو سدا ہماری آنکھوں میں جیتا ہے
سدا ہمارے ذہن میں اِک چمکیلی راحت کے لالچ کو اکساتا ہے

لوگ، جب اپنے مطلبوں کی خاطر، یوں عجز کی باتیں کر کے، ہم کو عاجز کر دیتے ہیں
تو ایسے میں، ہمارے اندر جو کندن ہے، ہماری آنکھوں میں آ کر
ایک لجاجت بھری ہنسی ہنستا ہے،
اسی ہنسی کے پیچھے تحفظ کا اِک ان دیکھا پنجہ بھی جھپٹتا ہے اور
نظر نہ آنے والا ایک تصرف کا جبڑا بھی غراتا ہے،
یہ سنگین و ملائم، رمزِ مروت کی، سارے مفہوم ادا کر دیتی ہے...... اور
اسی کے پردے میں، گہرے بھیدوں کے اندر، زندگیوں کی حفاظت کرنے والی
خود غرضی جیتی ہے!
اس سچے لشکارے والے کھوٹے کندن کی ضو
سدا ہماری آنکھوں میں جیتی ہے
اور...... اس پر ہم کتنے خوش ہیں،

(۶-۱-۱۹۷۱)

جب اطوار وطیرہ بن جاتے ہیں......

جب اطوار وطیرہ بن جاتے ہیں
اور لوگوں کے عمل میں جب اِک رسم کا رس گدلا جاتا ہے،
تب روحوں کو چیرنے والے تقاضے
ہوتے ہوتے، اپنے اعادے کے اندر ہی خود اپنی تکذیب میں مٹ جاتے ہیں
اور اچھے عملوں کی تعمیلوں میں اچھے عمل دھندلا جاتے ہیں،
اور وہ سارے ظلم جنم لیتے ہیں، جو ہم روز روا رکھتے ہیں!

کون بتائے، کتنے ظلم ہیں
جو ان معمولی معمولی باتوں کے معمول میں یوں ہم سے سرزد ہوتے ہیں،

جیسے، پتلیاں آنکھوں میں بے بس ہو ہو کر اپنے آپ پہ جم جائیں، جب
تھکے تھکے دِل کے پیچھے اپنی پُھکھاوچھی سوچیں، چلتے چلتے
آستینیں اُلٹا دیں،
جیسے، دِل کو سیدھی راہ پہ لانے کا عندیہ
بے دھیانی میں، داڑھ تلے پس جائے،
جیسے، جی کو دُکھانے والی چیزیں سامنے آ آ کر
بے حس نظروں کا روزینہ بن جائیں

(۶-۱-۱۹۷۱)

طغیان

میرے اپنے ظلم اور میرے اپنے کفر کے آگے، مجھ میں یہ جو عاجزیاں ہیں
ان سے ملوث ہے میری ہستی
میں نے چاہا تھا ان عاجزیوں کی جگہ پر اِک سنگین طمانیت کو اپنے سینے میں رکھ
لوں جس میں نئی نئی کڑواہٹ کی خوشیاں ہوں
میں نے کچھ یہ مہم سر کر بھی لی تھی
لیکن چلتے چلتے ذرا سا ایک خیال آیا ہے!
پھر کالی سی اِک برگشتگی میرے ذہن میں چکرائی ہے
اور میری پلکوں کی ڈوریاں ڈھلک گئی ہیں،
میرے مردہ دنوں کی کھوپڑیوں سے ظلم اور کفر کی میٹھی نظروں نے پھر سے
میری جانب جھانکا ہے

بیتے دنوں والا یہ چہرہ......

اس چہرے کو اس چہرے کی آنکھوں کو، میں بھلا بھی چکا تھا،
ان آنکھوں کو اپنے جذب اور اپنی کشش کا علم ہے، اور اُن کے اس علم کے آگے
اب پھر میری خود آگاہی ماند ہے
اس طغیان کے آگے اَب پھر عاجز ہوں
اب پھر، بصد خوشی اس اپنی عاجزی کے آگے بے بس ہوں
مجھ سے پوچھو، ...... اپنی غرقابی کے اس احساس کی سطحیں بھی کتنی دلکش ہیں
(۲۰-۱-۱۹۷۱)

دُنیا، تیرے اندر......

دُنیا، تیرے اندر سچائی کی وہ سب طاقت ہے، جو کروڑوں جینے والے
جاننے والے ذرّوں سے مل کر بنتی ہے

جانے، تیرے اندر کیسی کیسی رمزوں کی طاقت ہے،
اتنی طاقت ہے تیرے پاس اور تو کتنی بے ہمت ہے!

میں جو آزادی کی اِک انگڑائی بھر کر اتنے کالے جنگلوں سے نکلا ہوں
مجھ پر تیری آنکھوں کے انگارے کیوں ہنستے ہیں
میں جو اپنے ساتھ اتنے لمبے عرصے سے جنگ میں ہوں اور میں، جو
اپنے آپ سے صلح پہ اَب بھی کچھ آمادہ نہیں ہوں
تیرے لبوں پر میرے لیے اتنی زہریلی شفقت والے بول یہ کیوں ہیں

تیری اپنے ساتھ جو جنگ تھی تو نے ہار بھی دی اور مجھ کو اس حالت میں
دیکھ کے
اب جو طمانیت تیرے اندر سے چھلک کر تیری آنکھوں اور چہرے پر
بکھر گئی ہے
مجھ کو دیکھ کے، مجھ پر اپنی فوقیت کا یہ احساس کہ جو تیرے دِل
میں اُمڈا ہے
کیا سب اسی لیے تھیں وہ رمزیں جن کی طاقت تیرے بس میں ہے

یہ میری نادانی ہے نا، اپنے آپ سے اَب بھی جنگ میں ہوں اور اب
بھی اپنی گراوٹ سے لڑتا ہوں
دُنیا تیری جامد عظمت مجھ کو دیکھ کے آج اس قہقہے میں کیوں پھڑ پھڑائی ہے
اس سے زیادہ بھلائی تیرے ساتھ میں کیا کر سکتا ہوں
(۲۸-۱-۱۹۷۱)

پچھلے برس......

پچھلے برس جب یہ دِن آئے تھے'......دن' جواس سال اَب بھی آئے ہیں......'
جب یہ بادل' جب یہ کہرا' جب یہ سرد ہوائیں'......جب یہ سب کچھ تھا'
جواَب کے برس ہے'
تب تو میرے ساتھ اِک اپنے آپ کے گم ہو جانے کی آگاہی بھی تھی'
تب تو اس پگڈنڈی پر بادل بھی ڈھول تھے' جس میں میرے پاؤں کھبے ہوئے تھے
تب تو میں اور یہ بستی اور یہ پگڈنڈی'......بادل ہی بادل تھے'
آج اس پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ اِک دِن یاد آتا ہے
اس دِن بادل میرا پہناوا تھے
میں جب میلی سی اِک صبح کی تنہائی میں' ادھر سے پچھلے برس گزرا تھا

آج بھی بادل......گیلی گیلی تہوں میں ڈھیر ڈھوئیں کے'......ادھر ادھر ہر سو ہیں
ڈھیر ڈھوئیں کے' قوسوں سے قوسوں تک' پیڑوں پر' کھیتوں میں' کچی دیواروں پر
صرف اِک میرا دِل ان سے خالی ہے
کیسے کیسے ابد......! جو بیت گئے ہیں!

(۳۰-۱-۱۹۷۱)

تو وہ پیاسی توجہ......

تو...... وہ پیاسی توجہ' سدا رہی تھی کبھی جو میری طرف ہی
کیا دِن تھے' تیرے ہونے میں سپنے تھے میری خوشیوں کے

اور اَب میرے دِل کے متصل ہیں وہ فاصلے' جن کا کنارا اُدھر تیرے دِل کی حد تک ہے
اور یہ فاصلہ بھی تو ہے اس زندگی میں اِک موت کا رابطہ'

اب اس موت میں جینے سے کیا حاصل'
اس لمحے تو ساری دُنیا' میرے دِل کے
اک لا حاصل سے احساس کا حصہ ہے اور
یہ سب کچھ تو شاید......
خود اپنی ہی طرف میری، وہ توجہ ہے' جو اَب کے ہوئی ہے
اب جب سارے فاصلے زندگیوں کا فیصلہ بھی کر چکے ہیں'

(۱۰-۲-۱۹۷۱)

اپنے باہر......

اور وہ بھی اِک کیسی محویت تھی، جس میں سدا صدہا آنکھوں نے اٹھائے
اپنے نازک پردوں پر بوجھ اس موسیقی کے، جو روحوں میں لہرا جاتی ہے!

اور پھر اِک وہ محویت بھی دین تھی کیسی کیسی آسودہ شاموں کی،
ان گلیوں میں کیسے کیسے لوگ تھے، جو یوں اپنے دِلوں کے گمانوں میں جیتے تھے
اک لمحے میں ابد کو دیکھنے کا احساس عجب اِک مستی تھی، وہ
جس کے گمانوں میں جیتے تھے!
اُن کو اس کی خبر نہیں تھی، یہ گہری محویت
موج ابد کی رو سے کٹ کر گرا ہوا وہ ساکت لمحہ ہے، جس کے ٹھہراؤ میں
رک جاتے ہیں
وہ سب ذکر کہ جن کو جاری ہی رہنا ہے،

باہر دیکھو، اس دوار حقیقت کی جوکھم میں جو بھی پڑا، اس کی آنکھوں میں تو بھر بھر گیا بوجھ
اس ذکر کا جو مٹی میں مل کے بھی مٹی نہیں ہوتا!
سنبھلو...... سوچو...... تم کس محویت میں محو ہو لوگو،
اپنے ذہن سے خود کو جھٹک کر، اپنے باہر دیکھو،

(١١-٢-١٩٧١)

میرے سفر میں......

میرے سفر میں، اِک اِک دِن کا سورج، اِک اِک دیس تھا،
ان دیسوں کے اِک اِک باسی کے دِل سے گزرا ہوں،
میں نے دیکھا اُن کے دِلوں کے آنگن سونے کے تھے،
اُن کی مگن آنکھوں میں ڈورے سونے کے تھے،
اک اِک صبح کو اُن کی سواری کے لیے آتی تھی سورج کی رتھ، سونے کی،

لیکن، آج یہ جس پر میری نظر رکی ہے، کون ہے یہ مٹی کا پتلا، ان سڑکوں پر
جس کو دیکھ کے میرے جی میں بھر گئے ہیں وہ آنسو،
آنسو، جن کے سبب سے سونے کے وہ سب زنگار جو میرے عقیدوں پر
تھے اتر گئے ہیں،

اور اَب یہاں کھڑا ہے، میرے سامنے، ننگے پاؤں وہ مٹی کا پتلا کیچڑ میں،
کرنوں کے کیچڑ میں
اک وہ، جس سے اُس کے دیس کے سارے سورج ہم نے چھین لیے ہیں،

اور میری نظروں کے سامنے اپنے کرموں کے کیچڑ میں، لتھڑی ہوئی نظر آتی ہیں
ساری ملتیں جو اَب تک ان دنوں کے دیسوں میں آئی ہیں۔
میرے سینے کے اندر اِک چھوٹا سا کوٹھا گر پڑتا ہے اور
اک چھوٹے سے خیال کی دُنیا ان میری آنکھوں میں اُمڈ آتی ہے،
اور میرا دِل مجھ سے پوچھتا ہے
جانے ہم اپنی روحوں میں کب اس سورج کو
اُبھرا ہوا دیکھیں گے،
وہ سورج، جو اَب تک کبھی نہیں ڈوبا

(۳-۳-۱۹۷۱)

ننھے کی نو بیں آنکھوں......

ننھے کی نو بیں آنکھوں میں تارا'
اپنے اندر' ساری دُنیا کے عکس' اَب بھی' اسی طرح' لے کر آتا ہے'
جیسے کروڑوں برس پہلے کے بچے'
بچے انسانوں کے' بچے جانوروں کے' سب لے کر آتے تھے
اپنی آنکھ کے تل میں'

اب بھی کوئی چڑیا چشمہ نہیں لگاتی'

اب بھی' نو بیں آنکھوں والی کھلنڈری ننھی ننھی نئی نویلی نسلیں'
دیکھتے دیکھتے' دُور' ان بھرے چوراہوں پر سے'

صد ہا پہیوں کے جنباں رخنوں کے اندر، اپنے چلتے پیڈلوں، ڈولتے
ہینڈلوں کے ساتھ
کس تیزی سے گزر جاتی ہیں،
میرا دل، میری عینک کے منفی ہندسوں والے شیشوں کے پیچھے حیران ہے
میں جو بمشکل بہتے ہجوموں کے ساحل پر اپنے اوسانوں کو سنبھالے ہوئے ہوں
کون اس جانب دیکھے گا
جس جانب میں ہوں
جس جانب سب نے جانا ہے!

(۱۶-۳-۱۹۷۱)

کہنے کو تو......

کہنے کو تو ہم سب جانے کیا کچھ ہیں......
جتنے ذریعے خیر کے ہیں، ہم اُن کی جانب کہنے کو تو بڑھتے ہیں
کس کا کلیجہ ہے دُنیا کی دیکھتی آنکھوں کے آگے
اپنے دِل کی بدی کی سمت بڑھے،
لیکن، تم نے دیکھا، جب بھی چکنا چور ضمیروں والے سماجوں میں
کوئی خیر کی منزل سامنے آتی ہے
تم نے دیکھا، کیسی کیسی اپاہج نیکیاں اپنے بجتے جبڑوں کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں
دیکھنے میں تو اتنے سیدھے صراطوں پر چلنے والی......
اور جب اُن کی آنکھوں کے رستے اُن کے دِلوں میں گزر کر دیکھو، تو

اندر......

اندر... گھات لگائے، اُن کے ضمیروں میں مضمر ہیں وہ سب تیز نگاہوں والے

کالے ارادے، جو

موقع پا کر، خیر کی ہر منزل پہ جھپٹتے ہیں
روحوں میں جم جانے والے سیسے کی خاطر......

(۱۴-۵-۱۹۷۱ء)

میں کس جگ مگ میں......

میں کس جگ مگ میں تھا اَب تک......
کہاں تھا اَب تک اِک یہ خیال کہ جس کی روشنی میں آج اپنی بابت سوچا ہے، تو
خود کو اِک ظلمت کی منزل میں پایا ہے......
جو بھی اچھائی ہے، مجھ تک آتے آتے میرا عیب ہے
رستے جہاں پر سب آ کر ملتے ہیں، منزل ظلمت کی ہے میں جس میں ہوں،
میں...... جو اپنی بے سروسامانی میں تیرے ذکر کا اہل نہیں ہوں......

اندیشوں سے بھرا ہوا یہ سر تو کھڑکھڑاتی ہوئی مٹی کا اک ٹھیکرا ہے، جو
تیرے قدموں پر جھک جائے تو بھی
تیری جلالت کا رتبہ نہیں بڑھتا جو پہلے ہی اوجِ مراتب پر ہے
وہ سب رستے تیرے علم میں ہیں، جو

میرے دل کی ظلمت پر آ کر ملتے ہیں'
اور جو تیری صداقت کے سرچشموں سے پھوٹے تھے'
صد ہا سمتوں سے آنے والے ان رستوں کے پیچھے
روشنیوں کے ابد میں'
جن کی اوٹ میں آگے ظلمت کی منزل ہے' میں جس میں ہوں

باقی سب دُنیا اب بھی اس جگ مگ ہے' جس سے ابھی ابھی میں
باہر آیا ہوں

(۲۹-۵-۱۹۷۱)

جب اِک بے حق......

جب اِک بے حق استحقاق کے بل پر'......راحت کی اِک دُنیا'
جینے والی روحوں کے عفریتوں کے حصے میں آ جاتی ہے'
تو اِک مشکل اُبھرتی ہے' عمروں میں ان خوشیوں کا دُور آتا ہے
جن کے تقدس کو زندہ رہنے والی سب اچھی قدروں نے تسلیم کیا ہے

ایسے میں اَب آخر کوئی کتنا بھی سچا ہو' کیوں وہ الجھے اُن لوگوں سے
جن کی اِک اِک سانس محافظ ہے اُن کی جھوٹی راحت کے اس قلعے کی

آخر دُنیا تو یہی کہتی آئی ہے یہ راحت اک وہ حق ہے جو سب دستوروں
کا ثمر ہے
اک وہ حق جس کی خاطر ہر فرد اپنے ہونے کی میٹھی سزا چکھتا ہے

سب کچھ بھول کے اپنی ہستی کی سرمستی میں جیتا ہے
لیکن اپنے حق کے جواز کی بابت کچھ سوچے تو اس کی سوچ میں سیسہ بھر جاتا ہے
اس کی آنکھوں اور چہرے پر اک ٹھنڈی پتھریلی چمک بکھر جاتی ہے

کون اس حق سے الجھ سکتا ہے، کون اسے جھٹلا سکتا ہے
میں نے دیکھی ہے، جو کچھ اس حق سے ٹکرانے والی جحت کی سزا ہے

میں کہتا ہوں، پھر بھی دِل کو چیرنے والا اپنا یہ دُکھ اچھا، اس راحت سے
جس میں اس دُنیا کو سہارا دینے والی غمگیں نیکیاں سب گہنا جاتی ہیں
(۲-۷-۱۹۷۱)

اپنی بابت......

اپنی بابت تو ہم تم یہ جانتے ہیں کہ ہماری منزلت اور ہمارے منصب
مٹی کے رشتے ہیں'

لیکن' میں کہتا ہوں' یہ جو سارے ادارے' یہ جو ساری تنظیمیں اور تملیکیں ہیں'
یہ سب جگہیں کتنی تکریموں والی ہیں
جو بھی قوت کے ان سرچشموں پر قوت حاصل کر لے
اُس کے بس میں ہے ان دنوں میں وہ تقدیریں بھر دے
جن میں لاکھوں انسانوں کے ضمیروں کی خوشیاں مضمر ہیں!

لیکن' اَب ان جگہوں پر جن لوگوں کے پنجے ہیں
کیسے اُن کے ارادوں کے قبضے اُن کی سانسوں پر کسے ہوئے ہیں
اور کتنے آسودہ ہیں وہ اپنے عزم ستم پر......'

بندے' جانے وہ دِن کب آئے گا
جب یہ لوگ بھی جانیں گے کہ کبھی یہ اُن کے منصب مٹی کے رشتے ہیں
وہ دِن جس کے تقدس کے آگے ہم نے تو ہمیشہ اپنے آپ کو بے قوت پایا ہے
(۱۰-۷-۱۹۷۱)

آنکھیں ہیں جو......

آنکھیں ہیں، جو مجھ پہ گڑی ہیں،
چہرے ہیں، جو میری جانب جھکے ہوئے ہیں

آنکھیں، جن کو دیکھ کے میرے دِل کے تختے دھڑکنے لگ جاتے ہیں،
چہرے، جن کے آگے میری روح کے بادباں ڈول جاتے ہیں
آنکھیں، گردابوں کی،
چہرے، طوفانوں کے،

اور یہ موجیں
یہ دشمن آنکھوں والے عفریتوں اور اُن کے چکراتے وجودوں کے پیچاک، اُبھرتے
بڑھتے، میری سمت امڈتے
سب کچھ، ایک ذراسی، جنبش، ان سرشار ہواؤں کی، جو
ازل سے ابد تک بہتی ہیں اور جن کی لگامیں
ایسے ہاتھوں میں ہیں، جن کی ہتھیلیوں پر یہ سارے سفینے ہیں روحوں کے،
بجتے تختے...... ڈولتے بادبان...... اور ڈراس کا، جس کا سہارا ہے!

(٢٧-٧-١٩٧١)

اب تو دِن تھے

اب تو دِن تھے'
یہی تو دِن تھے'
دن جو اِک اِک شخص کے حق میں جدا جدا تقدیر ہیں
جانے میرے دنوں کا فیصلہ کیا ہو میرے حق میں'
لیکن پھر بھی یہی تو وہ دِن ہیں' جن کی پتھریلی تھاہ میں مل جاتی ہے
غواصوں کو'
دولت'
دولت بھی' ایسے حرفوں کی'...... جن کے سانچوں میں اسموں کے ابد ڈھلتے ہیں!

اب تو دِن تھے'
پھر تو......
پھر تو یہ ذلت تک بھی باقی نہ رہے گی جس میں میری آسائش مجھ کو زندہ رکھتی ہے'
اب تو دِن تھے' میرے دِل میں بسنے والی بڑی پرانی بے دلی!
تو اِک بار تو میرے قلم کو اپنے بھید عطا کر دیتی'
پھر تو ریت کی چادر اُبھرے گی اور ڈھانپ دے گی ان زخموں کو' جو
تیری مردہ مسکراہٹ نے مجھے بخشے ہیں

(٢٢-٨-١٩٧١)

سب کچھ جھکی جھکی ......

سب کچھ جھکی جھکی ان جھونپڑیوں والے میرے دِل کے گاؤں میں ہے'
جو میری ان پلکوں کی چھاؤں میں ہے
جب یہ پلکیں میرے دِل کی جانب جھکتی ہیں

باہر: لاکھوں زندگیوں کے قبیلے'
بازو جھٹک جھٹک کر کوسنے والی نفرتیں'
کالے جنگل' جن کی جڑیں سب میرے سینے میں ہیں

باہر مینہ برسا ہے'
باہر چھتناروں کے دُھلے دُھلے پہناوے' گیلی گیلی دھرتی اور چمکیلی سڑکیں
اور اندر میرے کمرے میں دیواریں مجھ سے کہتی ہیں:
''......آج ہمارے پاس بھی بیٹھو......
ہم نے ہی تو دیا تمھیں یہ دل' یہ گاؤں' کہ جو اس لمحے تمھاری ان پلکوں کی
چھاؤں میں ہے''

(٢٢-٨-١٩٧١)

اُن کے دِلوں کے اندر......

ان کے دِلوں کے اندر تو نہیں، لیکن اُن کے مکانوں کے اندر تو دیکھو،
کتنی ویرانی...... جس سے اُن کے دِل بے وقعت ہیں......
کتنی ویرانی...... جس سے اُن کے چمکیلے آنگنوں کی رونق ہے......
چھوٹے بڑے لوگ، ان شہروں کے، اپنے چھوٹے بڑے مکانوں میں سب اِک جیسے ہیں
دیواروں سے پھسل کر آنگنوں کی ڈھلوان تکونوں تک جو دُھوپ اُتری ہے،
سب زردی ہے چہروں کی ان شہر والوں کے،
اپنے آپ سے اِکتائی ہوئی سب عاجز خوشیاں ہیں جو چہروں اور آنگنوں پر پھیلی ہیں

باہر...... کھوکھلے قہقہے، جن میں ٹین کی روحیں بجتی ہیں......
اندر...... کچھ کاٹھ کی راحتیں، دیمک کے جبڑوں میں......

(۲۴-۱۰-۱۹۷۱)

بندے جب تو......

بندے جب تو اپنی سوچ میں کوشاں ہوتا ہے اس زندگی کے لیے
جس کی خاطر تیری روح ڈکارتی ہے تیرے دل کی دھڑکن میں
ٹھنڈے میٹھے پانی'
سانس میں روغنی باس — اور
اینٹوں کی عشرت میں نئی قمیصوں کی طناز کریزیں
اور اس اپنی سوچ میں کوشاں رہنے پر جب تیری آنکھیں
نئے نئے چمکیلے دکھوں سے بھر جاتی ہیں
تجھے خبر ہے' تب تو کتنا قریب آ جاتا ہے' اس دن کے
جس کی روشنیوں پر تیرے دل کے اندھیروں کا سایا ہے
اور — اس دن کے آگے کیا ہے؟ تجھ کو بتاؤں'
تو دیکھے تو آگے تجھ کو زمانے کا وہ ان دیکھا دور دکھائی دے گا
میں نے اپنی عمر میں جس کو مرتے ہوئے دیکھا تھا!

کیا تو انہی دنوں کی زنجیروں کو پھر سے پہن لینے پر آمادہ ہے؟
کیسے کیسے خیال مرے دِل میں آتے ہیں'
لرزا دینے والے دھیان ان دنوں کے' جب لاکھوں لوگوں نے اندھیری
رات کا کالا آٹا
اپنے آنسوؤں میں گوندھا تھا'
کالے آٹے ...... کالے پانی ......
نہیں، نہیں، ...... میرا یہ بدن تو میرا بدن ہے جو اس مٹی ہی کے لیے تھا
لیکن ...... میرا دِل ...... میرا دِل تو تیرے سینے کے لیے ہے

(۳۰-۱۰-۱۹۷۱)

مصطفیٰ زیدی

اے وہ جس نے اپنی صدا میں اپنی بقا کو ڈھونڈھا'
اے وہ جس کی صدا کو بہا لے گئیں کڑکتی کالی آندھیاں خونی ویرانوں کی

مجھ بے دست و پا کا دِل دُکھتا ہے' جانے اِک وہ کیسی گھڑی تھی!

ان دن' ساتوں آسمانوں کی گرتی چھتوں کے نیچے'
تو نے جب اپنے جی میں' اپنے آخری سانس کی ٹھنڈی چاپ سنی تھی'
جانے تو نے ذرا سے اس وقفے میں کیا کیا سوچا ہوگا!

اب میں کیسے تجھے بتاؤں
اب بھی ہست کا صحرا اُسی طرح خود موج ہے
اب بھی تیرے دِل کا منور ذرّہ تیری مٹی سے باغی ہے!

کون اَب تجھ سے پوچھے
تو نے اپنے غموں کے غم میں خیالوں کے جو ابد ڈھونڈے تھے
کیا وہ سب اس مٹی سے باہر تھے؟
جس مٹی کو تیرے ذہن نے اپنے وجود سے جھٹک دیا تھا!

کس کے پاس جواب ہے اس کا
کون بتائے، کس دُنیا کے کن ظلموں نے لوٹ لیں......
سدا چمکنے والی تیری وہ مشفق آنکھیں اور تیرا اُنس بھرا وہ چہرا
اور وہ ذہن کہ جس کے طوفانوں میں تو نے عمر بسر کی، موت کے ساحل تک!

صدیوں تک بھیگی پلکوں سے دُنیا چنے گی
موت کے ساحل پر بکھرے ہوئے روشن ذرّے تیری صداؤں کے!

(۲۱-۱۱-۱۹۷۱)

غزل

جنگ بھی، تیرا دھیان بھی، ہم بھی
سائرن بھی، اذان بھی، ہم بھی

سب تری ہی اماں میں شب بیدار
مورچے بھی، مکان بھی، ہم بھی

تیری منشاؤں کے محاذ پہ ہیں
چھاؤنی کے جوان بھی، ہم بھی

دیکھنے والے یہ نظارا بھی دیکھ
عزم بھی، امتحان بھی، ہم بھی

اک عجب اعتماد سینوں میں
فتح کا یہ نشان بھی، ہم بھی

تو بھی اور تیری نصرتوں کے ساتھ
شہر میں ٹکا خان بھی، ہم بھی

(۱۲-۱۲-۱۹۷۱)

اے قوم

پھولوں میں سانس لے، کہ برستے بموں میں جی
اب اپنی زندگی کے مقدس غموں میں جی
وہ مائیں، جن کے لال لہو میں نہا گئے
صدیوں اَب انکے آنسوؤں اکھڑے دموں میں جی
جب تک نہ تیری فتح کی فجریں طلوع ہوں
بارود سے اٹی ہوئی ان شبنموں میں جی
ان آبناؤں سے اُبھر، ان ساحلوں پہ لڑ
ان جنگلوں میں جاگ اور ان دمدموں میں جی
پیڑوں سے مورچے میں جو تجھ کو سنائی دیں
آزاد ہم صفیروں کے ان زمزموں میں جی
بندوق کو بیانِ غمِ دل کا اذن دے
اک آگ بن کے پوربوں اور پچھموں میں جی

(۱۸-۱۲-۱۹۷۱)

ہم تو سدا......

''ہم تو سدا تمھاری پلکوں کے نزدیک رہے ہیں''......آنسو ہم سے کہتے ہیں'......
''تمھی تو تھے جن کی آنکھوں پہ تمھارے بھرے بھرے پھیپھڑوں کے
ٹھنڈے ٹھنڈے دخان تھے

اور تم ہم سے ہو گئے تھے کچھ اتنے بے نسبت
اتنے بے نسبت کہ تم اپنے لہو کو پانی نہیں سمجھتے تھے......''

آنسو سچ کہتے ہیں ہم اَب سمجھے ہیں
اب ہم روئے ہیں تو آنسو ہم پر ہنستے ہیں
بہہ گئے نا ہم سب کے لہو پانی کی طرح اس اپنے دیس میں'
اس اپنے گھر میں......'
آج ہم اپنے جیالے بیٹوں کو روتے ہیں' تو
آنسو ہم پر ہنستے ہیں
اس مٹی کے وہ بیٹے ہم نے قیمت ہی نہ جانی جن کے چہروں کی
اور ہم اپنے بھرے بھرے پھیپھڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے دخانوں
کے پیچھے
یہی سمجھتے رہے کہ ہمارا لہو تو گاڑھا ہے
لیکن ہم بھی اور ہماری عظمت بھی اَب سب کچھ پانی پانی ہے'
اب ہم روئے ہیں تو آنسو ہماری آنکھوں میں ہم پر ہنستے ہیں

(۲۰-۱۲-۱۹۷۱)

۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء

رات آئی ہے، اَب تو تمھارے چمکتے چہروں سے بھی ڈر لگتا ہے
اے میرے آنگن میں کھلنے والے سفید گلاب کے پھولو،
شام سے تم بھی میرے کمرے کے گلدان میں آ جاؤ...... ورنہ راتوں کو
آسمانوں پر اڑنے والے بارودی عفریت، اُس چاندنی میں، جب
چمک تمھارے چہروں کی دیکھیں گے
تو میرے ہونے پر جل جل جائیں گے اور جھپٹ جھپٹ کر
موت کے تپتے دھمکتے گڑھوں سے بھر بھر دیں گے اس آنگن کو

اب تو تمہارا ہونا اِک خدشہ ہے،
اب تو تمہارا ہونا...... سب کی موت ہے
شاخ سے ٹوٹ کے میرے خود آگاہ خیالوں کے گلدان میں اَب آ جاؤ
......اور یوں مت سہمو...... کل پھر یہ ٹہنیاں پھوٹیں گی...... کل پھر سے پھوٹیں گی
سب ٹہنیاں
آتی صبحوں مین پھر ہم سب مل کے کھلیں گے، اس پھلواڑی میں......

(۲۱-۱۲-۱۹۷۱)

ریڈیو پر اِک قیدی......

ریڈیو پر اک قیدی مجھ سے کہتا ہے:
''میں سلامت ہوں'
سنتے ہو...... میں زندہ ہوں!''

بھائی...... تو یہ کس سے مخاطب ہے......
ہم کب زندہ ہیں
اپنی اس چمکیلی زندگی کے لیے تیری مقدس زندگی کا یوں سودا کر کے
کب کے مر بھی چکے ہم'
ہم اس قبرستان میں ہیں......
......ہم اَب اپنی قبروں سے باہر بھی نہیں جھانکتے
ہم کیا جانیں' کس طرح ان پر باہر تیری دُکھی پکاروں کے یہ ماتمی دیے روشن ہیں
جن کے اجالوں میں اَب دُنیا ان لوحوں پہ ہمارے ناموں کو پہچان رہی ہے
(۲۵-۱۲-۱۹۷۱)

سب کچھ ریت......

سب کچھ ریت...... سرکتی ریت......
ریت کہ جس کی ابھی ابھی قائم اور ابھی ابھی مسمار تہیں...... تقدیروں کے پلٹاوے ہیں
جل تھل...... اتھل پتھل سب...... جیسے ریت کی سطحوں پر کچھ مٹتی سلوٹیں
کیسی ہے یہ بھوری اور بھسمنت اور بھربھری ریت
جس کے ذرا ذرا سے ہر ذرّے میں پہاڑوں کا دِل ہے
ابھی ابھی ان ذرّوں میں اِک دھڑکن تڑپی تھی
ابھی ابھی اِک سلطنت ڈوبی ہے
ابھی ابھی ریتوں کی سلوٹوں کا اِک کنگرہ ٹوٹا ہے
سب کچھ ریت...... سرکتی ریت......!

(۳۱-۱۲-۱۹۷۱)

چیونٹیوں کے ان قافلوں......

چیونٹیوں کے ان قافلوں کے اندر، میں وہ منادی ہوں
جس کی آنکھوں میں جب آتی آندھیوں اور طوفانوں کی اِک خبر اُبھرتی ہے،
تو ان آندھیوں اور طوفانوں کی آواز کو قافلے سن نہیں سکتے،
لیکن میرے دِل کا خوف، جو میرے علم کی عادت ہے
ان قافلوں کے حق میں اِک ڈھال ہے
تقدیروں کی یہ خبریں اور اُن کے سب دُکھ میرے لیے ہیں،
لیکن کس نے میری خبروں کو میری آواز کے پیکر میں دیکھا ہے
کس نے سنی ہے جاننے والی یہ آواز جو سب کے سروں پر ڈھال ہے
سدا جئیں ان صحنوں میں یہ دھیرے دھیرے رینگنے والی ننھی ننھی جیتی لکیریں
جن کے ذرا ذرا سے الجھاوے ہی اُن کے کڑے مسائل ہیں
ان دُکھوں سے بھی بڑھ کر
جو آسمانوں کے علموں نے مجھ کو سونپے ہیں

(۳-۱-۱۹۷۲)

۸ جنوری ۱۹۷۲ء

ان سالوں میں،
سیہ قتالوں میں
چلی ہیں جتنی تلواریں بنگالوں میں
اُن کے زخم اتنے گہرے ہیں روحوں کے پاتالوں میں
صدیوں تک روئیں گی قسمتیں...... جکڑی ہوئی جنجالوں میں
ظالم آنکھوں والے خداؤں کی ان چالوں میں
دُکھوں، وبالوں میں،
قحطوں، کالوں میں،
کالی تہذیبوں کی رات آئی ہے اجالوں میں،

اور اَب ان زخموں کے اندمالوں میں، اپنے اپنے خیالوں میں
چلنے لگی ہیں، کروڑوں جبڑوں تھوتھنیوں میں زبانیں
جیبھیں جتی ہوئی بے مصرف قیلوں قالوں میں
کوئی تو میری بے زبانی کے معنی ڈھونڈے ان حالوں کے حوالوں میں......

(۸-۱-۱۹۷۲)

جنگی قیدی کے نام

وہاں جہاں مشکلوں سے آزاد گلشنوں کی ہوائیں پہنچیں
وہیں کہیں دُور ادھر تمھاری دُکھوں بھری کال کوٹھری تک
ہمارے ٹوٹے ہوئے دِلوں کی صدائیں پہنچیں
دعائیں پہنچیں
وفائیں پہنچیں

(۱۹۷۲ء)

میلی میلی نگاہوں......

میلی میلی نگاہوں کی اس بھیڑ کے اندر اور بھی گھس کر دیکھو
قاتل جبڑوں کے جڑتے دندانوں میں شاید اِک رخنہ امن کا بھی ہو،

اپنے بچاؤ میں اس سے زیادہ کیسے بچے رہو گے،
پہلے ہی سے اس دیوار تک ہٹے ہوئے ہو، جس کے آگے...... آگ ہے......،
ان شعلوں کے چلتے آروں کے اندر ہی کوئی رخنہ امن کا ڈھونڈھو،

یہ مامن تو...... تمھارے دِلوں کے کسی گوشے میں جدا نہیں ہے،
یہ مامن تو...... تمھاری دُنیاؤں کے کسی گوشے میں جدا نہیں ہے،

اندر بھی، باہر بھی، ایک ہی لشکر ہے، جس کی دو ٹکڑیاں
جنگ میں ہیں آپس میں تمھارے دِلوں کی سرحد پر، جس کے اندر کی جانب
اتنی دُور تک،
تم کو پیچھے ہٹنا پڑا ہے......

اس جمگھٹ میں، اَب اِک بار تو ہلہ بول کے اپنے دِلوں کے اندر کا اِک وہ
گوشہ امن کا، اپنے واسطے، ڈھونڈھو
جس پر زندگی کے لشکر کی دو باہم متحارب ٹکڑیوں کا مشترکہ قبضہ رہا ہے،
اب تک......

(۱۰-۱-۱۹۷۲)

باہر اِک دریا......

باہر اک دریا، پیلی آنکھوں کا، لہراتا ہے
آنکھیں، جن میں پتوں کا پانی رس رس آتا ہے،
ہم کو دیکھ کے!

اب ایسے میں، کس کس بوجھ کو سر سے جھٹکیں،
دل میں نیکیاں دہل دہل جائیں اور اپنے گن ڈھارس نہ بنیں!

ہر جانب سے ذہنوں میں اُمڈی ہوئی کالی حرصیں
اپنے برچھے تان کے دھیرے دھیرے گھات میں
ہم کو دیکھ کے!
اب ایسے میں کون بتائے کن جتنوں سے ہم نے اپنی دبلی پسلیوں کے نیچے ان
اپنے دِلوں میں سنبھال کے رکھی ہیں، یہ اتنی اذیت دینے والی سب تسکینیں
جن کے باعث،
ہم پتوں کے پانیوں سے بھری ہوئی ان صد ہا آنکھوں کے سامنے ڈرتے بھی ہیں
اور اس ڈر میں جینے کا دُکھ خوشی سے سہتے بھی ہیں
(۱۳-۱-۱۹۷۲)

لمبی دُھوپ کے......

لمبی دُھوپ کے ڈھلنے پر اب، مدتوں کے بعد ایک یہ دِن آیا ہے
دن جو ایسے دنوں کی یاد دلاتا ہے جو سدا ہمارے ساتھ ہیں

اس کہرے میں، اس جاڑے میں
اُمڈے ہوئے ان ریزہ ریزہ بادلوں میں وہ سب نزدیکیاں ہیں، جو
میرے وجود کا طلسم رہی ہیں
ورنہ کتنے دُور ہیں دُکھ جو صدیوں کا حصہ ہیں
کتنی دُور ہے موت جو ان سب بستیوں پر چھائی ہے، ان سب ہستیوں کا
حصہ ہے!
اس لمحے تو دُکھ اور موت کی ان نزدیکیوں میں بھی زیادہ قریب ہے
وہ غافل کر دینے والی بے حس زندگی،
اور وہ زندہ رکھنے والی جابر غفلت،
جو اس میرے وجود کا طلسم ہے!

اس ٹھنڈک میں یہ اک دھیمی دھیمی سی مانوس تمازت'
ساری بھولیں سارے خیال اس کی کونپلیں'

میرے گھر میں آم کے پیڑ کے نیچے تو خندق ہے' اب کے کھاد اس کو کیسے
ڈالیں گے

کب آئیں گے آنے والے دن اور بور اور کونپلیں!
کبھی نہ آنے والی رتوں کے دھیان کہ جن پر آج تو نظریں جم جاتی ہیں'
اور میں سوچتا بھی نہیں کیا کوئی کل بھی آئے گا'
ساری ندامتیں بھول گیا ہوں!

اور وہ سب نزدیکیاں' جن کو میں نے اب تک اتنی دوری سے دیکھا ہے
آج تو وہ سب میرے سامنے ہیں' اس جاڑے میں مدت کے بعد آنے
والے اس کہرے میں!

(۲۳-۱-۱۹۷۲)

اندر روحوں میں......

اندر، روحوں میں جو اِک روشن روشن قوت ہے، وہ تو ہماری ہے اور بے تسخیر ہے،
یوں ہی سمجھ لیں،
پھر بھی لاکھ بچائیں اپنے دِلوں کو، دھبہ تو پڑ ہی جاتا ہے
یہ نورانی قوت تو مٹی کے رابطوں سے ہے
چھتیس رکوعوں کی، ڈھالیں سجدوں کی، اور دعاؤں کے سب قلعے،
کوئی تمھارے حلق پہ جب مٹی کا انگوٹھا رکھ کر کچھ کہتا ہے
تو سب قلعے گر پڑتے ہیں،
چڑیا اپنی پیاس بجھانے سمندر کے ساحل پر آتی ہے تو اپنی ننھی چونچ میں
کتنا پانی پی لیتی ہے!
نیکی بھی تو سمندر ہے جو سب روحوں میں روشن اور مواج ہے،
ہم کتنا پانی پی لیں گے اس سے
لاکھ بچائیں، دھبہ تو پڑ ہی جاتا ہے دِل پر،
ان پہ سلام کہ جن کے قدموں کی مٹی سے دونوں جہانوں
کی تقدیسیں ہیں

(۲۵-۱-۱۹۷۲)

اس دُنیا نے اَب تک......

اس دُنیا نے اَب تک ہم کو ہمارے جس بھی دکھاوے سے پہچانا
ہم نے اس کی پرستش کی ہے،
اور اَب اس کی حفاظت کرتے کرتے اس کی حقیقت کو بھی کھو بیٹھے ہیں
سچ تو تھا ہی نہیں کچھ پہلے سے، اور جھوٹ کی جو اِک صورت تھی وہ بھی
نہ رہی اب!

اب تو دُنیا سے چھپ چھپ کر ان دیسوں میں ہم پھرتے ہیں
جن میں کوئی ہمیں پہچاننے والا نہیں ہے!

اب تو نہ اپنے سامنے آسکتے ہیں...... اپنا دکھاوا ہی ہم پر ہنستا ہے
اور نہ غیروں ہی کے آگے اپنے اصلی روپ کو لا سکتے ہیں،
...... خیر سے بغیر اس اپنے دکھاوے کے ہم ہیں ہی کیا......!

اب انجانے دیسوں میں پھرتے پھرتے اپنے دُکھ یاد آئے ہیں
اب ان دُکھوں میں جینا، اَب اس نامحرم اور مونس دُھوپ میں پھرنا،
اپنے خلاف عمل کرنا ہے،...... اپنے دکھاوے کو جھٹلانا ہے

اپنے لیکھ پہ اَب پچھتانا ہی اچھا جس میں سب سچی پہچانیں ہیں
اک یہ روپ ہی جس کی ذلت کی عزتیں اِک جیسی ہیں ہماری نظروں میں بھی اور
غیروں کی نظروں میں بھی!

(٦-٢-١٩٧٢)

دُکھیاری ماؤں نے......

دُکھیاری ماؤں نے اپنے دبلے آنسوؤں میں پالا اپنے جن بیٹوں کو
ان بیٹوں کی عفتوں پر سورج بھی پلکیں بچھا دیتے ہیں

جب بھی لہو میں مقدس مٹی کی یہ طینت گھلتی ہے، تو کیسی کیسی
سلسبیلیں ہیں جو ان نینوں میں اُمڈ آتی ہیں

لیکن کون ان سادہ سادہ دُنیاؤں کی سنے گا،
جو اِن پلکوں کے سایوں میں حدِ اُفق تک بالیدہ ہیں

لیکن اُن کی کون سنے گا،

آگے تو ہر جا ایسی آنکھیں ہیں جن کے پردوں کے پیچھے
ایسے ایسے خدا اَب گھورتے ہیں، سب مجھ جیسے خدا اور سب تجھ جیسے **خدا**،

جو کالی لمبی جریبوں سے اپنے جثوں اور اپنی کبریائی کو ناپ کر،
آنے والی تقدیروں کا زائچہ کھینچنے کے عادی ہیں!

ہم، جن کی آنکھوں پہ ہمارے ضمیروں کے خمیازوں کا پردہ ہے
کب ان سلسبیلوں کو دیکھیں گے کب دیکھیں گے ان سلسبیلوں کو
جن پر آسمانوں کے دِل بھی پسیجے ہوئے ہیں

(۱۵-۲-۱۹۷۲)

کبھی کبھی تو......

کبھی کبھی تو خود اندوزی کی کیفیت میں، جب
میرا کاسہ سر، ٹھوڑی تک، اس میرے سینے میں دھنس جاتا ہے،
اور جب میری گردن ہل بھی نہیں سکتی، اور ایسے میں، جب
اس دُنیا کی بابت میرا جھوٹا سچا علم مری آنکھوں سے اس دُنیا کی جانب
جھانکتا ہے، تو
مجھ میں اِک فوقیت کا احساس اُبھرتا ہے اور میں کس نفرت سے ان سب
لوگوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہوں، جو
میرے جھوٹے سچے علم اور میری جھوٹی سچی فوقیت کا ماخذ ہیں

اوروں کے بھیدوں، اور ان بھیدوں کے عیبوں سے آگاہی، کیسی فوقیت
ہے جس میں

میرا دِل اِک کبریائی سے بھر جاتا ہے
اور میں اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہوں
اس اِک آ گاہی میں کیسی کیسی غفلتیں اور بےعلمیاں ہیں یہ کس کو خبر ہے'
لیکن وہ جو اِک کیفیت ہے' جب کاسہ سر اس طرح سے' ٹھوڑی تک' سینے
کے خول میں دھنس جاتا ہے'
اور جب گردن ہل بھی نہیں سکتی اور آنکھیں ٹکٹکی باندھ کے
اپنے شکار کی جانب گھورتی ہیں' اِک وہ کیفیت تو بندے کے خدا ہونے کی گھڑی ہوتی ہے
ساری گراوٹیں اس جھوٹی فوقیت سے اُگتی ہیں'
پھر بھی دُنیا تو صرف اُن لوگوں سے ڈرتی ہے نا' جن کی گراوٹیں دوسروں
کے عیبوں کو جانتی ہیں
کون مجھے پہچانے گا کہنے کو تو سب کے دِلوں کے دروں خانے میں میرا
صدق گزر رکھتا ہے
(۲۷-۲-۱۹۷۲)

ڈھلتے اندھیروں میں......

ڈھلتے اندھیروں میں، کچی مٹی پر، کولتار کی سڑکوں پر، ہر جانب،
وہی پرانی - کھدی ہوئی سی - لکیریں پہیوں کی اور وہی پرانی گرد - عناد -
اور جمگھٹ
وہی پرانی روندی ہوئی سی صبحیں......
لیکن کہاں سے آئی ہیں یہ دِل کے مساموں میں بھر جانے والی مہکاریں
اَن دیکھے پھولوں کی
کانوں کے پردے بجتے نظر آتے ہیں...... تھمے ہوئے سب شور اور دل
کے پردے بجتے نظر آتے ہیں
از لیں بھی ایسی ہی خوشبوؤں میں جاگی ہوں گی!

شام کی سڑکیں، وہی پرانے چہرے
سارے دِن کی تھکی ہوئی یہ عبودیت

اور بے مہر نگاہوں کے آوازے ہر سُو

سب لوگ اپنے دِلوں کی دھرتی پر بے مامن، سب ان راہوں پر بے منزل،

یونہی، جانے، کب سے......

اور بستی کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اَب کتنے سکون سے نہر میں پانی

دھیرے دھیرے چمکتا چمکتا رواں ہے...... اب، جب رات کا سارا کالا بوجھ

ان گھنے گھنے پیڑوں پر آن جھکا ہے!

دیواروں کے گھیرے میں اَب یہ کیسی نیندیں سلگ اٹھی ہیں جنکے عبیری دُھوئیں میں موت

اور زیست کی سرحدیں مل جاتی ہیں

ایک زمانہ ختم ہوا ہے...... اِک دِن گزرا ہے!

(۱۳-۳-۱۹۷۲)

سدا زمانوں کے اندر......

سدا زمانوں کے اندر......
ذہنوں میں بھی' اور زبانوں پر بھی' تیرے ہیں بے جسم وجودوں والے جو جو نام
اُن کے ابد کیسے ہیں' اور کیا ہیں'
سب کچھ بس اتنا کہ ہم اَب بھی' ان ناموں کو دہرا کر اپنے جی کو گدلا کر لیتے ہیں
ورنہ یوں تو جانے کب سے طاق جہاں پہ ابد کے مرتبانوں میں اُن کے مرتبے
پڑے پڑے سب گلتے ہیں
کبھی کبھی ان مرتبانوں سے ذرا ذرا سا دُکھ چکھ کر ہم اپنی روح کا ذائقہ بدل لیتے ہیں
اور اپنے جی کو گدلا کر لیتے ہیں'
لیکن اس سے ان جسموں کو اَب کیا لابھ ہے جو خود تو اَب مٹی ہیں اور جن کے نام
ہمارے ذہنوں میں بھی اور زبانوں پر بھی جاری ہیں
ان سے تو اچھا ہے گتھم گتھا بازاروں میں اس بھرپور طمانیت سے شاپنگ کرنے والا یہ اک شخص
کوئی ابد بھی جس کی قیمتی مٹی کا زنگار نہیں ہے!
ایسے میں اَب کون اُن کو پہچانے' کون اَب اُن کے ابد کی حقیقت کو جانے
اک اِک کر کے کاٹ کاٹ گئے ظلموں کے ٹوکے جن کی عمروں کو' اِک اِک کر کے
اِک اِک کر کے

(۱۶-۳-۱۹۷۲)

اور وہ لوگ......

اور وہ لوگ اپنے ناموں کے حرفوں میں اَب بھی زندہ ہیں جب وہ نام ہماری زبانوں پر آتے ہیں
ہم...... جو اپنی بقا میں موت کا سلسلہ ہیں

ہم سے اچھے ہیں وہ لوگ،
پھول ہمارے باغوں میں جن کی قبروں کے لیے کھلتے ہیں

ہم جو گردش کرنے والے کرّوں کے پاتالوں کی مٹی میں بے تذکرہ ذرّے ہیں،
ہم ہی تو ہیں وہ جیتی مرتی روحیں، جن کے ہونے اور نہ ہونے کا یہ دائرہ ان ناموں کی
بقا کا دائرہ ہے
جن ناموں کے ذکر کی خاطر ہم بے تذکرہ ہیں!

سب کچھ دیکھ کے،
سب کچھ جانچ کے،
اب بھی لمبی بے انت آنتیں یوں دِن رات اس موجِ غرور کو کشید کرنے میں لگی ہیں
جن سے ہماری آنکھیں بھری ہوئی ہیں، اور
اب بھی ہم ان ناموں سے بے نسبت ہیں جن کی بقا کی خاطر ہم بے تذکرہ ہیں
(۲۳-۳-۱۹۷۲)

پختہ وصفوں کے بل پر......

پختہ وصفوں کے بل پر' بے حد قربانیوں کے بعد' اِک ایسی منزل آتی ہے'
جہاں پہنچ کر اس مقصد کی طمانیت ملتی ہے'
جس کی بلندی ایک گراوٹ کی جانب بڑھتی ہے

اور اس لمبے سفر میں اِک یہ گراوٹ بھی کیسی منزل ہے!
جہاں پہنچ کر انساں اپنے وصفوں سے واصف نہیں رہتا'
لیکن دُنیا والے اُس کے پہلے وصفوں ہی کی بنا پر اس کی گراوٹ سے بے دِل نہیں ہوتے

اک یہ کیسی منزل ہے' جس تک جب کوئی پہنچتا ہے تو اُس کے سوجے ہوئے پپوٹوں کے
نیچے اس کی آنکھوں میں پتلیاں کم حرکت کرتی ہیں
اس کی نظریں اپنی کامیابی پر رکی جمی رہتی ہیں'
اور وہ بے نسبت ہو جاتا ہے' اس دُنیا سے بھی جس کو اُس کے سفر کی کہانی یاد ہے!
کیسا یہ گھن ہے جو سینہ تان کے چلنے والی تقدیسوں کے پنجر میں سب جوہر چاٹ جاتا ہے
اور ہر جانب اونچے مقصدوں کے سنگین لبادے اوڑھ کے کھوکھلی روحیں
اکڑ اکڑ کے چلتی نظر آتی ہیں
کون انھیں پہچانے' سونے کی تہہ پانی میں ہے اور مٹی کا چہرہ باہر ان سطحوں پر

(۲۶-۳-۱۹۷۲)

ساتوں آسمانوں......

ساتوں آسمانوں کے عکس اور کنکر آ آ کر گرتے ہیں خیالوں کے خانوں میں
یہ سب کچھ ان الگ الگ خانوں میں، اک وہ یکجا مخفی قوت ہے، جو
مجھ پر ظاہر تو نہیں لیکن جو یوں ہونے میں میری ہونی کے ساتھ ہے

میرے شعور کو اُن کا علم نہیں ہوتا، میں پل پل، جن جن وارداتوں میں بہہ جاتا
ہوں
اور اپنے ہونے کی جس جس ہونی میں ہوتا ہوں......
اور جب کوئی مجھے یوں سنبھالتا ہے جیسے وہ میرے ساتھ ہے!

اک یہ خود آگاہ سی بے خبری جو میرے شعور کا جوہر بھی ہے
اور جو میرے شعور کے علم سے باہر بھی ہے
زندگی میں اک زندگی، آسمانوں سے آنے والی،...... مٹی جس کی روح ہے!

(۴-۵-۱۹۷۲)

اپنے آپ کو......

اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہونے میں جب اس اپنی بھول کو بھی تم
بھولے رہو گے
تو ان پتھریلے فرشوں پر چلتے چلتے اچانک کبھی کبھی تم یوں محسوس کرو گے
جیسے گہری شاموں کی ہلکی سانسوں میں
جی اٹھا ہے، وہ سب کچھ جو غربِ غروب میں اتنے فاصلوں پر ہے،
زمانوں سے بھی باہر
اور تم لوٹ آئے ہو خود اپنی یادوں میں اُس کے ہمراہ
اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہونے میں بھی......

(٢٥-٥-١٩٧٢)

دِلوں کی ان فولادی ......

دِلوں کی ان فولادی بیٹھکوں میں کس تک ان مفہوموں کے سب معنی پہنچے ہیں،
مفہوم ان حرفوں کے، جن کی عبارت کھُردرے کاغذ کے میلوں لمبے مسطر پر،
روزانہ لاکھوں بھوکی آنکھوں کا ناشتہ ہے،

کس کے فہم نے معنی جذب کیے ان سب حرفوں کے
جن کی کالی روشنائی سے لہو رستا ہے
کس نے ان حرفوں سے رستے لہو کو دیکھا
لہو..... لہو ہم سب کا، دھانی دیسوں گدلی آبناؤں میں

کس نے جانا
ان صبحوں میں، ان میزوں پر
ورق اُلٹتے ہی ہر روز اِک خونیں عہد گزرتا ہے
مارملیڈ لگے توسوں کے درمیان.....

ورق اُلٹ کر، لو وہ زوں زوں کرتے، گھوم گئے پھر سب دِل اپنے اپنے محور پر،
اپنے اپنے اطمینانوں میں،
اپنا دِل تو دیکھے دنوں سے دُکھنے لگا ہے،

(۲۷-۵-۱۹۷۲)

زندگیوں کے نازک......

زندگیوں کے نازک نازک دُکھی دُکھی موڑوں پر جو جو لمحے آتے ہیں
اک دن، اپنے سارے آنسوؤں سمیت، بھنچے ہونٹوں کے پیچھے، دِلوں کی تاریکی
میں مر جاتے ہیں

اُن کو کیوں مرنا تھا؟
یہ جذبے تو اس اِک سچائی سے پھوٹتے ہیں جو روحوں کا جوہر ہیں
لیکن یہ دِل کیوں ان جذبوں کا مدفن ہے
پاؤں پھر بھی ڈگمگ ڈولتے ہیں، گلیوں کی رسموں میں......،

مرنے والے ساتھی کے ماتھے کو چومنے والے تھر تھر کانپتے ہونٹ،
یہ سب کچھ بھول کے،

پھر بھی ان صحنوں کی ریتوں میں ہنستے بولتے جی جاتے ہیں
مند جانے والی آنکھیں مٹی میں سوگئیں، جینے والے اقراروں کے سامنے

بندے، تو ان آنکھوں میں ان سب اقراروں کا شاہد ہے

یہ کس سانحے کے پنجر نے تیرے دِل کے مدفن میں کروٹ بدلی ہے
تو کیا سمجھا بندے
شاید سارے سچ تو اس سچائی میں ہیں جس کا کسی کے ساتھ اقرار نہیں ہے
(۲۷-۵-۱۹۷۲)

تیری نیندیں......

تیری نیندیں جانتی ہیں، ری منو......
تیری لمبی بے کھٹکا نیندیں جانتی ہیں کیا......
تجھ کو تھپکنے والے ٹھنڈے ہاتھوں کے پیچھے یہ کس کا دِل ہے،
اور یہ جو نیندیں لانے والی کم سن صبحیں آئی ہیں،
کتنے اندھیروں کے ساتھ اَب اس اِک دِل میں اُبھری ہیں
اک دل، تجھ کو تھپکنے والے ہاتھوں کا بازو

گندمی محنت زاروں، دھانی کا جواڑوں اور بے رزق دروں میں
لاکھوں ہاتھ، پنگھوڑے جھلانے والے اور اُن کے پیچھے، اِک یہ دل،
اک دل، ان ہاتھوں کا بازو......،

تجھ کو خبر ہے، ری منو، تیری نیندوں کو دیکھ کر
آج تو یہ اِک دِل کن دُنیاؤں میں جاگا ہے جو اس کی آخری دھڑکن سے بھی ورے ہیں،
کالے سماج...... بلکتے بچپن اور اپاہج عمریں،
آج بھی اپنی دھڑکنوں میں یہ اِک دِل تیرے لیے کیا کر سکتا ہے،
کل بھی وقت کا پیکر کیا کر سکے گا، یہ دِل جس کا ٹوٹا ہوا بازو ہے!
کاش ایسے دِن بھی آئیں جب یہ دِل تیرے جاگنے میں اِک شاداں بہناپے کی
مسکانوں میں جاگے

(۱۰-۶-۱۹۷۲)

ان بے داغ......

ان بے داغ دبیز غلافوں کے عطروں میں یوں تو سب کچھ ہے
......جن کو تمھاری آنکھیں چومتی ہیں
ان شفاف چمکتی دہلیزوں میں یوں تو سب کچھ ہے
......جن پہ تمھارے سجدے بچھتے ہیں
پُر ہیبت دیواروں، میناروں اور گنبدوں کے سایوں میں یوں تو سب کچھ ہے
......جن میں داخل ہوتے ہی تمھاری سانسیں
ابد کے بوجھ کے نیچے رک رک جاتی ہیں

تقدیسوں کے اسیرو، تم یہ بھی تو سوچتے،
اصل میں سب کچھ تو وہ برتاوے تھے جن کو عمروں کے اس ٹکڑے نے اپنایا جو اَب
ان قبروں کی مقدس مٹی ہے

تم بھی اس اک پل کو جگمگا سکتے ہو
جس کا تمھاری عمر اک ٹکڑا ہے
ورنہ یونہی ان اپنی کچی سوچوں میں ٹھوکریں کھاؤ گے

(۹-۷-۱۹۷۲)

جس بھی روح کا......

جس بھی روح کا گھونگھٹ سرکاؤ...... نیچے اِک
منفعت کا رخ اپنے اطمینانوں میں روشن ہے
ہم سمجھے تھے گھرتے اُمڈتے بادِلوں کے نیچے جب ٹھنڈی ہوا چلے گی
دن بدلیں گے......

لیکن اَب دیکھا ہے، گھنے گھنے سایوں کے نیچے
زندگیوں کی سلسبیلوں میں
ڈھکی ڈھکی جن نالیوں سے پانی آ آ کر گرتا ہے
سب زیرزمین نظاموں کی نیلی کڑیاں ہیں!!
سب تملیکیں ہیں! سب تذلیلیں ہیں!
کون سہارا دے گا اُن کو، جن کے لیے سب کچھ اِک کرب ہے،
کون سہارا دے گا اُن کو، جن کا سہارا آسمانوں کے خلاؤں میں بکھرا ہوا
دھندلا دھندلا سا اِک عکس ہے۔

میں ان عکسوں کا عکاس ہوں......

(۱۱-۷-۱۹۷۲)

باڑیوں میں مینہ......

باڑیوں میں مینہ کا پانی، اور اُن کے ساتھ ساتھ آگے تک
کیچڑ کیچڑ ڈھلوانوں کی نم مٹی پہ چمکتی ٹھیکریاں اور تنکے
جن میں کھبے کھبے سے نقش، ان قدموں کے جو
ادھر سے جیسے، ابھی ابھی گزرے تھے، زمانوں کے اوجھل!

اب کوسوں خطّوں دُور، ان اینٹوں کے گھیرے میں، یوں بیٹھ کر سوچنا، ان روحوں
کے بارے میں،
گونگی، منہمک، چیونٹیاں تھیں، اپنے اپنے جتنوں میں
اپنی اپنی نارسائی میں،

اب اس ٹھنڈی سانس کے قلعے میں یوں بیٹھ کر سوچنا، ......

کتنی بڑی ہزیمت ہے ان آہنی خوشیوں کی، جن کی نوکیلی باڑ سے
باہر ہیں ان روحوں کے وہ سب دُکھ اور وہ سب
نیکیاں، جو زینہ تھیں اس قلعے تک،

آج اس ٹھنڈی سانس کے قلعے میں یہ آہنی خوشیاں سب کتنی بے امن ہیں،

سارے امن تو ان نازک نازک اندیشوں والی زندگیوں ہی میں تھے،
جن کے نقش قدم کیچڑ کیچڑ ڈھلوانوں سے جیتی گلیوں تک جاتے تھے،

(۱۹-۷-۱۹۷۲)

اُس کو علم ہے......

اُس کو علم ہے اَب وہ ایک سیاہ گڑھے کے دہانے پر ہے'
آگے...... اِک وہ گڑھا ہے اور اس کا وہ اگلا قدم ہے'
اب بھی اس کی بے حس' بے دانت' اوچھی' مسترخی' باچھیں ہنستی ہیں'
اس کا دِل نہیں ہنستا اور اس کی باچھیں ہیں جو ہنستی ہیں'
یہ اک پرتحقیر تلطف' دھار ہے اس تلوار کی' جس کی زد اتنی کاری ہے'
سب اس وار سے اپنی ذلت کی عظمت پاتے ہیں'

اس خوش بخت کو علم ہے' اُس کے دِن تھوڑے ہیں'
اس کو علم ہے' اس کا آخری وار اور اس کا اگلا قدم اِک ساتھ پڑیں گے'
آگے اِک وہ گڑھا ہے اور اس کا وہ اگلا قدم ہے'
اب ایسے میں جتنے سانس بھی ہیں اس گڑھے سے باہر'
جس سے کبھی کوئی باہر نہیں نکلا'
اس کی یہ کوشش ہے' وہ اس وقفے کے اندر' بھر لے اپنی باچھوں میں'
کچھ گھونٹ اور بھی

خوشیوں کے اس گاڑھے جوشاندے کے

جس میں مظلوموں کا لہو پکتا ہے!

(۱-۸-۱۹۷۲)

اب بھی آنکھیں......

اب بھی آنکھیں اُن کو ڈھونڈتی ہیں جو اَب بھی آنکھوں میں بستے ہیں'
ہر جانب بستے ہیں وہ...... ہم جن کا بھرم تھے جب وہ تھے'
اب بھی ہمارے ساتھ ہیں اُن کے دُکھ' ہم جن کا مداوا تھے جب وہ تھے'

اب تو اُن کے رابطے
ہماری زندگیوں کے غیاب میں
جینے والے کشف ہیں'

کون بتائے اپنے رازوں میں ہیں کتنی بیکراں...... یہ بے فاصلہ دُوریاں'
جانے کن اقلیموں سے آتے ہیں خیالوں کے ہلکے ہلکے سے جھکولے'
جو...... چپکے سے...... دھیرے دھیرے...... روحوں کے کنجوں میں سرسراتے ہیں'
تو آنکھوں میں بھر بھر جاتی ہیں مٹی ان آستانوں کی......
جن کے امٹ نشانوں کے سامنے
اُن کے دعا کے ہاتھ ہمارے لیے اٹھے تھے!

اُن کی سانسوں میں جینے والے زمانے ہمارے دِلوں میں جاگتے ہیں...... اور اَب بھی
ہماری آنکھوں میں بستے ہیں وہ' ہم جن کے ضمیروں میں تھے' جب وہ تھے!

(۱-۸-۱۹۷۲)

اوران خارزاروں میں......

اوران خارزاروں میں چلتے چلتے خیال آتا ہے
سدا ہمارے دِلوں میں چٹکنے والی کلیوں کی یہ بہاریں'
جن صبحوں اور جن شاموں کا موسم ہیں'
وہ دِن آئیں گے تو......'

اور کانٹوں کی ٹوٹتی نوکیں ہمارے قدموں کے نیچے کڑکڑانے لگتی ہیں'
اور سانسوں کی لہر میں لوہے کی سیال سی پتری جڑ جاتی ہے'
اور زمین کی پیٹھ پر اپنا بوجھ بہت کم رہ جاتا ہے'

اب تک ہم نے کیسے کیسے یقینوں کے ان نیلم جڑے پیالوں میں
عمروں کا زہر پیا ہے'

یوں کتنے ڈربوں میں آس کے چہروں پر اِک مٹیالی سی
دمک جیتی ہے'
آسمانوں کی گونجتی پہنائی میں ہمارے نام کے ذرّے
بکھر بکھر جاتے ہیں
کبھی نہ مرجھانے والے پھولوں کے ڈھیر ہمارے من میں'

اور یہ سب کچھ......
اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں جب اپنے دامن میں پیتل کی اک پنکھڑی بھی نہیں ہوتی!
(۱۰-۸-۱۹۷۲)

بھولے ہوئے وہ لبھاوے......

بھولے ہوئے وہ لبھاوے تب تو کتنے سچے کتنے کھرے تھے
تب تو اپنے وقت کی سچائی تھیں گزری ہوئی وہ جھوٹی خوشیاں،
جو اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کے اِک دِن سیدھی اس میرے دِل میں آئی تھیں،
اب تو سچ مچ وہ خوشیاں جھوٹی لگتی ہیں، اَب کہتا ہوں کتنا بھولنہار تھا تب میں......،
اب تو اور ہی جھوٹی سی اِک اپنی سوجھ کی سچائی پر اتراتا ہوں،
جانے اس کروٹ کو آگے چل کر میں اِک بھول ہی سمجھوں،

شاید سب یہ گزرنے والے دِن ہوں دکھاوے ان سب آنے والے دنوں کے،
دن اَب جن کے لوبھ میں جینا ہوگا
دن جو میرے دِل تک میرے جھوٹ کی سیڑھیاں ہیں
میری موت کی سچائی تک!

(١٠-٨-١٩٧٢)

تو تو سب کچھ

تو تو سب کچھ جانتا ہے، وہ کیسی کیسی شکستہ کمر توقیریں تھیں، میں جن کی خاطر
تجھ سے طاغی ہو کر ڈوب رہا ہوں،
اس اِک گہری ٹھنڈی سانس میں،
جس کے چلتے آرے کی یہ دھار، اب
میرے دِل کو چیرنے لگی ہے،
سب کچھ والے، سب کچھ تو تجھ سے تھا،
اپنی روح کے اس خاکی سے دکھاوے کی خاطر، اِک میں ہی،
جھوٹے خیالوں کی یہ کچی تیلیاں، جوڑ کے
اپنے گمانوں کے قلعے میں یوں اَب تک دربند تھا
ورنہ ساری صولتیں تو اس نام کو حاصل تھیں جو تیرے ظاہر و مخفی وجود سے باہر،
تیرا اِسم ہے،
سچی عزتوں والے، ان سب کائناتوں میں جو کچھ عیاں ہے، اس سے بھی بڑھ کر
اظہر ہیں تیری عطائیں، جن کے ستر میں ہیں ناموس
ان سب ناموں کے، جو سورج کے نیچے جلتے ہیں
یا جو مٹی کے اندر جیتے ہیں!
مرے نجس! نکمے ناری نام کو اپنے کرم کی رمزوں کے زمردوں میں رکھنا،

(۱۱-۸-۱۹۷۲)

مجھ کو ڈر نہیں ......

مجھ کو ڈر نہیں اس کا، آج اگر میں ڈرتا ہوں اس قہقہے سے، جو میری اس آواز سے ٹکرایا
...... یہ میری آواز جو اِک اور شخص کے دِل سے سدا اُبھری ہے! ......

آج اس خوف کا دِن اُبھرا ہے اور کل بھی شاید یہ قہقہہ حاوی ہوگا اس آواز پہ جو میری آواز ہے
اور جو اِک اِک اور شخص کے دِل سے سدا اُبھری ہے!

اور اس شخص کا دِل تو گونجتا زمانہ ہے اور میرے دِل میں کبھی نہیں بیتا وہ دن، جب
ان راہوں پہ
اُس کے تنہا ہاتھ میں مشعل کی لو اور اُس کے تنہا قدموں میں زمانوں کی آہٹ
اک ساتھ بڑھی تھی، میری جانب!

آج اِک قہقہے کی کالی قاتل برچھی، جو میرے دِل کو کاٹ گئی ہے،
اس آواز کے سینے میں پیوست ہے،
آج اس قہقہے سے ڈرتا ہوں لیکن آج کے اپنے ڈر سے میں نہیں ڈرتا،
اک دِن آئے گا جب وقت اپنی آواز میں جاگے گا، سب کالے قاتل قہقہوں پر حاوی،
(۱۸-۸-۱۹۷۲)

غزل

اک سانس کی مدھم لو تو یہی، اِک پل تو یہی، اِک چھن تو یہی،
تج دو کہ برت لو دِل تو یہی، چِن لو کہ گنوا دو، دِن تو یہی،

لرزاں ہے لہو کی خلیجوں میں، پیچاں ہے بدن کی نسیجوں میں
اک بجھتے ہوئے شعلے کا سفر، کچھ دِن ہو اگر کچھ دِن تو یہی،

بل کھائے، دِکھے، نظروں سے رِسے، سانسوں میں بہے، سوچوں میں جلے
بجھتے ہوئے اس شعلے کے جتن...... ہے کچھ بھی اگر کچھ دِن تو یہی

میں ذہن پہ اپنے گہری شکن، میں صدق میں اپنے بھٹکا ہوا
ان بندھنوں میں اِک انگڑائی...... منزل ہے جو کوئی کٹھن تو یہی،

اس ڈھب سے جئیں سینوں کے شرر، جھونکوں میں گھلیں، قدروں میں تلیں،
کاوش ہے کوئی مشکل تو یہی، کوشش ہے کوئی ممکن تو یہی،

پھر برف گری، اِک گزری ہوئی پت جھڑ کی بہاریں یاد آئیں
اس رت کی نچنت ہواؤں میں ہیں، کچھ ٹیسیں اتنی دُکھن تو یہی!

(۸-۹-۱۹۷۲)

عرشوں تک......

عرشوں تک اونچے آدرشوں کے فیضانوں میں بھی،
اسی طرح سے، ہمیشہ، ڈرتے رہے ہیں لوگ، اُن لوگوں سے، جو
اپنے لمبے بازوؤں میں سب تدبیریں رکھتے ہیں،
اور یہ کون بتائے، اس اِک ڈر کے ناطے کتنے کچے ہیں، کتنے سچے ہیں،

تدبیروں والوں کی گردنیں ہل نہیں سکتیں،
لیکن ڈرے ہوئے لوگوں کی اِک اِک التجا کو اپنی پلکوں سے چن لیتی ہیں وہ آنکھیں، جو
ان سب موٹی موٹی گردنوں، خودسر کھوپڑیوں سے جھانکتی ہیں، فاتح فاتح، نازاں نازاں،

اور یوں طاغی روحوں کو عظمت کی غذا ملتی ہے،
اور یوں ناتواں چیونٹیاں قدموں کے نیچے پسنے سے بچ جاتی ہیں،

اور میں نے یہ دیکھا ہے روز، ان خشت کدوں کے اندر، اِک اِک ہمہماتے چھتے میں،

جس میٹھے، ٹنیالے، شہد کی بانٹ ہے،
اس کو نارسا عاجزیاں ان پھولوں سے حاصل کرنی ہیں، جو
فرعونوں کے باغوں میں کھلتے ہیں،

زینہ بہ زینہ، اک اِک بام پہ بت اور اُن کی للکھ لٹ آنکھیں، ہنستی، ارذل خوشیاں بانٹتی،
روز و شب کی احتیاجوں میں...... یوں ہی فرشوں کے دھندے چلتے ہیں،
عرشوں تک اونچے آدرشوں کے سایوں میں،
(۱۲-۹-۱۹۷۲)

کل...... جب......

آخر تمھیں بھی سوجھی یوں ہم ڈرے ہوؤں سے ڈرنے کی
نا بھئی، اَب ہم پھر نہ کہیں گے، بات یہ جینے مرنے کی،
ابھی سنی جو تم نے کتھا یہ موت کے مشکل لمحے کی،
وہ تو جیتے جی، خود جی سے گزرتی سوچ کی کروٹ تھی،
کاہے کو تم گھبرا گئے، یہ تو روپ تھا خود سے لگاوٹ کا
یونہی ذرا کچھ اپنے آپ سے روٹھ کے ہم نے دیکھا تھا

اچھا، مان لیا...... ہیں زخم ان بھیدوں کے سب دُکھن بھرے
ہونے اور نہ ہونے کے اس الجھیڑے میں کون پڑے،
چھوڑیں بھی وہ جھوٹی سچی بات...... ذرا اَب دُنیا کو
ایک نظر ہم اپنی شکم سیر آنکھیں سے بھی دیکھیں تو،
تمھیں خبر ہے، تم سچے ہو، دُنیا کی یہ انوکھی دھج،
صرف اِک سورج سے ہے وہ بھی تمھارے چہرے کا سورج

تم سچے ہو، جو کچھ بھی ہے جیتے دنوں کا میلا ہے

مٹی جسم ہے، مٹی نور ہے، مٹی وقت کا ریلا ہے

ہرے بھرے میدان، ابلتے قریے، باسمتی کی باس

سانسیں، عمریں، قدریں...... سب کچھ سکے، پہیے، چربی، ماس

سب تقدیریں، سب ہنگامے، سب یہ مسائل بھنور بھنور،

سب کچھ ایک خنک سا جھونکا، تمھارے رخ کے پسینے پر!

اچھا، اَب تو خوش ہو...... اَب بھی سنو تو میرا دِل یہ کہے!

بھائی، کل کیا ہوگا...... کل جب بیگھے خون میں بھیگ گئے!

(۱۴-۹-۱۹۷۲)

دل تو دھڑکتے......

دل تو دھڑکتے آگے بڑھتے قدموں کا اِک سلسلہ ہے'
دل کا قدم جو گزرتے وقت کی منزل طے کرتا ہے'
ساتھ ہی' ایک ہی وقت میں' بیتے وقتوں کی جانب بھی بڑھتا ہے'
دل پر وقت کی جو منزل ہے' طے نہیں ہوتی......
بس اِک انجانی سی آگہی ہے' جس کی بیدار مسافت پر سب مرحلے'
اک ساتھ اپنی گزرانوں کی نیندوں میں'
جاگتے ہیں'.
بیٹھے بیٹھے آج اس کیفیت سے ڈرا ٹھا ہوں' جس کو میں پہچانتا ہوں اور جس کی بابت
جانتا ہوں' یہ کیفیت اس وقت اُبھرے گی'
آنے والے دِن جب گزرے دنوں کی منزل سے گزریں گے'

گزرے ہوئے زمانوں کی منزل سے گزرنے والے...... آنے والے دنوں کا
خیال آتے ہی

وقتوں کی کچھ سطحیں دِل کے دھڑکتے قدموں کے نیچے سے سرک گئی ہیں'

دل کو سہارا دینے والا اِک ڈر' من کو لبھانے والی ایک اداسی'
جن کا کوئی ابد ہے اور نہ عدم ہے'
پل بھر میری زیست کا حصہ رہے ہیں'
گزرے دِلوں کی خوشیاں آنے والے غموں کا جز و نظر آتی ہیں'

(۱۶-۹-۱۹۷۲)

اور یہ انساں......

اور یہ انساں...... جو مٹی کا اِک ذرّہ ہے...... جو مٹی سے بھی کم تر ہے'
اپنے لیے ڈھونڈے تو اُس کے سارے شرف سچی تمکینوں میں ہیں'
لیکن کیا یہ تکریمیں ملتی ہیں'
زر کی چمک سے؟
تہذیبوں کی چھب سے؟
سلطنتوں کی دھج سے؟
نہیں!...... نہیں تو......!
پھر کیوں مٹی کے اس ذرّے کو سجدہ کیا اِک اِک طاقت نے؟
کیا اس کی رفعت ہی کی یہ سب تسخیریں ہیں؟
میں بتلا دوں:
کیا اس کی قوت اور کیسی اس کی تسخیریں؟
میں بتلا دوں:
قاہر جذبوں کے آگے' بے بس ہونے میں' مٹی کا یہ ذرّہ'
اپنے آپ میں'
جب مٹی سے بھی کم تر ہو جاتا ہے سننے والا اس کی سنتا ہے'
سننے والا جس کی سنے' وہ تو اپنے مٹی ہونے میں بھی انمول ہے'

(۲۴-۹-۱۹۷۲)

اور پھر اِک دن......

اور پھر اک دن، میں اور تم، جب ان اونچی نیچی دیواروں کے جھرمٹ میں اترے،
......جن میں کبھی ہماری روحوں کو زندہ چن دیا گیا تھا......
اس وقت آنگن آنگن میں، ترچھی کرنوں نے
دھوپ کے کنگرے سایوں کی قاشوں میں ٹانک دیئے تھے

دیکھا ہوا سا کوئی سماں پرانا اس دِن ہم نے دیکھا،
یوں لگتا تھا، جیسے آسمانوں کی روشنیاں جھک کر اس اِک قریے کو دیکھ رہی تھیں،
اور ہمیں تب وہ دِن یاد آئے جب موت ہماری زندگیوں سے گزری تھی، ایسی ہی
صبحوں کی اوٹ میں،

ہم ان زینہ بہ زینہ منڈیروں کے جھرمٹ میں تھے اور اس شہر کے لوگ
اَب بھی گلیوں میں
خوانچے لگائے اپنی زندگیوں کو بیچ رہے تھے،

اور پھر ہم نے سوچا' کون اچھا ہے' ہم جو مردہ چہروں سے جینے کی خواہش
پاتے ہیں' یا وہ جو
ہم کو زندہ دیکھ کے ہماری موت کو مان لیتے ہیں'

ابھی ابھی تو میرے ساتھ تھے تم' اے گزرے ہوئے زمانوں کے خیالو! پھر کب لوٹو گے
اک دِن پھر بھی تمھارے ساتھ اس خاک کے تختے تک جاؤں گا'
جس سے ڈھکے ہوئے بے نور گڑھوں میں' کچھ نادیدہ آنکھیں
ہم کو دیکھ کے اَب بھی ہنس ہنس اٹھتی نظر آتی ہیں

(۲۸-۹-۱۹۷۲)

لیکن سچ تو یہ ہے......

لیکن سچ تو یہ ہے، صرف ہمیں جھٹلا سکتے ہیں اپنی جھوٹی سچائی کو
ورنہ اپنا حال تو یہ ہے، ظاہر کرنے کو تو یوں ظاہر کرنا جیسے ہم جیتے ہیں بس کچھ
ایسے خودمست یقینوں میں، جو
صرف ہمیں کو اپنے بارے میں حاصل ہیں......'
لیکن اندر ہی اندر یہ باور کرنا ''آنے والی اگلی سانس تو بڑی کٹھن ہوگی، جب تک
ہم اپنے اس بہروپ کو ترک نہیں کر دیتے''
زندگیوں کے برتاووں میں اپنے جھوٹ سے ہم لوگوں کو دہلاتے ہیں،
اور اپنے سچ سے خود سہمے ہوئے رہتے ہیں!'
ایسا کون ہے جس کی طلب دُنیا میں بے بہروپ ہے،
اور خودمست آنکھوں کی ساحر ٹکٹکی اور لب بستہ حلقوموں کی مخفی تلخی
کے پیچھے تو جانے کس کس مجبوری کا عمل ہے،
کالی ریت کے جلتے صحراؤں میں شکم کی پیاس انہی خودمست آنکھوں کے روشن
روزنوں سے میٹھے چشموں کی چمک کو سونگھتی ہے!
لوگ کسی کو کتنا ہی بے فکر تفکر والا سمجھیں، پر یہ تو اس کا دِل ہے
جانتا ہے، وہ میٹھے چشمے کتنے دُور ہیں جو لوگوں کو اس کی آنکھوں میں لہراتے نظر آتے ہیں،
(۲۹-۹-۱۹۷۲)

ہم تو اسی تمھارے سچ......

ہم تو اسی تمھارے سچ کے کباڑ میں تمھارے ساتھ یہیں پر، کُرم کُرم بستے ہیں،
تم کیا جانو......
اکھڑی ہوئی جڑوں والی دیواریں گرتے گرتے ماتھے جوڑ کے جس کونے میں ٹھٹک گئی تھیں،
وہیں کہیں وہ چھوٹی سی میری دُنیا تھی...... یہ بسرام تو تیاگ میں مجھ کو ملا تھا......،

''اور تمھیں کیا چاہیے،...... مزے مزے سے، بیٹھ کے،
اپنے دانت اَب کچکچاؤ، تم اندھیروں سے اس بھرے ہوئے چھوٹے سے ڈبے میں
یہ چھت جس پر ڈھکنا ہے

چونک کے میں نے دیکھا، گلتے، بھربھرے، کاغذ پر، اک میری نظم کے سارے حرف،
اَب اُن کے جبڑوں میں تھے،
اور تب میں نے سوچا، دھنسی پرانی لحدوں میں بل کھاتے کرمکوں کی خوشدامنیں،
دیمکیں سچ کہتی ہیں،

جو اس گدلی یکسوئی میں، بیٹھ کے، کالی روشنائی کے ریزوں کو یوں کرم کرم چبتی ہیں،
لاکھ حرفوں میں علموں کا جو گودا تھا، اَب وہ ان دانتوں کی کترن ہے......
تلواروں کی نوکوں سے لکھے ہوئے لفظوں کی صورت میں سرسراتی زنجیریں اَب
ان آنتوں کی اترن ہیں
سارے لیکھک اپنی لکھتوں میں پس گئے ان جبڑوں کے بیچ......ان سب پر
دُھوپ کفن تھی،"

دیمکیں سچ کہتی ہیں......واقعی باہر، موت کی شرطوں پر، جیتے ہیں، جینے والے......
اکثر میرے تعاقب میں آئی ہیں، ان آنکھوں کی گردش کرتی کرگسی پتلیاں،
آنکھیں، جو یوں اپنی پلکوں پر میرے لفظوں کو تولنے میں میری نبضوں کے بقایوں کو بھی
گن لیتی ہیں،

"تم رہو ڈرتے عقباؤں سے......ہم سے جو پوچھو تو ہماری ہی سب گتیں ہیں،
جو آخرتوں کے گوشت کدوں میں، زعفرانی ڈوروں والی کافوری خلعتیں اوڑھ کے
مزے مزے سے مٹی چچوڑتی ہیں،
تم پڑے یونہی ڈرتے رہو اے لمبی ٹانگوں والے انسانی مکوڑو......"

(۸-۱۰-۱۹۷۲)

کبھی کبھی تو زندگیاں ......

کبھی کبھی تو زندگیاں کچھ اتنے وقت میں اپنی مرادیں حاصل کرلیتی ہیں'
جتنے وقت میں لقمہ پلیٹ سے منہ میں پہنچتا ہے......اور
اکثر ایسی مرادوں کی تو پہنچ بھی لقموں تک ہوتی ہے!
اور جب ایسی منزلیں بارور ہوتی ہیں تو شہر پنپتے ہیں اور گاؤں پھبکتے ہیں......اور
تہذیبوں کی منڈیوں میں' ہر جانب' قسطاسوں کی ٹیڑھی ڈنڈیاں' روز و شب' تیزی تیزی سے
انسانوں کی جھولیوں میں رزقوں کی دھڑیاں اُلٹتی ہیں......اور
بھرے سماجوں میں شدھ تلقینوں کی ڈونڈیاں پیٹنے والے بھی اپنی اپنی پیغمبریوں کی
تنخواہیں پاتے ہیں......!

لیکن کس کو خبر ہے' ایسی بھی ہیں منزلیں' جن تک جانے والے رستوں پر' نہ دعا کا سایہ
ہے نہ قضا کا گڑھا ہے'
کچھ ہے بھی تو بس اپنی سوچوں کی دھجیوں میں سمٹی ہوئی اِک بے چارگی' جس کی بے صدا
ہوک میں عمریں ڈوب جاتی ہیں'

اور قطبوں سے قطبوں تک' اڑ اڑ کر جانے والے' تھکے پروں کی کمانیں بھی تو
اک منزل پہ' چمکتی آبناؤں کی سمت لچک جاتی ہیں'......
لیکن ہائے وہ منزلیں' جن تک ہر سچائی رستہ ہے اور ہر سچائی موت کا جیتا نام ہے'
(۱۹-۱۰-۱۹۷۲)

سب سینوں میں......

سب سینوں میں یکساں بٹے ہوئے ہیں علم اِک دوسرے کے سب احوالوں کے'
اور سب سینے خالی ہیں ان دانستوں سے'
جن میں یک جانی کی نشوونما ہوتی ہے'

اپنی اپنی اناؤں کے ان بے تسنیم بہشتوں میں سب الگ تھلگ ہیں'
اُن کے علموں کی ڈالی پر استفہاموں کا میوہ نہیں لگتا'

سب نے اپنی دانستوں سے اُبھرنے والے سوالوں کی جانب دروازے اپنے دِلوں کے مقفل کر کے
چابیاں اَب دوزخ کے پچھواڑے میں پھینک بھی دی ہیں

ایسے میں اَب کون سنے گا کسی کا شکوہ'
اندرِ سینوں میں پہلے سے اتنا غوغا ہے اپنی ہی سانسوں کا'

راکھ کے ذرّوں سے زرریزے نتھارنے والے اشک آلود خیالو!
کہو تمھیں کچھ سوجھا' اپنے غبار کی اوٹ میں'

ہمیں تو پہلے ہی سے پتا تھا'
مرنے سے پہلے لوگ اپنے جاننے والوں کے علموں میں مرتے ہیں'

(۴-۱۱-۱۹۷۲)

برسوں عرصوں میں......

برسوں عرصوں میں اَب نیندوں میں جاگے ہیں'
خواب' جو جاگتے دنوں کے آنسوؤں میں جیتے تھے

خواب' جو کل بیداری میں بھی اپنے نہیں تھے'
جو اَب نیندوں میں بھی اپنے نہیں ہیں'
صرف یہ آنسو ہمیشہ سے اپنے تھے' جن میں ان خوابوں کی جوت جلی تھی'

کسے خبر کیسی ہیں دُوریوں کی ہی دُنیائیں جو برسوں عرصوں ہمارے دِلوں سے بعید رہتی ہیں'
اور اچانک کبھی ہم اپنی زندگیوں کو اُن کے چمکتے مدار میں پاتے ہیں' پل بھر کو
پل بھر اتنے قریب تک آکر پھر وہ دُوریاں اپنے سدیمی سفر پر ہم سے دُور اور دُور تر ہو جاتی ہیں'
اور ہمارے آنسوؤں میں اُن کے عکسوں کی قربتیں بھی دھندلا جاتی ہیں'
کیسے ہیں یہ انجمیں قافلے' جن کا پڑاؤ کبھی برسوں عرصوں میں پل بھر کو روحوں کے
ساحلوں پر ہوتا ہے'

تو وقتوں کے دریاؤں میں روشنیوں کے دودھ بہتے ہیں'

اور پھر عمر بھر آنکھیں اپنے آنسوؤں میں ان تسکینوں کو ترستی رہ جاتی ہیں!

(۷-۱۱-۱۹۷۲)

آنے والے ساحلوں پر......

آنے والے ساحلوں پر تو جانے کن قدروں کی میزانیں ہیں!

لیکن ان سب بھرے جہازوں کو دیکھو، یہ قدآور مستول اور ممتلی بادبان......
عرشے عرشے پر یہ بوجھل روحوں، چکنی آنکھوں والے مسافر......
کس نخوت سے، کن اطمینانوں میں، تیرتے ہیں یہ بیڑے،......
جن میں لدے ہوئے یہ خزانے آنے والے ساحلوں پر سب مٹی کے دانے ہیں!

اور اس ڈوبنے والے کو دیکھو...... اک موج کے بل پر، آخری بار اُبھر کر،
دُور سے اس نے بادبانوں کی دھندلی قوس کو، کس حسرت سے دیکھا......
اور اُس کے دِل میں وہ دولت تھی، آنے والے ساحل جس کی قیمت ہیں......

اُور ان جیتی ہانپتی سڑکوں کے پتھریلے سمندر،...... مڑتے اور لہراتے......،
اپنی منجدھاروں اور اپنے ساحلوں کو یوں روز اچھالتے ہیں میری نظروں کے سامنے،
دُنیاؤں اور عقباؤں کے اس سنگھم پر......
اور میں خالی ہاتھوں سوچتا ہوں،...... کون ایسا ہے، جو
ان سنگین تریڑوں کے جب پار اترے تو اُس کے پاس وہ ساگری ہو
آنے والے گھاٹ پہ جس کا مول ہے،

(۱-۱۲-۱۹۷۲)

خورد بینوں پہ جھکی......

خورد بینوں پہ جھکی آنکھوں کی ٹکٹکی کے نیچے دُنیا کے چمکیلے شیشے پر اپنے لہو کی چکٹ میں،
کلبلاتے، بے کل، جرثومو!

دیکھو، تمھارے سروں پر گرداں خورد بینوں میں گھورتی آنکھیں تقدیروں کی،
تم سے کیا کہتی ہیں سنو تو......
''بھرے کرُے پر جڑ جڑ جیتے کرمکو، تم کب تک سورج کی کرنوں کا میٹھا کیچڑ چاٹو گے......
گیلا ریتلا سرد اندھیرا ہے آگے تو......''

آگے تو جو کچھ ہو......
لیکن آج تمھارے جڑے جڑے جسموں کی لپیٹوں اور تمھاری گتھم گتھا روحوں کے گچھوں کے
اندر جب میرے دبلے سے دِل نے اچانک
اپنے اکیلے پن میں اپنا رخ اپنی جانب دیکھا ہے تو تم میں ہوتے ہوئے بھی میرے دِل کو تم پہ
ترس آیا ہے،

آگے تو جو کچھ ہو......

دُنیا کے دھبے میں بھری ہوئی، ہم سب بے چہرہ بے کل روحیں، ہم سب بے کل بلاتے جرثومے
آگے جو کچھ ہو...... اِک بار تو خود پہ ترس کھا کر دیکھیں......
شاید ہم کو دیکھنے کیلیے تقدیروں کو اپنی خورد بینوں کے زاویے بدلنے پڑیں......
(۹-۱۲-۱۹۷۲)

صدیوں تک......

صدیوں تک، اقلیموں اقلیموں، زندہ رہتا ہے ایک ہی جسم،
پگھلا ہوا، بے جسم،...... اِک جسم،
اپنے چلن کے چولے میں،

ایک یہی پیکر،
جس میں روحیں آ آ کر اپنی میعادوں میں چکراتی ہیں، کھو جاتی ہیں،
زندہ رہتا ہے صدیوں کے کبڑے گھروندوں میں،
زندہ ہواؤں میں،

اور جب اس کا زمانہ نیلے دُھوؤں میں گہنا جاتا ہے،
تو بھی...... اس کی زندگی لہک لہک جاتی ہے، ان آنکھوں میں،...... جو
گھنے گھنے باغوں کی طراوتوں سے بھر جاتی ہیں، جب تانبے کی دیواروں کے جنگل میں کہیں
شہنائی کی دھن بجتی ہے

کالے کھمبوں کی نوکیں جب آسمانوں کے سائبانوں کو چھید دیتی ہیں،
تو بھی...... سدا اِک جیتی سوچ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں سایوں کی عمریں،
جب کالے بادل گھر گھر کر آتے ہیں،
لوہے کی لچکیلی پٹڑیاں جب عفریتوں کے قدموں سے کڑکڑاتی ہیں،
تو بھی، سدا اِک گہری سانس کی نزدیکی میں سما جاتی ہیں ترستی دُوریاں،
شام کو جب تاروں کے ابد جل اٹھتے ہیں،

(۱۷-۱۲-۱۹۷۲)

اپنے دُکھوں کی مستی میں......

اپنے دُکھوں کی مستی میں اِک وہ خنداں چہرہ' جو میرے لیے خنداں تھا'
اور وہ اپنی اِک جنبش سے دونوں جہانوں کی سب زنجیروں کو جھٹک دینے والی بے کل پلکیں' اور
وہ جذبیلی باغی آنکھیں...... جو میری خاطر باغی تھیں'

چاندنی میں کفنائے ہوئے ظلموں کی بستی کے ٹوٹے فرشوں پر'
ان دو محرم سانسوں کے ادوار...... ان دو مونس قدموں کے زمانے'
عجب ارادوں والی رات کے واقعے'
جیتے واقعے'
جن کے سامنے اپنے دِل کی پسپائی کا میں شاہد ہوں'

میں شاہد ہو جو کچھ بیتا' اس سرکش مٹی کی طینت میں تھا'
وہ سب کچھ اس طاغی دریا کی اِک طغیانی تھی
دریا...... جس نے صدیوں پہلے بھی اپنے رستے سے پلٹ کر اپنی ریت کی چادر پر'
اِک جلتی روح کی خاکستر کو جگہ دی!
اک دُنیا شاہد ہے...... راکھ کی اس ڈھیری کے سامنے' آج بھی'
ارمانوں کی جبینیں جھک جھک جاتی ہیں' جس طرح میری روح ہمیشہ اس خنداں
چہرے کے دھیان میں جھکی ہے'
جب سے میرے دِل کے دریاؤں نے رستے بدلے ہیں'

(۱-۱-۱۹۷۳)

کالے بادل......

کالے بادل! تیرے خوف میں ڈوب کے میرے دریا رک جاتے ہیں'
کالے بادل! تیری رو کے ساتھ امڈتے اندیشوں کی بابت سوچوں یا ان چڑھتے
پانیوں کو دیکھوں'
جن پر یہ میری ناؤ رواں ہے' ایسے ساحلوں کی جانب' جو
میری آنکھوں میں بسنے والے چہروں کی اقلیمیں ہیں!

تیری پرچھائیں کی حقیت سے ڈرنے میں اپنی حقیقت بھی
مجھ کو پرچھائیں نظر آتی ہے!
مجھ اِک سایے کے یہ خدشے اور تجھ ایک حقیقت کی یہ ہیبتیں
ایک سدیمی ضابطے کی ترتیبیں ہیں' جس سے ان دُنیاؤں کی نمو ہے!

کالے بادل......' میرے ڈر کو جانچ اور اپنے دخانوں ہی میں بکھر کے گزر جا'
ان دریاؤں سے اپنے سایوں کا بوجھ ہٹا لے'
ان دریاؤں کو بہنے دے جن میں میرے خیالوں کے یہ دھارے لہراتے ہیں'
دُھوپ ان پانیوں پر کھیلے گی' تو وہ جزیرے چمکیں گے جو میری آنکھوں میں
بسنے والے چہروں کی اقلیمیں ہیں'

(۱۹-۱-۱۹۷۳)

اندر سے اِک دُموی لہر......

اندر سے اِک دموی لہر اُبھر کے جب اُن کے چہرے کی وریدوں میں بھر جاتی ہے' اور
جب اس اِمتلا میں لوگ اپنی گلابی آنکھوں کے بے حرف تبسم سے مجھ کو اپنے دِل کی اِک
تیکھی بات سناتے ہیں
تو میں کہتا ہوں ''مولا تو نے دیکھا میں تیری اِک کیسی دُنیا میں ہوں''

پل بھر آنکھوں کے گوشوں تک آ کے پلٹتی پتلیاں' مجھ کو اچانک سامنے پا کر' پہلے
تو دانستہ اچٹ جاتی ہیں'
اور پھر دوسرے لمحے ہنستی آنکھوں کی جھیلوں میں تیر کے میری جانب جب کچھ اتنے
تپاک سے اُمڈ پڑتی ہیں'
تو میں کہتا ہوں ''مولا تو نے دیکھا میرے یہ اتنے صادق رابطے تیرے کیسے کیسے
بندوں سے ہیں''

مجھ کو دیکھے بغیر جنھیں سب علم ہے میں کس عالم میں ہوں' کچھ ایسی آنکھیں جب میری
جانب یوں تکتی ہیں'
جیسے دُنیا والے اِک میت کو اُس کے مرے ہوئے ہونے کے وثوق میں تکتے ہیں'
تو میں کہتا ہوں مولا! اُن لوگوں کو میری زندگی کی بھی خبر دے

باہر' گیلی گیلی سڑکوں پر' سرما کے ٹھنڈے محرم جھونکوں کے ساتھ' اس پامال سہانی دُھوپ
میں تھوڑی دُور چلا ہوں تو اَب میرا دِل کہتا ہے:
''مولا تیری معرفتیں تو انسانوں کے جمگھٹ میں تھیں' میں کیوں پڑا رہا اپنے ہی خیالوں کی
اس اندھیری کٹیا میں اَب تک؟''
(۲۲-۱-۱۹۷۳)

دوسروں کے بھی علم......

دوسروں کے بھی علم سے باہر ہیں،
وہ سب وابستگیاں، جو میرے علم کی سرشاری ہیں،
میرے علم سے بھی باہر ہیں،
وہ سب وابستگیاں، جو دوسرے کے علموں میں عزیز ہیں،

لیکن سب وابستگیاں......سب کی وابستگیاں، ان روحوں سے ہیں،
جو مٹی میں یکساں، یک منزل ہیں،

اک اِک قبر پہ جلنے والا دیا گو الگ الگ گھر سے آتا ہے،
لیکن سارے دیوں کی روشنیاں مل کر مٹی کے اِک ہی عالم میں جھلملاتی ہیں،
ایک ہی عالم، اپنے غیبوں میں ہر سو حاضر، حاوی،
جس کے الگ الگ ڈانڈے اِک اِک دِل سے ملے ہوئے ہیں،

آسمانوں کے پیچھے؟
کہیں مٹی کے نیچے؟
جانے کہاں بہتا ہے، آنسوؤں میں لتھڑی ہوئی نسبتوں کا وہ دریا......
جس کی اس اِک رو کو ہی پہچانتا ہے ہر شخص جو صرف اُس کے دِل تک آتی ہے،
وہ دریا، جس کی طغیانیاں، ناموجود زمانوں کے ساحل سے چھلک کے ہماری ان
پلکوں سے ٹپکتی ہیں، تو
ہم کو ایک ایک دیا اِک اِک تربت پر الگ الگ جل اٹھتا نظر آتا ہے،

سب علموں کی یہ تفریقیں ہیں، ورنہ آنسو کب جانب دار ہوئے ہیں،
(۵-۲-۱۹۷۳)

بستے رہے سب......

بستے رہے سب تیرے بصرے، کوفے،
اور نیزے پر، بازاروں بازاروں گزرا،
سر...... سرور کا!

قید میں، منزلوں منزلوں روئی،
بیٹی ماہِ عرب کی!
اور ان شاموں کے نخلستانوں میں، گھر گھر روشن رہے الاؤ!

چھینٹے پہنچے، تیری رضا کے ریاضوں تک، خون شہداء کے،
اور تیری دُنیا کے دمشقوں میں بے داغ پھریں زرکار عبائیں!

سامنے، لہو بھرے طشتوں میں، تھے مقتول گلابوں کے چہرے، فرشوں پر،
اور ظلموں کے درباروں میں، آہن پوش ضمیروں کے دیدے بے نم تھے

مالک، تو ہی ان سب شقی جہانوں کے غوغا میں،
ہمیں عطا کر،
زیرِ لب ترتیلیں ان ناموں کی، جن پر تیرے لبوں کی مہریں ہیں،

(۱۲-۲-۱۹۷۳)

دو پہیوں کا جستی دستہ......

دو پہیوں کا جستی دستہ تھام کے، چلتے، پھرتے، میں نے
سدا اسی اِک تول میں، اِک محسوس نہ ہونے والے چین سے،
اس دُنیا کو دیکھا،
بڑھتے مڑتے، کالے بھنور، سڑکوں کے،
اور دورویہ، وہ تختے پھولوں کے!

پھول بلاتے بھی تھے اور میں رک بھی نہیں سکتا تھا،
وہ دو پہیے ارض و سما تھے، وہ دو پہیے رک بھی نہیں سکتے تھے

پھولوں کے وہ دورویہ تختے...... اکثر اُن کی بابت سوچا،
کبھی تو آ کر باہم جڑتے چلے جائیں یہ تختے،
ان پہیوں کے ساتھ ساتھ ان میرے قدموں کے نیچے،
آگے...... دُور...... تک...... جہاں بھنور ان سڑکوں کے مڑتے ہیں،

(۲۴-۲-۱۹۷۳)

بات کرے بالک سے......

بات کرے بالک سے......اور بولے رہ چلتوں سے،
اک یہ ذرا کچھ ڈھلی ہوئی شوبھا والی کو ملتا'

اُس کے ستے ستے سے بال اور پیلی مانگ سے کچھ سرکا ہوا آنچل،
دُکھی دُکھی سی دکھنے کی کوشش کا دُکھ
اُس کے چہرے کو چمکائے اور اُس کے دِل کو اِک ڈھارس دی دے،
بڑے یقینوں میں مڑ مڑ کر دیکھے جیسے کچھ رستے میں بھول آئی ہو،
مڑنے میں وہ بات کرے اپنے پیچھے چلتے بالک سے، لیکن بولے مجھ سے، میری جانب
اپنی بات اور اپنی نظر کو یک جا کر کے!

دیکھنے میں شاید میں اتنا بھلا مانس نہیں لگتا

(۲۴-۲-۱۹۷۳)

جب صرف اپنی بابت......

جب صرف اپنی بابت اپنے خیالوں کا اِک دیا مرے من میں جلتا رہ جاتا ہے،
جب باقی دُنیا والوں کے دِلوں میں جو جو اندیشے ہیں اُن کے الاؤ مری نظروں
میں بجھ جاتے ہیں،
تب تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ دیواریں ہیں جو میرے چاروں جانب اٹھ آئی ہیں،
میں جن میں زندہ چن دیا گیا ہوں،

اور پھر دوسرے لمحے، اس دیوار سے ٹیک لگا کر، ...... اپنے آپ کو بھول کر،
میں نے اپنی روح کے دریاؤں کو جب بھی سامنے پھیلے ہوئے خود موج سمندر کی
وسعت میں سمو دیا ہے،
میری قبر کی جامد پسلیاں اِک غافل کر دینے والے سانس کی زد سے دھڑک اٹھی ہیں!

لیکن اس اِک بے بہا غفلت کو اپنانا بھی تو کتنا کٹھن ہے!
پھر دیواریں میرے گرد اٹھ آتی ہیں ..... اور......
پھر خود آگہی کا دھندلا سا مقدس دیا مری ہستی کی قبر پر ٹمٹمانے لگتا ہے!
(۲۵-۲-۱۹۷۳)

پھر مجھ پر بوجھ......

پھر مجھ پر بوجھ آ پڑتا ہے' ان نظروں کا'
جو دُنیا میں واحد نظریں ہیں جو دُنیا کی ہر شے میں مجھ کو دیکھتی ہیں...... اِک مجھ کو'
اور یوں مجھ کو دیکھنے میں ان آنکھوں کے آنسو حائل نہیں ہوتے' بلکہ پلٹ جاتے ہیں'

پھر اس بوجھ کے نیچے میری اپاہج معرفتوں کا بازو بڑھ کے مرے دِل کی کھڑکی کو
کھول دیتا ہے'
جس کے کواڑوں سے پھر آ کر ٹکراتے ہیں'
باہر زور سے چلنے والی غفلتوں کی آندھی کے تیز تیز جھونکے! وہ کھڑکی زور سے بند
ہو جاتی ہے' اور
پھر ان سہمی ہوئی پتھریلی مستطیلوں سے ابل پڑتا ہے'
اجلی ہوئی زندگیوں کا دریا'
جس کا پانی اتنا مہین ہے سونے کے ذرّے اس میں تیرتے صاف نظر آتے ہیں'
جن میں میرے خیال بھٹک جاتے ہیں'
سر سے سارے بوجھ اتر جاتے ہیں'
بجلی کے پنکھے کی طوفانی جھنکار میں'
میرے چہرے پر ٹھنڈے جھونکے کی جھالریں بکھر جاتی ہیں'
اور پھر یہ بھی نہیں میں سوچتا' میں کس جنت میں دوزخی ہوں'

(۱-۳-۱۹۷۳)

کیسے دِن ہیں......

کیسے دن ہیں! اب کے تو مجھ جیسی طاغی کو بھی، جس کی غفلت اتنی دوختہ چشم ہے،
تو نے دکھائے
اپنے زمانے ــــ جب وہ غیب کدوں سے چھلک کر پت جھڑ کی صبحوں میں جھلک
پڑتے ہیں،
اپنے چشمے ــــ جب ان میں بادل بہتے ہیں،
اپنی جنتیں ــــ جب وہ دوام کے بور سے لد جاتی ہیں،

میں کب اس قابل تھا......
دُنیا میں کون اس قابل تھا،

دیکھ لے ان راہوں پر، تیری دُنیا کے لوگ اپنے قیمتی فرغلوں، میلے کمبلوں میں
ڈوبے ہوئے کتنے
بے نسبت پھرتے ہیں ان مست ہواؤں سے، جو تیرے لاکھوں جہانوں کی
گردش کا ثمر ہیں!
(۸-۳-۱۹۷۳)

اُن کو جینے کی مہلت......

اُن کو جینے کی مہلت دے، جو تیرے بندوں کی خاطر جیتے ہیں،
ورنہ...... تو...... اس نگری کا اِک اِک ننگ کھوٹا ہے،
......کوئی نہیں جو ناتواں ذرّوں کا راکھی ہو،
کون اُن کا راکھی ہے، صرف اُن کی یہی دو آنکھیں، جن کی نگہداری میں زندہ ہیں
یہ ناتواں ذرّے
ذرّے، جن میں عزتیں ٹمٹماتی ہیں اس اِک گھر کی جس پر مجبوب اندیشوں
کی چھت ہے،
ان آنکھوں میں جلنے والے مقدس ارمانوں کو روشن رکھ
میں ان آنکھوں کے ارمانوں کے دُکھ میں جیتا ہوں،
یہ دُکھ مجھ کو زندگی سے بھی عزیز ہے،
انکو جینے کی مہلت دے جن کے جیتے رہنے میں اس دُکھ اس غم کی عفت ہے،
اُن کے دِن تھوڑے ہوں تو میری زندگی اُن کو دے دے،
اس ہونی کے ہونے تک تو...... اپنے ہونے تک تو...... میں ہوں،
اس وقفے کو ایسی راحتوں سے بھر دے، کچھ ایسی راحتیں،
جو میں ان دو نگہدار آنکھوں کو دے سکوں، حیائیں جن کی زندگی ہیں،

(۲۱-۳-۱۹۷۳)

جن لفظوں میں......

جن لفظوں میں ہمارے دِلوں کی بیعتیں ہیں، کیا صرف وہ لفظ ہمارے کچھ بھی نہ کرنے کا کفارہ بن سکتے ہیں؟

کیا کچھ چیختے معنوں والی سطریں سہارا بن سکتی ہیں، اُن کا
جِن کی آنکھوں میں اس دیس کی حد ان ویراں صحنوں تک ہے؟

کیسے یہ شعر اور کیا اُن کی حقیقت؟
ناصاحب، اس اپنے لفظوں بھرے کنستر سے چلو بھر کر بھیک کسی کو دے کر،
ہم سے اپنے قرض نہیں اتریں گے،
اور یہ قرض اَب تک کس سے اور کب اترے ہیں!

لاکھوں نصرت مند ہجوموں کی خنداں خنداں خونیں آنکھوں سے بھرے ہوئے
تاریخ کے چوراہوں پر
صاحب تخت خداوندوں کی کٹتی گردنیں بھی حل کر نہ سکیں یہ مسائل،
اک سائل کے مسائل؛
اپنے اپنے عروجوں کی افتادگیوں میں ڈوب گئیں سب تہذیبیں سب فلسفے،......

تو اَب یہ سب حرف، زبوروں میں جو مجلّد ہیں، کیا حاصل اُن کا......،
جب تک میرا یہ دُکھ خود میرے لہو کی دھڑکتی ٹکسالوں میں ڈھل کے دعاؤں بھری اس اک
میلی جھولی میں نہ کھنکے
جو رستے کے کنارے مرے قدموں پہ بچھی ہے!

(۲۴-۴-۱۹۷۳)

غزل

اور اَب یہ کہتا ہوں' یہ جرم تو روا رکھتا
میں عمر اپنے لیے بھی تو کچھ بچا رکھتا'

خیال صبحوں' کرن ساحلوں کی اوٹ سدا
میں موتیوں جڑی ہنسی کی لے جگا رکھتا

جب آسماں پہ خداؤں کے لفظ ٹکراتے
میں اپنی سوچ کی بے حرف لو جلا رکھتا

ہوا کے سایوں میں' ہجر اور ہجرتوں کے وہ خواب
میں اپنے دِل میں وہ سب منزلیں سجا رکھتا

انہی حدوں تک اُبھرتی' یہ لہر جس میں ہوں میں
اگر میں سب یہ سمندر بھی وقت کا رکھتا

پلٹ پڑا ہوں' شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے
نشیبِ زینۂ ایام پر عصا رکھتا'

یہ کون ہے جو مری زندگی میں آ آ کر..... '
ہے مجھ میں کھوئے مرے جی کو ڈھونڈھتا' رکھتا

غموں کے سبز تبسم سے کنج مہکے ہیں'
سمے کے سم کے ثمر ہیں' میں اور کیا رکھتا

کسی خیال میں ہوں یا کسی خلا میں ہوں
کہاں ہوں' کوئی جہاں تو مرا پتا رکھتا

جو شکوہ اَب ہے یہی ابتداء میں تھا' امجد
کریم تھا' مری کوشش میں انتہا رکھتا

(۲۴-۵-۱۹۷۳)

صبح ہوئی ہے......

صبح ہوئی ہے، صبح جو نیندوں میں جینے والی اک موت سے جاگ اٹھنے کی انگڑائی ہے،
سونے والو، تمھاری خاک آلودہ لمبی نیندیں، میری اک اک شب کی
نیند کی ہمیشگیاں ہیں،

سونے والو، جیسی تمھارے وقتوں میں تھی، اَب بھی اسی طرح سے ہے یہ دُنیا،
صبحیں ......اور اُن کے بعد آتی شاموں کے کالے جھونکے، جن کے دامن میں
موت ہے نیندوں میں ابدائی ہوئی،

اور گلی کی ٹوٹی سلاخوں والی نالی تک آ کر، جب اِک بوڑھے نے
اپنے کھوکھلے پوپلے سے جبڑے کو عصا کے خم پر رکھ کر جنازہ برداروں سے پوچھا:
"کون تھا؟" ......تو گدرایا ہوا اِک ماتمی بولا:
"کوئی مہلت مند تھا، ہم تو کاندھا دینے چل پڑے اُس کے ساتھ کہ وہ سو برس جیا تھا۔"
اور اِک بے آب آنسو کی سسکی، جب
بھرے محلے کے دروازوں منڈیروں سے گزری تو موت کی لذت سے سب
چہرے تمتا اٹھے،

یہ سب اپنے خواب ہیں، سونے والو،
خواب ہمارے جن میں تمھاری دُنیا جاگتی ہے، اے سونے والو!

ہر روز، ان صبحوں میں، اک اک شب کی موت کے ڈھلنے پر، اک ان دیکھے
طائر کے گیت میں،
مرنے والوں کے یہ بول اُبھرتے ہیں "جیہو...... جیو رے...... جیو جیو رے......

سونے والوں، تمھیں خبر ہے،
اپنی ان نیندوں سے جاگ کے، جب میں تمھارے دھیان میں جیتا ہوں، تو
تمھاری نیندوں میں کفنائے ہوئے ارمان
مرے جینے میں جاگتے ہیں،
(۱۹-۵-۱۹۷۳)

میرے دِل میں......

میرے دِل میں غم کے دشنے کی دھار اُتری ہے،
دل کا اِک ٹکڑا دِل سے کٹ کر گرنے کو ہے،
ایسے میں اِک مونس سچائی ہنستی ہوئی میرے سامنے آتی ہے،
اور میں اِک ہاتھ سے اپنے دِل کے گرتے ہوئے ٹکڑے کو دِل پر جوڑ کے، کس کے
گہرے کرب کی لذت میں مسکا کر،
دوسرے ہاتھ سے اس کو بڑھ کے سلام کرتا ہوں،

پھر میں دیکھتا ہوں، دُنیا والوں کی ملاقاتوں میں ہمیشہ
ہر سچائی کا اِک ہاتھ تو صرف مصافحہ ہوتا ہے،
اور دوسرا ہاتھ اتنی ہی مضبوطی سے اپنے دِل کی گرتی ہوئی اِک پھانک کو
دل کے ساتھ دبائے ہوئے ہوتا ہے،

سچی بات جو دِل کو لبھاتی ہے، اِک دِل سے دوسرے دِل تک، کس مشکل سے
سفر کرتی ہے،
تنی برکتوں والے مکر کی بھی کیا بات ہے،

(۳۰-۵-۱۹۷۳)

مطلب تو ہے وہی......

مطلب تو ہے وہی..... تم چاہے برف کے بلاکوں سے اِک بھرے ہوئے ریڑھے کو کھینچو......
(سامنے پل کی چڑھائی ہے، ہاں، دیکھ کے، بوٹ نہ پھسلیں......
اور اَب تھم کے آگے رستہ صاف ہے، عینک کے گیلے شیشوں کو پونچھو..... چلو..... چلو)
یا اِک ڈسک پہ جھک کے، لفظ تراشو، اپنے دِل کی چٹان کو توڑ کے
دونوں صورتیں، ایک ہی بات

تمھیں تو اِک ان دیکھے تازیانے کی بے آواز آواز پر
عدل کی چکی پیسنی ہے اور عدل کی چکی میں خود بھی پسنا ہے،
اس چکی سے گرتا، گرم سنہرے آٹے کا جھرنا، تو جانے کس کس کیفیت میں گندھے گا،
اپنے جتنوں میں تم جن رتنوں کو ڈھونڈ رہے ہو جانے کن پتنوں کے پار ملیں گے،

اس دوران میں کرے پھسلتے رہیں گے،
جسموں کی سوجی ہوئی لہروں کا فرش اس دریا پر ٹوٹتا جڑتا رہے گا،

کہیں کناری دار آنچل کے بیضوی چوکھٹے میں اِک چہرہ'
اک لب بستہ چہرہ'
اپنے آپ یہ اپنی آنکھیں جھکاتے'
سوچے گا: تم اس کی جانب کب دیکھو گے!

اور کہیں ظلموں کی زد میں' دُکھ کی اِک چیخ
اپنے دردوں میں بہہ جائے گی' یہ جان کے: تم امداد کو آ نہ سکو گے'

ہاں...... تو...... ڈر گئے نا' تم...... تم اور کر بھی کیا سکتے تھے'
اک یہ ڈر ہی تو وہ تمھاری قوت ہے' تم جس پہ بھروسا کر سکتے ہو'

اک بار اور اپنی پوری قوت سے توجہ'
ورنہ برف کے لفظوں میں سب آگ پگھل جائے گی'

(۱۲-۶-۱۹۷۳)

کچھ دِن پہلے......

کچھ دِن پہلے کی بارش کے بعد......اَب گیلی فضائیں، سوکھ کے تڑخنے لگی ہیں،
دُھول کے ہلکے ہلکے آسماں جھکے ہوئے ہیں پانیوں پر، جو
بھرے ہوئے ہیں دھان کی اِک کیاری میں، پکی سڑک کے ساتھ ساتھ،

سورج گرد کے پیچھے چھپا ہوا ہے،
کیسا دِن ہے،
صرف اِک ٹھنڈے سے جھونکے کی کمی ہے، جس کا گزران آسمانوں میں ہے نہ
خیالوں میں ہے،

پکی سڑک پر صدہا پہیے گردش میں ہیں، کالے رزقوں کی سمت آگ لگی آوازوں کے ساتھ،
......اور

اک میں سوچتا ہوں، ہر سُو ہر شے پر، گرد کی تہہ کیوں ہے، موت پر بھی
اور زندگی پر بھی......

دل کہتا ہے:
شاید مینہ پھر بھی برسے گا

(۱۳-۷-۱۹۷۳)

غزل

بچا کے رکھا ہے جس کو غروب جاں کے لیے
یہ ایک صبح تو ہے سیر بوستاں کے لیے

چلیں کہیں تو سیہ دِل زمانوں میں ہوں گی
فراغتیں بھی اس اِک صدق رائیگاں کے لیے

لکھے ہیں لوحوں پہ جو مردہ لفظ، ان میں جئیں
اس اپنی زیست کے اسرار کے بیاں کے لیے

پکارتی رہی بنسی، بھٹک گئے ریوڑ،
نئے گیاہ، نئے چشمۂ رواں کے لیے

سحر کو نکلا ہوں، مینہ میں، اکیلا...... کس کے لیے؟
درخت، ابر، ہوا...... بوئے ہمرہاں کے لیے

سواد نور سے دیکھیں تو تب سراغ ملے
کہ کس مقام کی ظلمت ہے کس جہاں کے لیے

تو روشنی کے ملیدے میں رزق کی خاطر
میں روشنائی کے گودے میں آب وناں کے لیے

ترس رہے ہیں سدا خشت لمحوں کے دیس
جو میرے دِل میں ہے اس شہر بے مکاں کے لیے

یہ نین...... جلتی لوؤں جیتی نیکیوں والے
گھنے بہشتوں کا سایہ ہیں ارض جاں کے لیے

ضمیر خاک میں خفتہ ہے میرا دل، امجد
کہ نیند مجھ کو ملی خواب رفتگاں کے لیے

(۱۴-۷-۱۹۷۳)

ہر جانب ہیں......

ہر جانب ہیں دِلوں ضمیروں میں کالے طوفانوں والے لفظ- ہزاروں گھنی بھوؤں کے نیچے
--گھات میں،
اب تو میرے لبوں تک آ بھی، حرفِ زندہ،

ہر جانب گلیوں کے دلدلی تالابوں میں، بے ستر، ہراساں، کھڑی ہیں روحیں،
قدم کھبے ہیں نیلے کیچڑ میں، اور اُن کی ڈوبتی نظروں میں اک بار ذرا تیری تھی اُن کی زندگی،
ابھی ابھی، اِک پل کو،
اور اَب پھر کالے طوفانوں والے لفظ اُن کے لیے جانے کیا کیا سندیسے لائے ہیں،
اُن کو زندہ رکھیو، حرفِ زندہ!

مدتوں سے بے یاد ہے تو میرے نسیانوں میں، اے حرفِ زندہ،
اب تو میرے لبوں پر آ بھی،
اب...... جب میرے دیکھتے دیکھتے کالے طوفانوں والے لفظوں کا آبی فرش
اِک
بجھ بجھ گیا ہے، دُور اُفق کے پیچھے، کہیں اُن پانیوں تک، جن پر اِک ناخدا پیغمبر کی دعاؤں
کے بجرے تیرے تھے!

میرے نسیانوں میں جہندہ، حرفِ زندہ،
تیرے معنوں میں امواج ہیں وہ سب علم جو روحوں کو کھینچتے ہیں اس اِک گھاٹ کی سمت
جہاں امید اور خوف کے ڈانڈے مل جاتے ہیں،

اب تو ساری دُنیا میں سے جس اِک شخص کو ڈوبنا ہے، وہ میں ہوں،
اب تو ساری دُنیا میں وہ شخص جو تیر کے بچ نکلے گا، میں ہوں

(۱۷-۸-۱۹۷۳)

کیا قیمت..

کیا قیمت اس مٹی کی، جو اَب مٹی بھی نہیں ہے
آنسوؤں کے پانی سے نمک کا مالیدہ ہے
لاکھوں رتیں گلابوں کی اس میں کافور ہیں،
اس مٹی میں سونے والے نام سدا باقی ہیں دُنیا والوں کے حرفوں کے حنوط سے
اس کی اِک ڈھیری پر آنکھیں میچ کے ہاتھ اٹھاؤ تو دھیان ایسے ایسے خیالوں
کی جانب جاتے ہیں
جن سے دونوں جہاں زندہ ہیں!

لیکن ہائے وہ مٹی جو اَب مٹی میں مٹی بھی نہیں ہے
جس پر صدیوں کے گارے کی تہیں ہیں،
دیکھو تو یہ مٹی کہاں نہیں ہے، کہاں کہاں یہ ہاتھ اٹھیں گے،
کس کو خبر ان ٹھیکریوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان کے نیچے
ان آہن ریزوں سے چنی ہوئی بنیاد کے نیچے
کس کس سونے والے کے کچے مسکن کی ڈاٹ ہے جس میں دیے ابد کے ٹمٹماتے ہیں،
کہاں کہاں یہ ہاتھ اٹھیں گے،
چلتے چلتے، ذرا ٹھٹک کر، سوچو تو اِک اِک جھونکے میں لپٹ ہے ایسے ایسے
خیالوں کی، جن سے یہ دونوں جہاں زندہ ہیں،

(۲۹-۸-۱۹۷۳)

اے ری صبح......

اے ری صبح کی اجلی زرق برق گزرگاہوں پر چیختی......اڑتی......بے بس خوشبو'
یہ نفرت کی سلطنت تجھ کو بھی تو خرید سکتی ہے'

تو نے یہ تو دیکھا ہوتا تیرا نظر نہ آنے والا بدن کن کن بدنوں پہ لباس ہے'
تجھ سے اور کیا ہو سکتا تھا'
اس طرح اَب جن پیرہنوں نے تجھ کو جھٹک دیا ہے'
تو نے اُن کی سجل کریزوں پر یوں ٹوٹ کے گرنا ہی تھا'
کیسی ہیں یہ پیردگیاں جن میں سچ کی رمزوں کی پسپائی ہے!

تو نے یہ تو دیکھا ہوتا' تو جن شستہ پہناووں پر یوں لہلوٹ ہے'
اَن سے ڈھکے ہوئے جثوں میں' پل پل کیسے تریڑے پڑتے ہیں اس زردلہو کے'
جو کالے رزقوں سے کشید ہوتا ہے'

اے اس دُنیا کی اچھائیوں کے تت ست میں پنپنے والی روحوں کی روح'
کبھی تو تو ان باغوں سے بھی گزرتی'
جہاں وہ مہکتے پھول نہیں کھلتے جو دوزخوں کی ٹھنڈک ہیں'

(۱۶-۹-۱۹۷۳)

اے دِل اَب تو......

اے دل، اَب تو کچھ ڈر،
اپنے یقینوں سے ڈر،
اپنے نہ ڈرنے سے ڈر،
اب تو، تو نے، اپنے سپنوں میں، خود سن لیے ایسے ایسے بول
ان سنے...... سہانے!
چلتی مشین گنوں سے چھدے ہوئے وہ بول، اِک ان جانی بولی میں،
بول، کہ جو مرنے والوں کی آخری کراہوں میں دم بھر کو جیے تھے
جب چوبی کھمبوں سے
بندھے ہوئے اعضاء اس کڑے کساؤ میں آزادی سے تڑپ بھی نہیں سکے تھے،
اور کھمبوں سے ڈھلک گئے تھے،
گولیوں سے دھنکے ہوئے،
ریزہ ریزہ،
خوں چکاں!

اور...... وہ اُن کے آخری مختصر، بول سہانے
اَن جانے وطنوں کے ترانوں کے وہ ٹوٹے جڑے ماترے،
اپنے اختیاروں میں اتنے بے بس اور اپنے اطمینانوں میں اتنے بے کل،

وہ سب اتنے مقدس حرف، جو، خواب میں ان سب تصویروں کے ساتھ اُبھرے تھے،
خواب میں کتنے اچھے لگے تھے...... اور اَب جاگنے میں تجھ کو اپنے آپ پہ حیرت کیوں ہے،
اب وہ پنکھڑیاں اس عجلت سے جھٹک بھی دیں تو نے اپنے دامن سے،
اے دل، کچھ ڈر،
اے دل، کچھ دیکھ،
کتنے قیمتی کتنے نازک ہیں یہ رابطے جن سے نظام ان تیری ٹک ٹک چلتی راحتوں کے
قائم ہیں......
(۱۸-۹-۱۹۷۳)

اور ہمارے وجود......

اور ہمارے وجود، ہمارے خیال، ہماری عاجزیاں......سب اُس کے لیے ہیں
جس کو اُن کی ضرورت بھی نہیں، اپنی منشاؤں میں......اپنے فیصلوں کے وقت!

سدا، زمانوں زمانوں، تہذیبوں تہذیبوں، کیسے کیسے تمرد والے قہقہے
اس کو بھلا دینے میں اُبھرے ہیں، جو ہمارے نسیانوں میں ہمیشہ سے اِک جیتی یاد ہے،

اپنے آپ کو دیکھوں تو خود بھی اپنے گمانوں کے بارے میں کیسے خیال رکھتا ہوں،
میری حد تک، فرق اتنا ہے،
مجھ کو بھی اوروں کے جھوٹ نے روند ڈالا ہے،
اب میں کس پر جھپٹوں، اس سچائی کے بل پر، جو مجھ میں ہے اور جس کو جھٹلانے میں،
لگی رہی ہیں، میرے لہو کی گردشیں،
کچھ ہو......اُس کے ہست کا اجرا یا اُس کے عندیے کی قطعیت،
کچھ ہو...... ہر حالت میں......اس کو پسند ہے، صرف اِک وہ سچائی،
جو سب سے پہلے، مٹی کے اِک پتلے کے دِل میں سہمی ہوئی اتری تھی،

اک ہی سچا انسان اُس کے سامنے رہا ہے، ہر عالم میں، لاکھوں تیرتی ڈوبتی
تہذیبوں کے درمیان

(۸-۱۰-۱۹۷۳)

غزل

مل کے سب تعمیر کریں...... اک ارماں،

اک یہ ملک، اور رزق، اور گیت اور خوشیاں

جیتی مٹی! تیرے نام کی ٹھنڈک،

میرے اِک اِک گرم آنسو میں پنہاں،

گلی کوئی بے نام، مکاں بے نمبر،

ہے آباد مرا گھر، کنعاں کنعاں،

شفق ڈھلی میزوں کے گرد وہ چہرے،

آنکھیں، جن میں جئیں کسی کے پیماں،

دُور سے دیکھو، اونچا پل اس شہر کا،

پانیوں پر اِک لوہے کی یہ کہکشاں،

ذکر کا اِک پل، اس کمرے میں گراں......اور

اک بے مصرف سال کا چلہ، ارزاں،

لوحیں طاق پہ ہیں اور اُن کے نوشتے

تقدیروں میں تڑپنے والے طوفاں،

دُنیا...... اک دائم آباد محلّہ،

اس اینٹوں کے ابد میں، سائے انساں

(۲۳-۱۰-۱۹۷۳)

غزل

پھر تو...... سب ہمدرد بہت افسوس کے ساتھ یہ کہتے تھے:

خود ہی لڑے بھنور سے!- کیوں زحمت کی؟- ہم جو بیٹھے تھے

دِلوں کے علموں سے وہ اجالا تھا' ہر چہرہ کالا تھا

یوں تو کسی نے اپنے بھید کسی کو نہیں بتائے تھے

ماتھے جب سجدوں سے اٹھے تو' صفوں صفوں جو فرشتے تھے

سب اس شہر کے تھے اور ہم ان سب کے جاننے والے تھے

اہل حضور کی بات نہ پوچھو' کبھی کبھی اُن کے دِن بھی

سوز صفا کی اِک صفراوی اُکتاہٹ میں کٹتے تھے!

قالینوں پر بیٹھ کے عظمت والے سوگ میں جب روئے

دیمک لگے ضمیر اس عزت غم پر کیا اترائے تھے!

جن کی جیبھ کے کنڈل میں تھا نیش عقرب کا پیوند

لکھا ہے ان بدبختوں کی قوم پہ اژدر برسے تھے!

جن کے لہو سے نکھر رہی ہیں یہ سرسبز ہمیشگیاں

ازلوں سے وہ صادق جذبوں طیب رزقوں والے تھے'

(۳۰-۱۰-۱۹۷۳)

غزل

بنے یہ زہر ہی وجہ شفا، جو تو چاہے
خرید لوں میں یہ نقلی دوا، جو تو چاہے

یہ زرد پنکھڑیاں، جن پر کہ حرف حرف ہوں میں
ہوائے شام میں مہکیں ذرا، جو تو چاہے

تجھے تو علم ہے کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا، تو کیا، جو تو چاہے

جب ایک سانس گھسے، ساتھ ایک نوٹ پسے
نظامِ زر کی حسیں آسیا، جو تو چاہے

بس اِک تری ہی شکم سیر روح ہے آزاد
اب اے اسیر کمند ہوا، جو تو چاہے

ذرا شکوہ دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اُس کے بعد ترا فیصلہ، جو تو چاہے

سلام ان پہ، تہ تیغ بھی جنھوں نے کہا
جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے

جو تیرے باغ میں مزدُوریاں کریں، امجد
کھلیں وہ پھول بھی اِک مرتبہ، جو تو چاہے

(۱۴-۱۱-۱۹۷۴)

غزل

ہر وقت فکرِ مرگِ غریبانہ چاہیے
صحت کا ایک پہلو مریضانہ چاہیے

دُنیائے بے طریق میں جس سمت بھی چلو
رستے میں اِک سلام رفیقانہ چاہیے

آنکھوں میں اُمڈے روح کی نزدیکیوں کے ساتھ
ایسا بھی ایک دُور کا یارانہ چاہیے

کیا پستیوں کی ذلتیں، کیا عظمتوں کے فوز
اپنے لیے عذاب جداگانہ چاہیے

اب دردِ شش بھی سانس کی کوشش میں ہے شریک
اب کیا ہو، اَب تو نیند کو آجانا چاہیے

روشن ترائیوں سے اترتی ہوا میں، آج
دو چار گام لغزشِ مستانہ چاہیے

امجدؔ ان اشکبار زمانوں کے واسطے
اک ساعتِ بہار کا نذرانہ چاہیے

(۱۹-۱۱-۱۹۷۳)

غزل

صبحوں کی وادیوں میں گلوں کے پڑاؤ تھے
دُور–ایک بانسری پہ یہ دھن "پھر کب آؤ گے؟"

اک بات رہ گئی کہ جو دِل میں نہ لب پہ تھی
اس اِک سخن کے، وقت کے سینے پہ، گھاؤ تھے

کھلتی کلی کھلی کسی تاکید سے نہیں،
ان سے وہ ربط ہے جو الگ ہے لگاؤ سے

عیب اپنی خوبیوں کے چنے اپنے غیب میں
جب کھنکھنائے قہقہوں میں، من گھناؤنے

کاغذ کے پانیوں سے جو اُبھرے، تو دُور تک
پتھر کی ایک لہر پہ تختے تھے ناؤ کے!

کیا روتھی، جو نشیب اُفق سے مری طرف
تیری، پلٹ پلٹ کے، ندی کے بہاؤ سے

امجدؔ جہاں بھی ہوں میں، سب اُس کے دیار ہیں
کنجن سہاؤنے ہوں کہ جھنگڑ ڈراؤنے

(۲۹-۱۱-۱۹۷۳)

غزل

چمن تو ہیں نئی صبحوں کے دائمی، پھر بھی
ہے میرے ساتھ تو اَب ختمِ قرن آخر بھی،
مری ہی عمر تھی جو میں نے رائیگاں سمجھی
کسی کے پاس نہ تھا ایک سانس وافر بھی
خود اپنے غیب میں بن باس بھی ملا مجھ کو،
میں اس جہان کے ہر سانحے میں حاضر بھی،
ہیں یہ کھنچاؤ جو چہروں پہ آب و ناں کے لیے
انہی کا حصہ ہے میرا سکون خاطر بھی،
میں اس جواز میں نادم بھی اپنے صدق پہ ہوں
میں اس گنہ میں ہوں اپنی خطا سے منکر بھی،
یہ کس کے اذن سے ہیں اور یہ کیا زمانے ہیں
جو زندگی میں مرے ساتھ ہیں مسافر بھی،
ہیں تیری گھات میں امجد جو آسمانوں کے ذہن
ذرا بہ پاسِ وفا اُن کے دام میں گر بھی،

(۳۰-۱۲-۱۹۷۳)

یہ دن، یہ تیرے شگفتہ دنوں کا آخری دن

یہ دن، یہ تیرے شگفتہ دنوں کا آخری دن
کہ جس کے ساتھ ہوئے ختم لاکھ دَورِ زماں

چناب چین وہ دُنیا، یہ عصر راوی رو
کبھی نہ ٹوٹنے والی رفاقتوں کے جہاں

وہ سب روابطِ دیرینہ یاد آتے ہیں
ترا خلوص، تری دوستی، ترے احساں

مسرتوں میں لہکتے ہرے بھرے ایام
قدم قدم پہ ترا لطفِ خاص ہمدمِ جاں

اور اَب یہ تیرگیاں...... اَب کہاں تلاش کریں
وہ شخص، پیکرِ صدق اور وہ فردِ فیض رساں

رہ عدم کے مسافر، ذرا پلٹ کے تو دیکھ
گرفتہ جاں ہے ترے غم میں بزم ہم نفساں

ترے کرم کی بہاروں میں سوگوار ہیں، دیکھ
ترے چمن کے گل و سرو ولالہ و ریحاں

اُمڈ اُمڈ کے سدا گزرے گی غموں کی یہ موج
دِلوں کی بستیوں سے تا بہ ساحل دوراں

ابھی ابھی وہ یہیں تھا...... زمانہ سوچے گا،
انہی گلوں میں ہیں اُس کے تبسموں کے نشاں

ابھی ابھی انھیں کنجوں میں اُس کے سائے تھے
ابھی ابھی تو وہ تھا ان برآمدوں میں یہاں

کوئی یقین کرے گا اِک ایسی عظمت بھی
کبھی تھی حصہء دُنیا، کبھی تھی جزوِ جہاں

ہمیں نے دیکھا ہے اس کو ہمیں خبر ہے وہ شخص
دِلوں کی روشنیاں تھا، دِلوں کی زندگیاں

ہمیں خبر ہے، بڑے حلم و آبرو والے
ترا مقام کسی اور کو نصیب کہاں،

زمانہ سوچے گا، وہ ایک کون تھا، تجھ سا
جو ان دیاروں سے گزرا تھا یوں گہر افشاں

اور اَب جو تو نہیں، کچھ بھی نہیں، نہ ہم نہ حیات
ہر ایک سمت اندھیرا، ہر ایک سمت خزاں

جگہ جگہ تری موجودگی کو پاتے ہیں
ہمارے درد فراواں، ہمارے اشک رواں

ترے لیے جھکے مینائے کوثر و تسنیم
ترے لیے کھلیں درہائے روضۂ رضواں

(۱۹۷۳)

قطعہ

سنا ہے میں نے کہ شعری☆ تمھاری سمت سفر — بساطِ گل پہ بچھی برف کی سلوں میں ہے
تمہارا قافلہ شوق جاگزیں اَب کے — کنار کوہ پہ نیلم کے ساحلوں میں ہے
تمھیں تلاش ہے جس عالم مسرت کی — وہ سبز کنجوں نہ گل پوش منزلوں میں ہے
تمھارے بعد مجید امجد اور انجم☆☆ نے — بسالیا وہ سوات اُن کے جو دِلوں میں ہے
لذیذ پانی پیا' سیب کھائے' شعر پڑھے — اک ایسا دِن کہاں دُنیا کی محفلوں میں ہے
ہماری روح کی سیف الملوک جھیل کے پاس — ہمارا تذکرہ جنت شمائلوں میں ہے

کبھی کبھی جو ہمارے دِلوں میں جھانکتا ہے
کہاں وہ لمحہ زمانے کے محملوں میں ہے

(۲۴-۴-۱۹۷۴)

(نوٹ: یہ قطعہ ارتجالاً لکھا گیا)

☆ مجید امجد کے نہایت عزیز دوست جن کا قیام جھنگ میں تھا پورا نام: شیر محمد شعری
☆☆ پروفیسر تقی انجم سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ

غزل

نئی صبحوں کی سیر کا یہ خیال
اپنے طغیان کی سزا یہ خیال

میتوں کو لحد میں کلپائے
ہو سکے سجدہ اِک ادا یہ خیال

سب کی روحیں تھیں ریت کے بربط
اک مری زیست میں جیا یہ خیال

اتنے رنگوں میں یہ گلاب کے پھول
اتنے رنگوں میں موت کا یہ خیال

ابر ہیں امجد اور یہ جنت برگ
دیکھ سمتوں کو ربط کا یہ خیال

(۱۹۷۴ء)
(وفات سے چند دن پہلے کہی گئی)